علم الاخلاق جلد اوّل

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

علم الاخلاق جلد اوّل

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب-----------------علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)

جلد---------------------اوّل

مؤلف-------------------آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم-------------------ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

کمپوزنگ-----------------فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سیٹنگ و گرافکس-----------------قلب علی سیال (فون:0301-7229417)

اشاعت اوّل-----------------2004ء

اشاعت دوم-----------------2013ء

ناشر---------------------مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ---------------------

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے
ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان
کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔آمین۔ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

انتساب

قرآن کے حقیقی وارث

اور

قرآنی نظام کو پوری دنیا میں نافذ کرنے والی ذاتِ گرامی

حضرت امامِ زمانہ علیہ السّلام (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ شریف)

کے نام

فہرست مضامین

عرض مترجم 10
عرش ناشر 13
تمہید 14
پہلا باب: اخلاقی مباحث کی اہمیت 16
اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت 20
۱۔علم اخلاق کی تعریف 22
۲۔فلسفہ اور اخلاق کا تعلق 23
۳۔اخلاق اور عرفان کا تعلق 24
۴۔اخلاق اور علم کا تعلق 25
۵۔آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟ 27
اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات و روایات 31
اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل 34
۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ 35
۱۔سلمان فارسیؒ 37
۲۔ابوذر غفاریؒ 37
۳۔عمار یاسرؒ 37
۴۔نوف بکالی 38
۵۔محمد بن ابوبکر 38
۶۔جارود ابن منذر 38
۷۔حذیفہ بن منصور 38
۸۔عثمان بن سعید عمری 38
دوسرا باب: انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار 40

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق ______ 51
تیسرا باب: اخلاقی مکاتب فکر ______ 54
۱۔اخلاق اور مکتب توحید ______ 55
۲۔اخلاق اور مادیت ______ 55
۳۔اخلاق اور عقلی فلسفہ ______ 56
۴۔اخلاق اور دیگر پسندی ______ 56
۵۔اخلاق اور ضمیر پرستی ______ 56
۱۔اخلاق اور نسبیت (Relativity) ______ 57
۲۔اخلاق اور رویے کا متقابل اثر ______ 62
اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں ______ 64
۳۔انفرادی اور اجتماعی اخلاق ______ 66
چوتھا باب: اخلاقی بنیادیں ______ 68
۱۔منفعت طلبی کی بنیاد ______ 68
۲۔عقلی بنیاد ______ 69
۳۔شخصیت کی بنیاد ______ 70
۴۔الٰہی بنیاد ______ 71
اہم نکتہ ______ 76
پانچواں باب: اخلاق اور آزادی ______ 77
عقیدۂ جبر اور غیر اخلاقی مسائل ______ 80
چھٹا باب: قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول ______ 83
تنقید و تحقیق ______ 84
قرآن کے اخلاقی اصول ______ 86
اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث ______ 89
ساتواں باب: اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق ______ 98

آٹھواں باب: کہاں سے شروع کریں؟ ____ 101
اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات ____ 101
دوسرا نظریہ: روحانی طب ____ 103
تیسرا نظریہ: سیر وسلوک ____ 107
نواں باب: سیر وسلوک کے مختلف طریقے ____ 111
۱۔ سیر وسلوک بحر العلوم ____ 111
اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت ____ 112
۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ ____ 115
ایک اور طریقہ ____ 116
مکاتب سیر وسلوک کا خلاصہ اور نتیجہ ____ 118
دسواں باب: کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟ ____ 120
واعظ درونی کا کردار ____ 122
گیارھواں باب: اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری ____ 124
۱۔ ماحول کی پاکیزگی ____ 124
تفسیر ونتیجہ ____ 125
۲۔ صحبت کا اثر ____ 128
تفسیر اور نتیجہ ____ 130
دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں ____ 133
صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں ____ 135
۳۔ اخلاق پر خاندانی تربیت و وراثت کا اثر ____ 137
تفسیر ونتیجہ ____ 139
اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں ____ 142
۴۔ علم و آگہی کا اثر ____ 146
علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں ____ 150

۵۔معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر ____ 154
تفسیر اور نتیجہ ____ 156
معاشرتی آداب ورسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں ____ 160
۶۔عمل اور اخلاق کا تعلق ____ 163
تفسیر اور ترجمہ ____ 164
اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں ____ 172
اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق ____ 175
خوراک اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں ____ 177
اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال ____ 182
بارھواں باب: تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم ____ 183
پہلا قدم توبہ ____ 183
ا۔حقیقت توبہ ____ 185
۲۔وجوب توبہ ____ 185
۳۔توبہ کی عمومیت ____ 187
۴۔ارکانِ توبہ ____ 192
۵۔قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی ____ 198
۶۔جزئی توبہ ____ 200
۷۔توبہ کی پائیداری ____ 201
۸۔توبہ کے درجات ____ 203
۹۔توبہ کے اثرات وبرکات ____ 205
دوسرا قدم۔مشارطہ ____ 208
تیسرا قدم مراقبہ ____ 210
چوتھا قدم محاسبہ ____ 214
پانچواں قدم معاتبہ ومعاقبہ (سرزنش اور سزا) ____ 221

نیت اور اخلاصِ نیت 226
نیت کے ایک اور معنی 227
اخلاص 229
اخلاص احادیث کی روشنی میں 232
اخلاص کی حقیقت 234
اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں 236
اخلاص کے آثار 238
ریاکاری 239
تفسیر 240
ریا احادیث کی روشنی میں 244
ریا کی حرمت کا فلسفہ 247
ریاکاروں کی علامات 247
ریا کا علاج 249
کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟ 251
ریا اور سمعہ کا فرق 252
خاموشی اور اصلاحِ زبان 253
خاموشی، احادیث کی روشنی میں 256
ایک غلط فہمی کا ازالہ 258
اصلاحِ زبان 260
۱۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت 261
۲۔ زبان کا فکر و اخلاق سے تعلق 265
۳۔ آفات اللسان یا زبان کے خطرات 268
۴۔ خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول 270
۱۔ خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ 270

۲۔خاموشی 271
۳۔حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا) 272
خودشناسی اور خدا شناسی 273
۱۔خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق 274
۲۔خودشناسی احادیث کی روشنی میں 275
۳۔خودشناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے 277
حدیث ''من عرف نفسہ'' کی سات تفسیریں 278
خودشناسی کی رکاوٹیں 281
عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں 283
تفسیر اور نتیجہ 285
پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں 290
اللہ کا ذکر اور پرورش روح 293
تفسیر و نتیجہ 295
ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں 301
۱۔حقیقت ذکر 303
۲۔درجاتِ ذکر 305
ذکر کی رکاوٹیں 306
تیرھواں باب: نمونہ ہائے عمل 309
تفسیر اور نتیجہ 311
تولیٰ و تبریٰ احادیث کی روشنی میں 317
داستانِ موسیٰ و خضر 324
چودھواں باب: ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار 327
علامہ مطہری شہید کا نظریہ 332
ناجائز مفاد پرستی 334

عرض مترجم

جب سے اس کرۂ خاکی پر انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آیا ہے، اخلاقی فضائل کی ضرورت اور اہمیت ہر دور اور ہر معاشرے میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں اخلاقی فضائل سے آراستہ انسانوں کو عزت اور تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا رہا اور اخلاقی فضائل سے محروم افراد ہمیشہ ناپسندیدہ اور قابل مذمت ٹھہرائے جاتے رہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کی کشش انسان کی فطرت اور اس کی سرشت میں رکھ دی ہے۔ دنیا کا ہر انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، رنگ، نسل یا خطے سے ہو، عدل، سچائی، ایمانداری، عفت، شجاعت اور علم سے محبت کرتا ہے اور انہیں پسندیدہ انسانی صفات مانتا ہے۔ اسی طرح وہ ظلم، جھوٹ، خیانت، بزدلی اور جہل کو ناپسندیدہ اخلاقی صفات قرار دے کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ جو افراد اخلاقی فضائل سے محروم ہیں، وہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ بظاہر ایسا رویہ اختیار کریں کہ لوگ انہیں فضائل اخلاقی سے آراستہ سمجھیں۔

آپ کو دنیا میں ایسا کوئی جاہل نہیں ملے گا جو جہل کو پسند کرتا ہو۔ آپ کو دنیا میں کوئی ایسا فریب کار اور خائن نہیں ملے گا جو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ دنیا کے ظالم ترین اور جابر ترین حکمران بھی عدل و انصاف کے قیام کے دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ حسن وقبح اخلاقی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ضمیر کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

جس معاشرے میں اخلاقی فضائل زندہ اور معاشرتی زندگی پر حاکم ہوں، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی آرام و سکون سے گزرتی ہے بلکہ اس معاشرے میں انسان کو روحانی ترقی کے بھی زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں اخلاقی فضائل صرف کتب اور علماء وواعظین کی تقریروں تک محدود ہوں اور عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہ آئے، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی عذاب بن جاتی ہے بلکہ انسان کی معنوی ترقی کی راہیں بھی مسدود ہو جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انسانیت کا درد رکھنے والے مفکرین اور مصلحین نے معاشرے میں اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنے کے لیے علمی، فکری اور عملی جدوجہد کی۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء بھیجے، ان سب کی بعثت کا مقصد بھی اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ رسول اللہؐ کی مشہور و معروف حدیث ہے:

"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

''میں اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ حدیث نبویؐ بہت گہرے معنی پر مشتمل ہے مگر اس کی گہرائی پر عام طور پر نظر نہیں کی جاتی۔ غور فرمائیں کہ حضورؐ نے یہ نہیں

فرمایا کہ میں تمہیں عقائد و اعمال کی تعلیم دینے آیا ہوں یا بالفاظ دیگر آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہیں اصولِ دین اور فروع دین کی تعلیم دینے آیا ہوں بلکہ آپؐ نے "انما" کا لفظ استعمال کر کے یہ بیان فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد اچھے اخلاق کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عقائد و اعمالِ اسلامی یا اصولِ دین و فروع دین کا مقصد ہمارے اندر اچھے اخلاق کو پروان چڑھانا ہے۔

اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جو شیعہ و سنی دونوں کی کتب حدیث میں موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"ما آمن بی من بات جارہ جائعا"

''جو شخص پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کا پڑوسی رات کو بھوکا رہے، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔''

اس حدیث میں پڑوسی کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں رکھی گئی ہے اور پھر بہت سی احادیث میں ہے کہ پڑوس کی حد چاروں طرف سے چالیس گھر تک ہے۔

نتیجہ یہ کہ اگر آپ نے رات کو سیر ہو کر کھانا کھا لیا اور چاروں طرف چالیس گھروں تک آپ کا کوئی مسلم یا غیر مسلم پڑوسی رات بھر بھوکا سو رہا تو رسولؐ اللہ کی نظر میں آپ مسلمان نہیں، خواہ آپ رات بھر نوافل پڑھتے رہیں اور دن بھر روزہ رکھیں۔

مذہب، رنگ و نسل کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ایک اچھا انسان ہونا، اچھا مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص بہت بڑا شیخ القرآن والحدیث یا مفتی اعظم بن جائے، علامہ، حجۃ الاسلام، آیت اللہ یا آیت اللہ العظمیٰ بن جائے لیکن اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے تو سب بیکار ہے۔

مگر اسے انسان کی بد قسمتی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ فطری اور عقلی طور پر اخلاقی فضائل کا اعتراف کرنے اور انبیاء و مصلحین کی عالمگیر اصلاحِ اخلاق کی کوششوں کے باوجود، اخلاقی بحران ہر دور میں انسانی معاشرے کا بڑا ابحران رہا ہے۔

دورِ حاضر میں یہ بحران انتہائی پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ جب اخلاقی اقدار کی حاکمیت کی جگہ طاقت کی حاکمیت لے لے تو ایسی صورت میں طاقت ہی طاقت کا راستہ روک سکتی ہے۔ اگر طاقت کا توازن بگڑ جائے اور آج کی طرح دنیا ایک بڑی طاقت کے زیر اثر آ جائے تو طاقت کے اندھے استعمال کے نتیجہ میں صرف کمزور انسان ہی نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کا جنازہ بھی نکل جاتا ہے۔

اخلاقی بحران کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی اخلاقی تعلیمات کے بغیر اس بند کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سرپرستی میں حوزہ علمیہ قم کے چند سینئر طلباء نے ''اخلاق در قرآن'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کا قابل تعریف کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب میں کتب اخلاق کی عام روش سے ہٹ کر ایک اچھوتا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جن اخلاقی فضائل و رذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے بارے میں پہلے قرآنی آیات کی روشنی میں کافی

تفصیل سے بحث کی گئی ہے، بعدازاں اس کے بارے میں احادیث معصومینؑ کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر ان کے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

جن اخلاقی رذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاج کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب کو بلا مبالغہ ''روحانی اور اخلاقی صحت کا انسائیکلوپیڈیا'' کہا جا سکتا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد ''علم الاخلاق، قرآن کی روشنی میں'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ادارہ مصباح القرآن نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروا کر انتہائی مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ادارے کو اس اقدام پر مبارک باد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ادارہ مصباح القرآن کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اس ادارے کے منتظمین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور تمام اہل اسلام کو اس کتاب سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین

خادمِ علوم قرآن و اہل بیتؑ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (Ph.D)

10/نومبر 2004، لاہور۔

عرضِ ناشر

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیر سرپرستی لکھی جانے والی کتاب ''اخلاق درقرآن'' کا ترجمہ ''علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)'' کے نام سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔بلاشبہ یہ کتاب انسان کی زندگی میں انتہائی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔آج کل دُنیا اخلاقی حوالہ سے جس جگہ پہنچ چکی ہے، اُس میں اخلاقیات کی خرابی ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اس قسم کی کتابوں کی کثرت سے اشاعت لازمی طور پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی لاسکتی ہے۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تمہید

اخلاقی مسائل کو ہر دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن ہمارے دور میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے دور میں اخلاقی بگاڑ اور سیدھی راہ سے انحراف کے اسباب وعوامل ہر زمانہ سے زیادہ ہیں۔اگر ماضی میں بہت سے برے کاموں کو انجام دینے کیلئے اخراجات اور زحمت برداشت کرنے کی ضرورت تھی تو ہمارے دور میں انسانی ایجادات کی کثرت سے ہر چیز ہر جگہ اور ہر کسی کیلئے دستیاب ہے۔

۲۔ ہمارا دور پیمانوں کے بڑے ہو جانے کا دور ہے۔ جو کام ماضی میں محدود پیمانہ پر ہوتے تھے، وہ اب لامحدود پیمانے پر ہونے لگے ہیں۔

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد انسانی قتل وغارت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔اس کے علاوہ سٹیلائٹ کے ذریعے گندی فلمیں ساری دنیا میں پھیلائی جا رہی ہیں اور اب انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہر قسم کی مضر معلومات دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچائی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے اخلاقی برائیاں بہت وسیع سطح پر پھیل چکی ہیں اور تمام سرحدوں کو توڑتی ہوئی دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہیں۔اخلاقی بگاڑ اس قدر پھیل چکا ہے کہ خود اخلاقی بگاڑ کی بنیاد رکھنے والے چیخ اٹھے ہیں۔اگر ماضی میں منشیات کی پیداوار صرف ایک جگہ، ایک گاؤں یا زیادہ سے زیادہ ایک شہر کو متاثر کرتی تھیں تو اب سمگلروں کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلائی جا رہی ہیں۔

۳۔ جس طرح طب اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں مفید اور تعمیری معلومات غیر معمولی طور پر دنیا میں پھیلی ہیں، اسی طرح شیطانی علوم اور غیر انسانی اور غیر اخلاقی مقاصد کے حصول کی راہیں ماضی کی نسبت بہت زیادہ وسیع وعریض ہو چکی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن لوگوں میں برائی کا رجحان پایا جاتا ہے، ان کیلئے ممکن ہو گیا ہے کہ کبھی پیچیدہ اور پر اسرار طریقوں اور کبھی سادہ اور آسان ذرائع سے اپنے مقصد تک پہنچ جائیں۔

ایسے حالات میں اخلاقی مسائل اور علم اخلاق کی طرف توجہ کرنا ماضی کے ہر دور کی نسبت زیادہ ضروری ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے ہم بڑے المیے یا المیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔انسانیت کا درد رکھنے والے دانشوروں اور آگاہ علماء کا فرض ہے کہ اخلاقی تعمیر نو کیلئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور موجودہ دور میں جبکہ اخلاقیات کو شدید خطرہ لاحق ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ اخلاق کا سرے سے انکار کر رہے ہیں یا اسے غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کیلئے ہر کام کرنے کو اخلاقیات کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، ایسے حالات میں علماء اور مفکرین کا فرض ہے کہ اپنی تمام کوشش اور جدوجہد کو بروئے کار لائیں۔

خوش قسمتی سے ہم مسلمانوں کے پاس قرآن مجید جیسا عظیم سرچشمہ موجود ہے جو گہرے اخلاقی مباحث سے اس قدر سرشار ہے کہ دنیا کے کسی دین کی کتب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ مفسرین نے قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کی تفسیر کی ہے لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں، ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جو" "کے عنوان سے تفسیر موضوعی کے انداز میں ان مسائل کو یکجا کر کے بیان کرتی ہو۔ حالانکہ ایسی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیامِ قرآن کے پہلے مجموعہ کے بعد، جس میں ہم نے اسلامی عقائد و معارف کو تفسیر موضوعی کے انداز میں زیر بحث قرار دیا، پیام قرآن کا ایک اور مجموعہ ترتیب دیا جائے جس میں قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کو بیان کیا جائے۔

الحمدللہ! یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ کتاب دو جلدوں میں تیار ہوئی، پہلی جلد میں اخلاقی مسائل کے کلیات کو زیر بحث لایا گیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب سے ایک جامع درسی کتاب کی حیثیت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جلد میں اخلاقی مسائل کے جزئیات اور مصادیق پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کا بہت سا حصہ بھی الحمدللہ اشاعت کیلئے تیار ہو چکا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی روشنی میں انسانوں کی زندگی کی مشکلات دور کرنے کیلئے یہ دوسرا قدم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ہمارے لیے روزِ آخرت کا ذخیرہ ہو۔ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اہل فکر و نظر کی نشاندہی پر اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔

والحمدللہ رب العالمین

ربیع الاول ۱۴۱۹

جون/ ۱۹۹۸ء

پہلا باب

اخلاقی مباحث کی اہمیت

اشارہ

قرآنی مباحث میں یہ بحث سب سے اہم ہے اور ایک لحاظ سے یہی انبیائے کرام کی بعثت کا سب سے اہم مقصد تھا، اس لیے کہ اخلاق کے بغیر نہ تو لوگوں کیلئے دین کا کوئی مفہوم باقی رہ جاتا ہے اور نہ ہی ان کے دنیوی امور کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ بقول شاعر۔

اقوام روزگار بہ اخلاق زندہ اند
قومی کہ گشت فاقد اخلاق مردنی است

(دنیا کی اقوام اخلاق کی بدولت زندہ ہیں۔ اخلاق سے عاری قوم کا مقدر صرف موت ہے)

درحقیقت انسان صرف اسی صورت میں انسان کہلانے کا حقدار ہے جب وہ انسانی اخلاق سے آراستہ ہو، ورنہ وہ ایک ایسا خطرناک حیوان ہے جو انسانی ذہانت سے مسلح ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے، ہر طرف آگ لگا دیتا ہے، اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کیلئے جنگ برپا کرتا ہے اور اسلحہ بیچنے کیلئے قوموں کے درمیان نفاق اور تفرقہ کے بیج بو دیتا ہے اور بے گناہوں کو خاک وخون میں غلطاں کر دیتا ہے۔

ممکن ہے ایسا انسان بظاہر متمدن ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک خوش خوراک جانور ہے جو حلال وحرام کے فرق کو پہچانتا ہے نہ ظلم اور عدل کے فرق کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی ظالم اور مظلوم کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔

اس اشارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حقیقت کا بیان قرآن کی زبان سے سنتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمایئے:

۱۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٢﴾

”اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔“ (جمعہ ۲)

۲۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''اللہ نے مومنین پر احسان کیا (اورانہیں ایک بڑی نعمت عطا فرمائی) جب ان میں انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث کیا تا کہ وہ انہیں اس کی آیات سنائے، انہیں پاک کرے اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران: ۱۶۴)

۳۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''(اس طرح ہم نے تبدیلی قبلہ کے ذریعے تم پر انعام کیا) جس طرح تم میں ایک رسول تم ہی میں سے مبعوث کیا تا کہ وہ تمہیں ہماری آیات سنائے، تمہیں پاک کرے، تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے، تمہیں اس کی تعلیم دے۔'' (بقرہ:۱۵۱)

۴۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

''اے ہمارے رب! تو ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو توانا اور حکیم ہے (اور اس کام پر قادر ہے)۔'' (بقرہ:۱۲۹)

۵۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾

''جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اپنے نفس کو گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہو گیا۔'' (شمس ۹، ۱۰)

۶۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

''یقیناً جس نے تزکیہ نفس کیا، اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی، وہ فلاح پا گیا۔''

(اعلیٰ: ۱۴، ۱۵)

۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ (لقمان: ۱۲)

''ہم نے لقمان کو حکمت (ایمان اور اخلاق) عطا کی (اور انہیں کہا) اپنے رب کا شکر ادا کرو۔''

پہلی چار آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں، وہ یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد لوگوں کا تزکیہ نفس اور ان کی تربیت اور اخلاق حسنہ کی ترویج تھا۔ حتی کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تلاوتِ آیات الٰہی اور کتاب و حکمت کی تعلیم جس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے، تزکیہ نفس اور انسانوں کی تربیت کے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جو علم اخلاق کا اصلی مقصد ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ تین آیات میں تزکیہ کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے، اس لیے کہ مقصودِ آخر تزکیہ ہے، اگرچہ عملی طور پر تعلیم اس پر مقدم ہے۔

اگر ان آیات میں سے ایک آیت میں تعلیم کو تزکیۂ اخلاق سے پہلے بیان کیا گیا ہے تو اس میں اس بیرونی حقیقت کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ عام طور پر تعلیم تزکیہ و تربیتِ نفس کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے مقدم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان چار میں سے پہلی تین آیات اور چوتھی آیت اس مسئلہ کے ان دو میں سے ایک پہلو کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں۔

ان چار آیات کی تفسیر میں یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس تقدیم اور تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ یہ تعلیم اور تربیت دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس طرح صحیح تعلیم انسان کی اخلاقی سطح اور تزکیۂ نفس کی کیفیت کو بہتر کرتی ہے، اسی طرح اخلاقی فضائل بھی انسان کے علم و دانش کی سطح کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، اس لئے کہ انسان صرف اسی صورت میں علم کی حقیقت کو سکتا ہے جب وہ تکبر، ہٹ دھرمی، خود پسندی اور اندھے تعصب سے پاک ہو۔ اس لئے کہ یہ سب علمی ترقی کے راستے کی رکاوٹ ہیں، ورنہ یہ اخلاقی برائیاں انسان کے چشم و دل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ حق کو اس کی اصل صورت میں دیکھنے اور اسے قبول کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چار آیات میں یہ نکات بھی قابل غور ہیں:

پہلی آیت میں معلم اخلاق رسولؐ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور تعلیم و تربیت کو ضلالِ مبین یعنی کھلی گمراہی کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ (وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ)۔ یہ اخلاق کے بارے میں قرآن کے نہایت اہتمام کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت میں اخلاقی تربیت کرنے والے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والے رسولؐ کو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان قرار دیا گیا ہے۔ یہ اخلاق کی اہمیت کی ایک اور دلیل ہے۔

تیسری آیت جو کہ تبدیلی قبلہ کی آیات کے بعد ہے اور تبدیلی قبلہ کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت قرار دے رہی ہے، یہ کہہ رہی ہے کہ یہ نعمت بھی بعثت رسولؐ اکرم کی نعمت کی مانند ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیۂ نفس، تعلیم و تربیت کرے اور ایسی چیزوں

کی تعلیم دے جو معمولی ذرائع سے ممکن نہیں ہے۔[1]

ایک اور نکتہ جو چوتھی آیت میں قابل غور ہے کہ اس میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہو کر چند دعائیں مانگی ہیں جن میں سے سب سے اہم دعا ان کی ذریت میں سے ایک مسلمان امت کے معرضِ وجود میں آنے کی دعا اور ان میں کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والے اور تزکیۂ نفس کرنے والے رسول کی بعثت کی دعا ہے۔

پانچویں آیت میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف گیارہ اقسام کے طولانی ترین مجموعہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرما رہا ہے کہ ''جس نے تزکیۂ نفس کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے نفس کو آلودہ کیا، وہ مایوس اور نا اُمید ہو گیا'' (**قد افلح من زکھا۔ وقد خاب من دسھا**)۔

یہ مسلسل تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ گویا قرآن شریف کی نظر میں تمام اقدار اسی عظیم قدر میں سمودی گئی ہیں اور اسی کو فلاح و نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک مختصر فرق کے ساتھ یہی بات چھٹی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس میں تزکیۂ نفس کو نماز اور ذکرِ خدا پر مقدم رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فضائل اخلاق کی روشنی میں انسان میں تزکیۂ نفس اور پاکیزگی قلب و روح نہ پائی جاتی ہو تو نہ ذکر خدا کسی کام آتا ہے اور نہ ہی نماز کسی روحانی منزل پر پہنچاتی ہے۔ آخری آیت میں عظیم معلم اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے اور علم اخلاق کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی اور انہیں حکم دیا کہ اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔''

سورۂ لقمان کی اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیت تربیت نفوس اور تربیت اخلاق تھی۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ یہاں حکمت سے مراد ''حکمت عملی'' اور وہ تعلیمات ہیں جو اس حکمت عملی تک پہنچاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر حکمت سے مراد ہے ''تعلیم و تربیت''۔

یہ نکتہ ضرور مدنظر رہے کہ جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ بنیادی طور پر حکمت کے معنی لگام کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کیلئے استعمال کیا جانے لگا جو ''روکنے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چونکہ علم و دانش اور اخلاقی فضائل انسان کو برائی اور انحراف سے روکتے ہیں، اس لئے ان کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔

---

[1] **وَيُعلمكم مالم تكونوا تعلمون** یعنی وہ تمہیں ان چیزوں کے تعلیم دیتا ہے جن کو معمول کے ذرائع سے جاننا تمہارے لئے ممکن نہ تھا۔ پس غور کر تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایسی چیزوں کی تعلیم کا ذکر کیا گا ہے جن کا جاننا وحی کے بغیر ناممکن ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہو کہ سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی مسائل اور تہذیب نفس کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اسے ایک ایسا بنیادی امر قرار دیا ہے جو دیگر تمام امور کی اساس اور بنیاد ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام اسلامی قوانین و احکام پر سایہ فگن ہے۔

بلاشبہ اخلاقی ارتقاء خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، آسمانی ادیان کا بنیادی مقصد، تمام معاشرتی اصلاحات کی اساس اور ہر برائی کے خلاف جہاد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

اب ہم احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ احادیث میں اس مسئلہ کو کیا اہمیت دی گئی ہے۔

اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں اس موضوع کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [۱]

یعنی ”میں صرف اخلاقی فضائل کی تکمیل کیلئے معبوث ہوا ہوں۔“

ایک اور روایت میں:

انما بعثت لاتمم حسن الاخلاق [۲]

ایک اور روایت میں:

بعثت بمکارم الاخلاق و محاسنها [۳]

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

”انما“ کا لفظ حصر کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے تمام مقاصد کا خلاصہ انسانی اخلاق کی تکمیل تھا۔

---

[۱] کنز العمال 16:3 حدیث: 52157

[۲] کنز العمال 16:3 حدیث: 5218

[۳] بحار الانوار 05:66

۲۔ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

لو کنا لا نرجو جنة ولا نخشی نارا ولا ثوابا ولا عقابا لکان ینبغی لنا ان نطالب بمکارم الاخلاق فانها مما تدل علی سبیل النجاح[۱]

''اگر ہمیں جنت کی امید اور جہنم کا خوف نہ ہوتا اور ثواب وعقاب کی بھی کوئی بات نہ ہوتی تو بھی ہمیں چاہیئے تھا کہ اخلاقی فضائل کی طلب کرتے، اس لئے کہ یہی نجات اور کامیابی کیلئے رہنما ہیں۔''

یہ حدیث بخوبی اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اخلاقی فضائل نہ صرف نجات اخروی کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کے بغیر دنیوی زندگی کی بھی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ (اس بارے میں ہم آئندہ صفحات میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے)۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

جعل الله سبحانه مکارم الاخلاق صلة بینه و بین عباده فحسب احد کم ان یتمسك بخلق متصل بالله

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کو اپنے اور بندوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ کافی ہے کہ تم اخلاقی فضائل کو اختیار کرو تا کہ وہ تمہیں اللہ سے متصل کر دیں۔''[۲]

دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا معلم اخلاق اور مربی نفوس اور تمام فضائل کا سرچشمہ ہے۔ اخلاق الٰہی کے بغیر قربِ خدا کا حصول ممکن نہیں ہے۔

بنابریں ہر اخلاقی فضیلت اللہ اور انسان کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتی ہے اور اسے قدم بقدم اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کے قریب کرتی ہے۔

آئمہ دین کی ساری زندگی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انہوں نے ہر مقام پر لوگوں کو فضائل اخلاق کی طرف دعوت دی اور خود بھی فضائل اخلاق کا اسوۂ حسنہ تھے۔ انشاء اللہ ہم آئندہ مباحث میں ان کے اخلاق کریمہ کی مثالیں دیکھیں گے۔ اس سلسلہ میں یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام باعظمت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾

یعنی ''آپ اخلاق عظیم کی منزل پر فائز ہیں۔'' (قلم: ۴)

---

[۱] مستدرک الوسائل 283:2 (پرانا ایڈیشن)

[۲] تنبیہ الخواطر 362

اہم نکات

ا۔علم اخلاق کی تعریف

یہاں پر ہر بات سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اخلاق کی تعریف کریں۔''اخلاق''، "خلق" اور''خلق'' کی جمع ہے۔ مفردات راغب میں ہے کہ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے۔ "خلق" انسان کی ظاہری شکل اور صورت کو کہتے ہیں جبکہ "خلق" باطنی صفات وخصوصیات کو کہا جاتا ہے جن کا مشاہدہ صرف قلب کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ''اخلاق انسان کی روحی اور باطنی صفات کو کہتے ہیں۔'' چند ایک علماء کے مطابق بعض اوقات انسان کے ان افعال پر بھی لفظ اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے باطنی اخلاق کی بنیاد پر صادر ہوتے ہیں۔ اول الذکر کو صفاتی اخلاق اور ثانی الذکر کو عملی اخلاق بھی کہا گیا ہے۔

''اخلاق'' کی تعریف اس کے نتیجہ کے اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ بعض اوقات انسان کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ ہوتا ہے (مثلاً بخل) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فعل اس شخص کے باطن میں جڑیں رکھتا ہے۔ ایسی جڑوں کو خلق اور اخلاق کہا جاتا ہے۔

اسی چیز کے پیش نظر ابن مسکویہ اپنی کتاب''تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق''میں کہتے ہیں:

''خلق وہ نفسانی حالت ہے جو انسان کو مختلف کاموں کے انجام دینے کی دعوت دیتی ہے، بغیر اس کے کہ اسے غور وفکر کی ضرورت ہو۔''[۱]

فیض کاشانی نے بھی اپنی کتاب''حقائق''میں اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

''خلق اس پائیدار نفسی کیفیت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی کام کو غور وفکر کے بغیر اور آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔''[۲]

اسی لئے اخلاق کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ وہ ملکات (پختہ باطنی خصوصیات) جن کی بدولت اچھے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں، انہیں اخلاق حسنہ اور ملکاتِ فضیلہ کہا جاتا ہے اور وہ ملکات جو برے اعمال کے ظہور پذیر ہونے کا سبب ہوں، انہیں اخلاق بد اور ملکات رذیلہ کہا جاتا ہے۔

بنابراین علم اخلاق کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے:

---

[۱] تہذیب الاخلاق 51

[۲] حقائق۔54

''علم اخلاق وہ علم ہے جو اچھے اور برے ملکات، خصوصیات، اسباب اور نتائج سے بحث کرتا ہے۔''

بالفاظ دیگر: علم اخلاق اچھی صفات کے حصول اور بری صفات کے خلاف مجاہدہ کے طریقوں اور ہر ایک کے انفرادی و اجتماعی اثرات سے بحث کرتا ہے۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، ان صفات کی بنیاد پر انجام پانے والے اعمال وافعال پر بھی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ہمیشہ غصے کا مظاہرہ کرے تو اسے اخلاق رذیلہ کہا جائے گا، اس کے برعکس بخشش اور سخاوت کو اخلاق حسنہ کہا جائے گا۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ ہیں جنہیں ایک دوسرے کا نام دیا گیا ہے۔

بعض مغربی مفکرین نے بھی علم اخلاق کی تعریف اس انداز میں کی ہے جس کا نتیجہ ہماری تعریفات سے ہم آہنگ ہے۔ جیکس اپنی کتاب ''فلسفۂ اخلاق'' میں کہتا ہے کہ ''علم اخلاق انسان کے طرزِ عمل سے، جیسا کہ اسے ہونا چاہئے، بحث کرتا ہے۔''[۱]

بعض دیگر مفکرین نے مختلف تعریفیں بیان کی ہیں مثلاً فولکیہ کہتا ہے:

''ان قوانین کا مجموعہ جن کی پیروی کرکے انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے، علم اخلاق کہلاتا ہے۔''[۲]

یہ ان لوگوں کی بات ہے جو اعلیٰ انسانی اخلاق کیلئے کسی اہمیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی نظر میں مقصد تک پہنچنا ہی سب سے اہم ہوتا ہے، خواہ مقصد کیسا ہی کیوں نہ ہو اور ان کی نظر میں اخلاق حصولِ مقصد کے ذریعہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۔ فلسفہ اور اخلاق کا تعلق

فلسفہ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی توانائی کے مطابق سارے جہان سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس تعریف کی بنیاد پر تمام علوم اس کلی تعریف کے دائرے میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی لئے گزشتہ ادوار میں علوم کی تعداد کم تھی اور ان کا دائرۂ کار بھی محدود تھا۔ علم فلسفہ ان سب علوم کو زیر بحث لاتا تھا اور فلسفی اس شخص کو کہا جاتا تھا جو مختلف علوم سے آگاہی رکھتا تھا۔ اس دور میں فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

(الف) وہ امور جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں اور انسان کے افعال کے علاوہ ہر چیز ان میں داخل ہے۔

(ب) وہ امور جو انسان کے اختیار اور اس کی قدرت کے دائرہ میں واقع ہیں، یعنی انسانی افعال۔

پہلے حصے کو حکمت نظری کہا جاتا تھا اور اسے مزید تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

۱۔ فلسفہ اولیٰ یا حکمت الٰہی جو وجود کے عمومی احکام اور کائنات کے آغاز وانجام کے بارے میں بحث کرتا تھا۔

۲۔ طبعیات، جس کی بہت سی شاخیں تھیں۔

---

[۱] فلسفہ اخلاق۔9

[۲] الاخلاق النظریہ۔10

۳۔ ریاضیات، اس کی بھی متعدد شاخیں تھیں۔

دوسرا حصہ جو انسان کے افعال سے متعلق ہے، اسے حکمت عملی کہا جاتا تھا اور اس کی بھی تین شاخیں تھیں:

۱۔ اخلاق، اس سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی سعادت اور ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں اور ان کی جڑیں انسان کے اندر ہوتی ہیں۔

۲۔ تدبیر منزل، اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جو گھریلو زندگی کے انتظام و انصرام سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ سیاست اور تدبیر مدن، یہ شعبہ انسانی معاشرے کے امور کے انتظام و انصرام سے بحث کرتا ہے۔

اس طرح اخلاق کو ایک انفرادی معاملہ سمجھ کر اسے خاندان اور معاشرے کے امور یعنی تدبیر منزل اور سیاست مدن کے برابر رکھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے علم اخلاق، فلسفۂ عملی یا حکمت عملی کی ایک شاخ ہے۔

لیکن چونکہ دورِ حاضر میں علوم کی متعدد شاخیں وجود میں آ چکی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں، لہٰذا فلسفہ کا نام صرف پہلے حصہ یعنی حکمت نظری کی پہلی شاخ سے مخصوص ہو چکا ہے۔ بالفاظ دیگر اب فلسفہ کا اطلاق صرف اس علم پر ہوتا ہے جو کائنات کے کلی امور اور اس کے آغاز و انجام سے بحث کرتا ہے۔

اس مسئلہ پر فلاسفہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ حکمت نظری کا مقام و مرتبہ زیادہ ہے یا حکمت عملی کا۔ بعض حکمت نظری کو افضل سمجھتے ہیں جبکہ بعض کی نظر میں حکمت عملی برتر ہے۔ اگر مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو دونوں کا نکتہ نظر صحیح ہے لیکن اس موقع پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔

''فلسفہ'' اور ''اخلاق'' کے باہمی ربط و تعلق کے بارے میں انشاءاللہ مختلف مناسبتوں سے بات ہوتی رہے گی۔

۳۔ اخلاق اور عرفان کا تعلق

اخلاق و عرفان یا بالفاظ دیگر اخلاق اور سیر و سلوک الی اللہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عرفان کی نظر زیادہ تر معارفِ الٰہی پر ہے اور وہ بھی از راہِ علم و استدلال نہیں بلکہ از راہِ کشف و شہودِ باطنی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا قلب اس طرح پاک اور نورانی ہو جائے، اس کی چشم حقیقت کھل جائے اور اس کے حجابات اس طرح برطرف ہو جائیں کہ وہ چشم دل سے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اور اس کے اسماء اور صفات کا مشاہدہ کرے اور اس سے عشق کرنے لگے۔

واضح سی بات ہے، چونکہ علم اخلاق ناپسندیدہ اخلاقی صفات کو، جو کہ چشم دل پر پردہ پڑ جانے کی بنیادی وجہ ہے، دور کرنے میں مدد دیتا ہے، لہٰذا وہ عرفان الٰہی کے ستونوں میں سے ایک ستون اور اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔

دوسری طرف سیر و سلوک الی اللہ، جس کا آخری مقصد معرفت خدا اور قرب خدا کا حصول ہے، وہ درحقیقت عرفان و اخلاق کا مجموعہ ہے۔ باطنی سیر و سلوک ایک قسم کا عرفان ہے جو انسان کو روز بروز اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے نزدیک تر کرتا ہے۔ حجابات کو

برطرف کرتا ہے اور واصل حق ہونے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ بیرونی سیر وسلوک اخلاق ہی ہے۔ایسا اخلاق جس کا مقصد تہذیب وتزکیہ نفس ہے، نہ کہ صرف مادی زندگی کو بہتر کرنا۔

۴۔ اخلاق اور علم کا تعلق

گزشتہ صفحات میں ہم نے جن آیات کے بارے میں بحث کی، وہ کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتی نظر آتی ہیں۔کبھی تزکیہ نفس تعلیم پر مقدم نظر آتا ہے تو کہیں اس کے برعکس تعلیم کو تزکیہ نفس پر مقدم رکھا گیا ہے۔اس سے ان دونوں کے گہرے اور اٹوٹ تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یعنی جب انسان اچھے اور برے اعمال اور اچھی اور بری اخلاقی صفات کا علم حاصل کرتا ہے اور فضائل اور رذائل اخلاقی کے نتائج سے آگاہ ہوتا ہے تو اس کا یقینا اس کی تربیت اور پرورش پر اثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ عمل اور اخلاق کی بہت سی برائیاں جہالت اور نادانی سے جنم لیتی ہیں۔لہٰذا اگر جہالت اور نادانی کی جگہ علم وآگہی کی حکمرانی قائم ہو جائے، یا بعبارتِ دیگر معاشرے کی ثقافتی سطح اونچی ہوجائے تو بہت سی برائیاں خود بخود ختم ہوجائیں گی اور ان کی جگہ خوبیاں لے لیں گی اور بہت سے اخلاقی مفاسد کا خاتمہ ہوجائے گا اور ان کی جگہ اخلاقی محاسن لے لیں گے۔لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی کلی ضابطہ اور قانون نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔بعض لوگوں نے افراط کا راستہ اختیار کیا اور بعض تفریط کے راستے پر چل نکلے۔

بعض نے معروف یونانی فلسفی سقراط کی پیروی کا راستہ اختیار کیا،سقراط کا عقیدہ یہ تھا کہ علم وحکمت اخلاقِ حمیدہ کا سرچشمہ ہیں اور رذائل اخلاقی کی بنیاد جہل ونادانی ہے۔سقراط کے پیروکار بھی کہتے ہیں کہ اخلاقی برائیاں ختم کرنے کیلئے واحد راستہ یہ ہے کہ معاشرے میں علم وآگہی کی سطح کو بلند کیا جائے۔ان کے نکتہ نظر سے فضیلت مساوی ہے علم ومعرفت کے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص علم وآگہی کے ہوتے ہوئے بدی اور شر کی طرف نہیں جاتا اور اگر کوئی نیکی کو پہچان لے تو اس کو ترک نہیں کرتا۔لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اپنی اور دوسروں کی علمی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔خیر وشر کے نتائج اور بدی ونیکی کے اثرات کا علم حاصل کریں تاکہ ہمارے وجود کی شاخوں پر فضائل اخلاقی کی کونپلیں نمودار ہوجائیں۔

اس کے برعکس ایک گروہ علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کا سرے سے منکر ہے۔ان کا کہنا ہے کہ بدکار لوگوں کو علم وآگاہی دینے کا اس کے سوا کچھ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ ہوشیاری اور چالاکی سے جرائم کرنے لگتے ہیں۔ضرب المثل ہے کہ اگر چوروں کو روشنی کی مدد حاصل ہوجائے تو وہ چن چن کر قیمتی چیزیں چرائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم اور اخلاق کے تعلق کا نہ تو مکمل طور پر انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اخلاق کو سو فیصد علم کا ثمر اور نتیجہ قرار

دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی تجربات بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم معاشرے میں ایسے بہت سے افراد کو دیکھ سکتے ہیں جو بدعمل تھے لیکن جب انہیں اپنے برے اعمال کے برے نتائج کا علم حاصل ہو گیا تو انہوں نے برائی کو چھوڑ دیا اور نیکی کی طرف رخ کر لیا۔ ہم خود اپنی زندگی میں بھی اس چیز کا تجربہ رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اچھے اور برے اعمال کی اچھائی اور برائی اور ان کے نتائج و اثرات کا علم رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود برائی کے راستہ پر چلتے جا رہے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ ان کے وجود پر حاکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو دو پہلو رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت اور وجود کا ایک پہلو علم و آگہی سے تشکیل پاتا ہے اور دوسرا پہلو اس کی جبلی خواہشات سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کبھی پہلے پہلو کو ترجیح دیتا ہے اور کبھی دوسرے پہلو کو۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے علم و اخلاق کے باہمی تعلق کے حوالہ سے مندرجہ بالا دو میں سے کسی ایک نظریے کو اختیار کیا ہے، وہ انسان کی شخصیت کے ایک ہی پہلو کے معترف ہیں اور دوسرے پہلو کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

قرآن شریف کی بعض آیات بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ قرآن مجید نے کئی آیات میں جہالت اور برائی کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً

اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾

”تم میں سے جو بھی جہالت کی وجہ سے برے کام کا مرتکب ہو، پھر توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“ (انعام:۵۵)

ایسی ہی بات سورۂ نساء کی آیت ۱۷ اور سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں بھی کہی گئی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ یہاں جہل سے مراد وہ جہلِ مطلق نہیں ہے، جو توبہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جہالت کے درجات میں سے وہ درجہ ہے کہ اگر وہ برطرف ہو جائے تو انسان حق کی طرف آ جاتا ہے۔

پیام قرآن کے پہلے دورہ کی پہلی جلد میں، جہاں ہم نے معرفت اور شناخت کی بحث کی ہے، ہم نے ایسی بہت سی آیات درج کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہل، کفر کا سرچشمہ ہے، جہل برائیوں کا سرچشمہ ہے، جہل ہٹ دھرمی، ضد، تعصب اور بہانہ جوئی کا سرچشمہ ہے۔ اندھی تقلید، اختلاف و انتشار، سوءظن اور بدگمانی، گستاخی اور بے ادبی ہے۔ غرضیکہ سب بری صفات کی بنیاد جہل ہے جو تمام اقدار کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ [1]

دوسری طرف بہت سی آیات واضح اور صریح طور پر یہ کہتی ہیں کہ ”بعض لوگ علم و آگہی کے باوجود غلط راستے پر چلتے ہیں۔ مثلاً آلِ فرعون کے بارے میں فرمایا:

---

[1] پیام قرآن دورہ اول جلد 1 ص 86 تا 98

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ

''انہوں نے یقین رکھتے ہوئے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے ہماری آیات کا انکار کیا۔'' (نمل: ۱۴)

اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝

''وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ اس کا علم رکھتے ہیں۔'' (آل عمران: ۷۵)

اس کے بعد کی چند آیات میں بھی ایسی ہی بات کہی گئی ہے، مثلاً

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَمِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَمِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَمِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝

''اور بے شک ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں تاکہ تم لوگ اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ لفظ یا مطلب) خدا کے پاس سے ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔'' (آل عمران: ۷۸)

ممکن ہے اس آیت میں جس علم وآگہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ جھوٹ کے بارے میں نہ ہو لیکن اس کے باوجود یہ آیت ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا برا ہونا اور اس کے بارے میں عقل وشریعت کا حکم کسی پر مخفی نہیں ہوسکتا۔

روزمرہ کے تجربات بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اخلاقِ رذیلہ سے آگہی بہت سے مقامات پر انسان کو برائی سے روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مقامات پر آگاہ افراد بھی برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر دونوں مکاتب فکر کے درمیان والا مکتبِ فکر حقیقت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟

علم اخلاق اور تمام اخلاقی مباحث کی قسمت کا دارومدار اسی مسئلہ پر ہے، اس لئے کہ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ علم اخلاق ایک بے معنی اور بیہودہ علم بن جائے گا بلکہ تمام انبیاء کی بعثت اور تمام آسمانی کتب کا نزول بھی بے مقصد ہو جائے گا اور برائی سے روکنے والی تمام سزائیں بھی بے معنی ہو جائیں گی۔

لہٰذا انبیاء کی تعلیمات اور آسمانی کتب میں جو اخلاقی اور تربیتی نظام دیئے گئے ہیں اور دیگر تمام مذاہب میں برائی سے

روکنے کیلئے جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ سب اس بات کا بہترین ثبوت ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔ اخلاقی طریقے صرف انبیاء نہیں بلکہ تمام عقلاء کے یہاں بھی قابل قبول واقع ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود تعجب ہوتا ہے کہ فلاسفر اور علمائے اخلاق نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

بعض یہ کہتے ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ برے اور بدطینت لوگ ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی آ بھی جائے تو وہ سطحی اور ناپائیدار ہوتی ہے اور جلد ہی وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے مؤقف کی تائید میں دلائل بھی ہیں جن میں سے ایک یہ کہ جسم اور جان کی ساخت کا اخلاق کے ساتھ قریبی تعلق ہے اور ہر شخص کا اخلاق اس کی روح اور جسم کی خلقت کے تابع ہے۔ جس طرح روح اور جسم میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، اسی طرح اس کے اخلاق میں تبدیلی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

اس طرزِ تفکر کے حامل بعض شعراء نے اپنے اشعار میں وسیع پیمانے پر اشارہ کیا ہے۔ (اگرچہ ممکن ہے کہ ان کے اشعار کو اس بارے میں مبالغہ پر محمول کیا جائے)۔

بعض معروف شعراء کے اشعار کے نمونے ملاحظہ فرمایئے:

پر تو نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بداست
تربیت نا اہل را چون گردگان برگنبداست
شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسی؟
ناکس بہ تربیت نہ شودای حکیم کسی

''ناقص لوہے سے اچھی تلوار کیسے بنائی جاسکتی ہے؟ اے حکیم! تربیت کے ذریعے نااہل کو اہل نہیں بنایا جاسکتا۔''

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و درشورہ زار خس

''اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ بارش کی طبیعت میں لطافت پائی جاتی ہے۔ لیکن باغ میں پھول اگتے ہیں اور شورزمین میں صرف خس وخاشاک۔''

برسیہ دل چہ سود خواندن وعظ
نرود میخ آہنین درسنگ
آہنی را کہ موریانہ بخورد
نتوان برداز آن بہ صیقل رنگ

''جس کا دل سیاہ ہو، اسے وعظ ونصیحت کا کیا فائدہ، اس لئے کہ آہنی میخ کبھی پتھر میں نہیں جاتی۔ جس لوہے کو دیمک لگ جائے، اس کو چمکا کر اس کا زنگ نہیں اتارا جا سکتا۔''

چون بود اصل گوہری قابل
تربیت را در اوائر باشد
ہیچ صیقل نکو ندارد کرد
آہنی را کہ بد گہر باشد
سگ بہ دریای ہفت گانہ مشوء
کہ چو ترشد پلید تر باشد
خر عیسیٰ گرش بہ مکہ برند
چون بیاید ہنوز خر باشد

''اگر اصل گوہر قابل ہو تو تربیت اس پر اثر کرتی ہے۔ کسی قسم کا صیقل اس لوہے کو نہیں چمکا سکتا جو اصل میں برا ہو۔ کتے کو سات سمندروں سے مت دھوؤ، اس لئے کہ وہ گیلا ہو کر اور بھی نجس ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کو اگر مکہ بھی لے جائیں تو واپس آ کر گدھا ہی رہے گا۔''

اپنے اس مؤقف کی تائید میں ایک اور دلیل جو اس مکتبہ فکر کے افراد دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وعظ ونصیحت اور سزا کے خوف جیسے بیرونی عوامل کی وجہ سے اگر اخلاق میں تبدیلی آ بھی جائے تو ان عوامل کے زائل ہو جانے کے بعد انسان اپنی اصل اخلاقی حالت کی طرف پلٹ جاتا ہے، جیسا کہ پانی کی ٹھنڈک حرارت کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے لیکن جیسے ہی حرارت ختم ہوتی ہے، پانی اپنی اصل ٹھنڈک کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ طرزِ فکر اور یہ استدلال انسانی معاشرے کی بدقسمتی اور انحطاط کا سبب ہے۔ اخلاقی صفات میں ''تبدیلی کی قابلیت'' کے حامی مندرجہ بالا دو دلیلوں کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

ا۔ انسان کے اخلاق اور اس کی روح وجسم کے باہمی تعلق کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ تعلق ایک طبیعی تقاضہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ انسان کے اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے۔ یعنی اخلاقی صفات کے حصول کا زینہ تو فراہم کر سکتا ہے لیکن کسی خاص اخلاقی صفت کے حصول پر انسان کو مجبور نہیں کر سکتا۔ جس طرح بعض بیماریوں میں مبتلا والدین کے بچوں میں اس بیماری کے پیدا ہونے کا امکان تو ہوتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ بیماری بہر حال ان میں پیدا ہو جائے کیونکہ احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ان موروثی بیماریوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

کمزور افراد صحت کے اصولوں کی پابندی اور مناسب ورزش کے ذریعے طاقتور بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس طاقتور افراد ان چیزوں کے ترک کر دینے سے کمزور ہو جاتے ہیں۔

علاوہ بر ایں انسان کے جسم اور روح میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔لہٰذا ان سے معرضِ وجود میں آنے والے اخلاق میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج کے تمام پالتو جانور ایک دن وحشی تھے۔انسان نے انہیں پکڑ کر سدھار لیا اور وہ پالتو جانور بن گئے۔ بہت سے پودوں اور درختوں میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔اگر تربیت کے ذریعے ایک جانور اور پودے کی خصوصیات بدلی جا سکتی ہیں تو انسان کے اخلاق میں تبدیلی کیوں نہیں لائی جا سکتی؟اب بھی بہت سے جانوروں کو ایسے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جو ان کی طبیعت کے خلاف ہیں اور وہ ان کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا جواب سے ہی ان کے دوسرے استدلال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے،اس لئے کہ بعض اوقات بیرونی عوامل کی تاثیر اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ذاتی خصوصیات مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تبدیلی آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہے جس کا مشاہدہ پالتو جانوروں کی زندگی میں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ میں بہت سے ایسے انسان نظر آتے ہیں جن کے اخلاق تربیت کے نتیجہ میں مکمل طور پر تبدیل ہو گئے اور ان کی زندگی کے انداز و اسلوب میں ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آ گئی۔اگر کچھ افراد کبھی ظالم لٹیرے تھے تو وہ مشہور و معروف عابد و زاہد بن گئے۔اگر ہم اس بات کی طرف دھیان دیں کہ ایک پختہ اخلاقی صفت کس طرح وجود میں آتی ہے تو ہمیں اس کے برطرف کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ ہر اچھا اور برا عمل انسان کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ روح کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔اس عمل کے تکرار سے اس کا اثر بھی زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ انسان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ''عادت'' کا نام دیا جاتا ہے۔جب عادت برقرار رہے تو وہ ایک پختہ ملکہ بن جاتی ہے۔

پس جس طرح تکرارِ عمل کے نتیجہ میں برے اخلاقی ملکات معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں، اسی طرح انہیں ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔البتہ اچھے اخلاقی ملکات کی تشکیل کیلئے نصیحت،غور و فکر،صحیح تعلیمات اور صحت مند ماحول کی تاثیر اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں ایک تیسرا مکتب فکر بھی موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ بعض اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے اور بعض میں نہیں۔ جو صفات فطری اور طبیعی ہوتی ہیں،ان میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی لیکن جو صفات بیرونی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں،ان میں تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔[1]

اس نظریہ کی تائید میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اس لئے کہ صفات کے درمیان اس فرق کا قائل ہونا طبیعی اور فطری

[1] محقق نراقی نے جامع السعادات میں اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔(جامع السعادات جلد 1 ص 24)

اخلاق کی فرع ہے، حالانکہ یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اگر بالفرض ثابت ہو بھی تو کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ فطری صفات میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔کیا جنگلی جانوروں کو پالتو جانور نہیں بنایا جاسکتا؟ کیا تعلیم وتربیت اس قدر گہری تاثیر کی حامل نہیں ہوسکتی کہ انسان کے وجود کی گہرائی میں جاکر تبدیلی کردے؟

اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات وروایات

جو کچھ ہم نے مذکورہ صفحات میں کہا، وہ عقلی اور تاریخی حوالے سے تھا۔ جب ہم نقلی دلائل یعنی وحی اور ارشاداتِ معصومین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مسئلہ اور بھی واضح ہوجاتا ہے، اس لئے کہ:

۱۔ انبیاء ورسل کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول، انسانوں کی ہدایت کا یہ سارا اہتمام اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ تمام انسانوں میں فضائل اخلاقی کی پرورش ممکن ہے۔[1]

هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲ (جمعہ: ۲)

اور اس جیسی آیات اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد ان لوگوں کی ہدایت، تربیت اور تزکیہ نفس تھا جو ضلال مبین یعنی کھلی گمراہی میں تھے۔

۲۔ وہ تمام آیات جو یابنی آدم، یا ایھا الناس اور یاعبادی جیسے الفاظ کے ذریعے تمام انسانوں کو خطاب کرکے امرو نہی کررہی ہیں یا تزکیہ وتہذیب نفس پر مشتمل مطالب کو بیان کررہی ہیں۔ اخلاق رذیلہ کی تبدیلی اور ناپسندیدہ صفات کی اصلاح کے ممکن ہونے کی بہترین دلیل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خطابات کی یہ عمومیت لغو اور بیہودہ ہوتی۔

ممکن ہے اس کے جواب میں کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ تمام آیات عملی احکام پر مشتمل ہیں جبکہ اخلاق کا تعلق اندرونی صفات سے ہے۔

لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اخلاق اور عمل لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کیلئے علت اور معلول یعنی سبب اور نتیجہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر اچھی اخلاقی صفت اچھے اعمال کا سرچشمہ ہوتی ہے جبکہ ہر بری اخلاقی صفت برے افعال کا سبب ہوتی ہے۔ اس کے مقابل اچھے اور برے اعمال بار بار کی تکرار سے اچھے اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ یہ نظریہ کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، عقیدۂ جبر کی پیداوار ہے۔ اس لئے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اچھے اور برے اخلاق کے حامل افراد اپنے اخلاق کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ چونکہ ان کے اعمال ان کے اخلاق کی بنیاد پر استوار ہوتے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے اصول کافی جلد 1 ص 155 اور کشف المراد، بحث قضاء وقدر ومفاسد جبر۔

ہیں، لہٰذا وہ اپنے اچھے یا برے افعال کے انجام دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود وہ مکلف ہیں کہ اچھے اعمال کو انجام دیں اور برے اعمال سے اجتناب کریں۔ یہ عین جبر ہے اور جتنی خرابیاں عقیدۂ جبر کی وجہ سے لازم آتی ہیں، اس نظریہ کی وجہ سے بھی لازم آتی ہے۔[1]

جو آیات وضاحت اور صراحت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی طرف راغب کرتی ہیں اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی تاکید کرتی ہیں، وہ بھی اخلاقی صفات میں تبدیلی کے ممکن ہونے کی مضبوط دلیل ہیں۔ جیسا کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰

"جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہو گیا۔" (شمس:۹،۱۰)

اس آیت میں لفظ "دسها" استعمال ہوا ہے جس کا مادہ "دس" ہے۔ لفظ "دسیسه" بھی اسی سے نکلا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ناپسندیدہ چیز کو کسی چیز میں داخل کر دیا جائے۔ اس آیت میں اس لفظ کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی طبیعت کی بنیاد پاکیزگی اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور رذائل اخلاقی باہر سے اس میں داخل ہوتے ہیں اور دونوں میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ سورۃ فصلت کی آیت ۳۴ میں ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝۳۴

"بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو، تم اچانک دیکھو گے کہ جو شخص تمہارا دشمن تھا، گویا وہ تمہارا پرانا اور مخلص دوست ہے۔"

یہ آیت اس بات کو بخوبی ثابت کرتی ہے کہ پرانی اور گہری دشمنی جو انسان کے اخلاق پر گہرا اثر ڈالتی ہے، محبت اور اچھے سلوک کے نتیجہ میں گرم جوشی اور دوستی میں بدل جاتی ہے۔ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو یہ تبدیلی بھی ممکن نہ ہوتی۔

اسلامی احادیث میں بھی یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مشہور و معروف حدیث

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (سفینۃ البحار، مادہ خلق)

اخلاق میں تبدیلی کے امکان کی بہترین مثال ہے۔

۲۔ بہت سی روایات حسن خلق کی ترغیب دیتی ہیں مثلاً یہ حدیث نبوی:

لو یعلم العبد مافی حسن الخلق لعلم انه یحتاج ان یکون له خلق حسن[1]

''اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حسن اخلاق کے کیا فوائد ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا کہ انہیں اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔''

۳۔ آنحضرتؐ سے ایک حدیث میں ہے:

الخلق الحسن نصف الدین[2]

''حسن اخلاق نصف دین ہے۔''

۴۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الخلق المحمود من ثمار العقل، الخلق المذموم من ثمار الجهل[3]

''پسندیدہ اخلاق عقل کا ثمر ہے اور ناپسندیدہ اخلاق جہل کا ثمر ہے۔''

چونکہ علم اور جہل میں تبدیلی ممکن ہے، لہٰذا اخلاق جو ان کا ثمر ہے، اس میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

۵۔ ایک اور حدیث نبوی میں ہے:

ان العبد لیبلغ بحسن خلقه عظیم درجات الاخرة و شرف المنازل وانه لضعیف العبادة[4]

''انسان عبادت میں کمزور ہونے کے باوجود حسن اخلاق کی بدولت آخرت میں عظیم درجات اور اشرف منازل پر فائز ہو سکتا ہے۔''

اس حدیث میں حسن اخلاق کا عبادت کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ اخروی درجات کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً اختیاری اعمال کا نتیجہ ہیں اور حسن اخلاق کے حصول کی رغبت دلائی گئی ہے جو ایک اکتسابی امر ہے جس میں کوئی اجبار و اکراہ نہیں ہے۔

اس قسم کی روایات و کلمات ارشاداتِ معصومین علیہم السلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں[5] جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے ورنہ یہ سب ترغیبات بے معنی اور لغو قرار پائیں گی۔

---

[1] بحار الانوار 10۔369

[2] بحار الانوار 71:385

[3] غرر الحکم 1280۔1281

[4] محجة البیضاء 5، 93

[5] اصول کافی جلد 2 میں مرحوم کلینی نے باب حسن خلق میں اس قسم کی 18 روایات نقل کی ہیں

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جریر بن عبداللہ سے فرمایا:

انك امرء قدا حسن الله خلقك فاحسن خلقك[۱]

''اللہ نے تجھے خوبصورت چہرہ عطا کیا ہے، تو اپنے اخلاق کو خوبصورت بنا۔''

مختصر یہ کہ کتب احادیث ایسی احادیث سے بھری پڑی ہیں جو اخلاق میں تبدیلی کے ممکن ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔[۲]

ہم اس باب کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو فضائل اخلاق کے حصول کی رغبت دلا رہی ہے:

الکرم حسن السجیة و اجتناب الدنیة

''انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ حسن خلق کو اختیار کرے اور اخلاقی پستی سے اجتناب کرے۔''[۳]

اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل

مندرجہ بالا دلائل کے جواب میں کچھ ایسی روایات کا سہارا لیا گیا ہے جن سے پہلی نظر میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ناممکن ہے:

۱۔ رسولؐ اللہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

الناس معادن کمعادن الذهب والفضة، خیارهم فی الجاهلیة خیار هم فی الاسلام

''لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں، دورِ جاہلیت کے اچھے اسلام میں بھی اچھے ہیں۔''

۲۔ آنحضرتؐ سے ہی ایک اور حدیث میں مروی ہے:

اذا سمعتم ان جبلا زال عن مکانه فصدقوه، و اذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصدقوه! فانه سیعود الی ماجبل علیه

''جب تم سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اسے سچ سمجھو لو مگر جب یہ سنو کہ کسی نے اپنا اخلاق چھوڑ دیا ہے تو اسے سچ مت سمجھو۔ وہ جلدی اپنی فطرت پر لوٹ آئے گا۔''[۴]

---

[۱] سفینۃ البحار، مادہ خلق

[۲] اصول کافی جلد 2، روضہ کافی، میزان الحکمہ، ج3 اور سفینۃ البحار کے متعلقہ ابواب کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۳] غرر الحکم۔

[۴] جامع السعادات: 24:1

جواب

ان روایات کا جواب سابقہ روایات کی روشنی میں دینا مشکل نہیں ہے جن سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔اس لئے کہ یہ بات قابل قبول ہے کہ لوگوں کی روحی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔بعض سونے کی کان جیسے ہوتے ہیں اور بعض چاندی کی کان کی مانند ہوتے ہیں۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ روحی کیفیات تبدیلی کو قبول نہیں کرتی ہیں۔یہ صفات مقتضی کی حیثیت رکھتی ہیں مگر علت تامہ نہیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ ایسے افراد تعلیم وتربیت کی روشنی میں مکمل طور پر تبدیل ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر ہم اسی حدیث کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ اس طرح ہوگا کہ سب لوگ اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔یعنی بعض خوب ہیں اور بعض خوب تر (سونے اور چاندی کی مانند)۔لہٰذا ان میں اخلاق رذیلہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حدیث نمبر ۲ بھی مقتضی کی حیثیت رکھتی ہے، نہ علت تامہ کی یا دوسرے الفاظ میں لوگوں کی اکثریت کی حالت کو بیان کر رہی ہے، نہ سب کی حالت کو، ورنہ اس حدیث کا مضمون تاریخی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ تاریخ یہ بات قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اخلاق میں تبدیلی کی اور مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔ہمارا روزمرہ کا تجربہ بھی یہ بتلاتا ہے کہ بہت سے برے افراد تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں اپنی زندگی کی راہ بدل لیتے ہیں اور عمر بھر نئے راستے پر قائم رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ لوگوں کی روحی اور اخلاقی کیفیات مختلف ہونے کے باوجود کوئی شخص بھی کسی مخصوص اخلاقی روش پر قائم رہنے پر مجبور نہیں ہے۔عین ممکن ہے کہ اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد ہوائے نفس کی پرستش کے نتیجہ میں اخلاقی انحطاط کی دلدل میں گر جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بری اخلاقی صفات کے حامل افراد استاد اور مربی کے زیر سایہ خودسازی کی منازل طے کرکے کمال کے اعلیٰ ترین درجات پر پہنچ جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض فاسد اور مفسد افراد اپنے برے کردار پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں، ہمیں تو اللہ نے پیدا ہی اس طرح کیا ہے۔وہ چاہتا تو ہمیں کسی اور اخلاق پر پیدا کردیتا۔

بہرحال عدم تغیر کا قائل ہونے کا نتیجہ عقیدۂ جبر کو تسلیم کرنے، انبیاء کے مکتب کے انکار، علمائے اخلاق اور ماہرین نفسیات کی کوششوں کو بیہودہ سمجھنے اور انسانی معاشرے کے فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ

مذکورہ بالا بحث کو ہم علم اخلاق کی مختصر تاریخ بیان کرنے پر ختم کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاقی بحث کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا جب انسان نے روئے زمین پر قدم رکھا تھا۔اس لیے کہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہوں نے نہ صرف اپنی اولاد کو اخلاقی تعلیمات سے آگاہ کیا بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا اور انہیں جنت میں ٹھہرایا، اوامرونواہی کے ذریعے انہیں اخلاقی مسائل سے آگاہ کردیا۔

دیگر انبیاء بھی لوگوں کا تزکیہ نفس کرنے کے کاموں میں مشغول رہے جوکہ انسانوں کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آگیا جن کی تعلیمات کا بڑا حصہ اخلاقی مباحث پر مشتمل ہے۔ان کے سب پیروکار انہیں علم اخلاق کے عظیم معلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

لیکن اخلاق کے سب سے عظیم معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو **انما بعثت لا تمم مکارم** الاخلاق کا پرچم لے کر مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴

''اور یقیناً آپ خلق عظیم کی منزلت پر فائز ہیں۔'' (قلم:۴)

فلاسفہ میں سے بھی بعض عظیم شخصیات معلم اخلاق کی حیثیت سے معروف تھیں جن میں افلاطون، ارسطو، سقراط اور یونان کے بعض دیگر فلاسفہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بہرحال رسولؐ اللہ کے بعد آئمہ معصومین علیہم السلام اخلاق کے عظیم ترین معلم تھے۔اس بات کا ثبوت اخلاقی روایات کا وہ عظیم ذخیرہ ہے جو ان سے نقل ہوا ہے۔ان کے مکتب میں ایسی عظیم شخصیات نے پرورش اور تربیت پائی جن میں سے ہر ایک اپنے دور کا معلم اخلاق تھا۔

آئمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحابِ بافضیلت کی زندگی ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ اور فضائل اخلاق کا روشن ترین ثبوت ہیں۔

یہ ایک مفصل داستان ہے کہ ''علم اخلاق'' کب اسلام میں پیدا ہوا اور یہ کہ اس علم کی مشہور شخصیات کون تھیں۔آیت اللہ صدر نے اپنی گرانقدر تالیف ''تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام'' میں اس کی طرف مختصراً اشارہ کیا ہے۔

موصوف نے اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ علم اخلاق کی بنیاد رکھنے والی اولین شخصیت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جنہوں نے جنگ صفین سے واپسی پر امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے معروف خط میں اخلاقی مسائل کی بنیادوں کو واضح فرمایا۔اس خط میں اخلاقی فضائل اور صفات رذیلہ کا نہایت عمدہ انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔[1]

اس خط کو سید رضی مرحوم نے نہج البلاغہ میں درج کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے شیعہ علماء نے اسے نقل کیا ہے۔اہل

---

[1] حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا رسالۃ الحقوق ان کی دعائے مکارم الاخلاق اور دیگر بہت سی دعائیں اور مناجات اخلاق اسلامی کے معروف مصادر میں سے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سنت کے بعض علماء مثلاً ابواحمد بن عبداللہ عسکری اپنی کتاب "**الزواجر والمواعظ**" میں اس خط کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر حکمت میں سے کوئی چیز سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے تو وہ یہی خط ہے۔

(ب) علم اخلاق کے عنوان سے لکھی گئی پہلی کتاب ابونصر سکونی اسماعیل بن مہران کی تالیف ہے۔ ان کا تعلق دوسری صدی سے ہے۔ ان کی کتاب کا نام "**صفة المومن والفاجر**" ہے جو اخلاق اسلامی کی پہلی کتاب کی حیثیت سے معروف ہے۔

(ج) اس کے بعد آیت اللہ صدر ان شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جو اگر چہ کسی کتاب کے مولف تو نہ تھے مگر علم اخلاق کے بزرگان کی حیثیت سے معروف ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

ا۔سلمان فارسیؓ

جن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ سلمان فارسی کی حیثیت حکیم لقمان جیسی ہے۔ وہ اولین و آخرین کا علم رکھتے تھے۔ وہ ایک وسیع سمندر تھے اور ہم اہل بیتؑ میں سے تھے۔ [1]

۲۔ابوذر غفاریؓ

انہوں نے ساری عمر اخلاق اسلامی کی ترویج میں گزاری اور خود اخلاق اسلامی کا عمدہ نمونہ تھے۔ اخلاقی مسائل میں حضرت عثمان اور امیر شام سے ان کے اختلافات تاریخ میں مشہور ہیں۔ آخر کار انہوں نے اپنی جان بھی اسی راہ میں قربان کردی۔

۳۔عمار یاسرؓ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ان کے اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے:

> ''کہاں ہیں میرے بھائی جو راہِ حق کی طرف آئے اور اس پر ثابت قدم رہے؟ کہاں ہیں عمار؟''
>
> پھر آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا اور طویل گریہ فرمایا۔ پھر فرمایا:
>
> ''ہائے میرے وہ بھائی جو قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ فرائض کو اہتمام سے ادا کرتے تھے۔ سنتوں کو زندہ کرتے تھے اور بدعتوں کو مٹاتے تھے۔'' [2]

---

[1] بحار الانوار۔22۔391

[2] نہج البلاغہ خطبہ 142

۴۔نوف بکالی

۹۰ہجری کے بعدفوت ہوئے،وہ زہدوعبادت اور علم اخلاق میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

۵۔محمد بن ابوبکر

حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار تھےاورزہدوعبادت میں ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔روایات میں ان کا ذکرحضرت علی علیہ السلام کےاصحاب خاص میں کیا گیا ہے۔اخلاق میں ان کی زندگی ایک نمونہ تھی۔

٦۔جارود ابن منذر

یہ حضرت امام زین العابدین،حضرت امام محمد باقر اورحضرت امام جعفرصادق علیہم السلام کے اصحاب میں شامل اور بزرگ علماء میں سے تھے۔علم وعمل اور جامعیت میں اعلیٰ مقام پر تھے۔

۷۔حذیفہ بن منصور

یہ حضرت امام محمد باقر،حضرت امام جعفرصادق اورحضرت امام موسیٰ کاظم علیہم السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ان معصومینؑ سے علم حاصل کیا۔وہ مکارم اخلاق اورتہذیب نفس میں نابغہ روزگار تھے۔

۸۔عثمان بن سعید عمری

یہ امام زمان حضرت مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے وکلائے اربعہ میں سے تھےاورحضرت عمار یاسر کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ معارف واخلاق واحکام وفقہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی بزرگ شخصیات ہیں جن کے اسمائے گرامی کے ذکر سے یہ بحث طولانی ہوجائے گی۔

اس ضمن میں اس بات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں علم اخلاق پر بہت زیادہ کتب لکھی گئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:

۱۔ المانعات من دخول الجنة۔ یہ کتاب جعفر بن احمد قمی کی تالیف ہے جو تیسری صدی کے بزرگ علماء میں سے تھے۔

۲۔ الآداب اور مکارم الاخلاق۔ یہ کتاب علی بن احمد کوفی کی تالیف ہیں جو چوتھی صدی کے علماء میں سے تھے۔

۳۔ طهارت النفس یا تهذیب الاخلاق و تطهیر الاعراق۔ تالیف:ابن مسکویہ جو پانچویں صدی کے علماء میں سے تھے۔ان کی یہ کتاب علم اخلاق کی مشہور کتب میں سے ہے۔انہوں نے علم اخلاق میں ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس

کا نام ''آداب العرب والفرس'' ہے۔ یہ کتاب پہلی کتاب جیسی مشہور نہیں ہے۔

۴۔ **تنبیه الخاطر و نزهة الناظر** جو ''مجموعہ ورام'' کے نام سے مشہور اور علم اخلاق کی معروف کتب میں سے ہے۔ یہ کتاب ورام ابن ابی خوارس کی تالیف ہے جو چھٹی ہجری کے علماء میں سے تھے۔

۵۔ ساتویں صدی میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی معروف کتب ''اخلاق ناصری''، ''اوصاف الاشراف'' اور ''آداب المتعلمین'' نظر آتی ہیں۔

ان میں سے ہر کتاب علم اخلاق کی کتب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

۶۔ دیگر صدیوں میں بھی ''**ارشاد القلوب**''، تالیف: دیلمی، ''**مصابیح القلوب**''، تالیف: سبزواری، ''**مکارم الاخلاق**''، تالیف: حسن بن امین الدین، ''**الآداب الدینیه**''، تالیف: امین الدین طبرسی، ''**محجة البیضاء**''، تالیف: فیض کاشانی جو کہ اس علم کی بہترین کتب میں سے ہے اور ''**جامع السعادات**''، ''**معراج السعادة**'' اور ''**اخلاق بشر**'' اور دیگر بہت سی کتب تالیف ہوئیں۔[1]

مرحوم علامہ آقا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب ''الذریعہ'' میں علم اخلاق کی درجنوں کتب کا ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بہت سی کتب سیر و سلوک اور بعض کتب عرفان کی حیثیت سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتب میں ایک یا چند ابواب کو علم اخلاق کے لیے مخصوص کر دیا گیا جس کا واضح ترین نمونہ بحار الانوار اور اصولِ کافی ہیں۔ ان کتب کے بہت سے حصے اخلاقیات سے متعلق ہیں اور اس علم کا بہترین سرمایہ شمار ہوتے ہیں۔

---

[1] تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلامیہ کے آخری اب سے تلخیص وتصرف کے ساتھ۔

دوسرا باب

انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار

بعض نا آ گاہ افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی مسائل کا تعلق صرف انسان کی ذاتی زندگی سے ہے یا وہ انہیں ایسے مقدس، روحانی اور معنوی امور سے متعلق سمجھتے ہیں جن کا نتیجہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ تفکر ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اکثر بلکہ سب اخلاقی مسائل انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، خواہ وہ اثرات مادی ہوں یا معنوی۔ اخلاق کے بغیر انسانی معاشرہ ایک ایسے چڑیا گھر میں تبدیل ہو جائے گا جس میں صرف پنجرے ہی ان انسان نما حیوانوں کی تخریبی کارروائیوں کا سد باب کر سکتے ہیں۔ اخلاق کے بغیر انسانوں کی طاقتیں ضائع اور ان کی صلاحیتیں کچلی جائیں گی۔ آزادی ہوس ران افراد کا کھلونا بن جائے گی اور انسانی زندگی اپنا حقیقی مفہوم کھو دے گی۔

اگر گزشتہ تاریخ میں صحیح غور وفکر کیا جائے تو بہت سی ایسی اقوام نظر آئیں گی جن میں سے ہر ایک کسی خاص اخلاقی انحراف کی وجہ سے یا تو زوال سے روبرو ہو گئیں یا پھر مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔

کئی حکمرانوں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے ملک وملت کو دردناک آلام ومصائب کے منہ میں دھکیل دیا۔ کئی فوجی کمانڈروں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے سپاہیوں کی جان کو خطرے میں ڈالا اور اپنی خودسری کی وجہ سے انہیں ہلاکت سے دوچار کیا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسانی زندگی اخلاق کے بغیر لطافت، شگوفائی اور حسن سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اخلاق کے بغیر خاندانوں کی شیرازہ بندی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ اخلاق کے بغیر انسان کی معاشرتی زندگی ایسے دردناک انجام سے دوچار ہو جاتی ہے جس سے برے انجام کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اخلاقیات کے بغیر بھی انسانی معاشرہ کی خوش نصیبی صحیح قوانین اور احکام پر عمل کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اخلاقیات کی مدد کے بغیر قوانین پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ جب تک لوگوں کے اندر احکام اور قوانین پر عمل کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو، بیرونی کوششوں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کیا ہو سکتا۔ طاقت کے استعمال سے قوانین کا نفاذ، قوانین کے نفاذ کی بدترین صورت ہوتی ہے جسے انتہائی اضطرار کی صورت میں ہی اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ایمان اور اخلاق قوانین کے نفاذ کی بہترین ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم نمونہ کے طور پر بعض قرآنی آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں:

۱۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾

''اگر بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے ان پر برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے تکذیب کی اور ہم نے ان کی کرتوتوں پر ان کو پکڑ لیا۔

(اعراف:۹۶)

۲۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾

''اور نیکی اور بدی ہرگز باہم برابر نہیں ہیں۔ بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو۔ اچانک تم دیکھو گے کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، گویا وہ تمہارا مخلص دوست بن چکا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صابر ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

(فصلت:۳۴،۳۵)

۳۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان کے لیے مہربان ہوگئے۔ اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ لوگ یقیناً آپ کے پاس سے دور ہوجاتے۔ پس آپ انہیں معاف کردیں، ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں، امور میں ان سے مشورہ کریں، پھر جب آپ فیصلہ کرلیں تو اللہ پر توکل کریں۔ یقیناً اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(آل عمران:۱۵۹)

۴۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۳۴﴾

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔(سبا:۳۴)

۵۔ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ

اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ
اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ ؕ اَوَلَمۡ يَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَهۡلَكَ مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ
مَنۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُ قُوَّةً وَّاَكۡثَرُ جَمۡعًا ؕ وَلَا يُسۡـَٔلُ عَنۡ ذُنُوۡبِهِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۷۸﴾

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے، اس میں آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرو۔ جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اسی طرح احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (قارون نے) کہا: ''جو کچھ میرے پاس ہے، میں نے اسے اپنے علم کے ذریعے حاصل کیا ہے۔'' کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اس سے پہلے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور دولت مند تھے (اور جب اللہ کا عذاب آ جائے) تو مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (قصص: ۷۷، ۷۸)

۶۔ فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ﴿۱۱﴾
وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا ﴿۱۲﴾

''میں نے ان سے کہا تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان سے تم پر مسلسل برکت والی بارشیں بھیجتا ہے اور تمہارے اموال اور کثرت اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہارے لیے باغات اور نہریں بناتا ہے۔ (نوح: ۱۰ تا ۱۲)

۷۔ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَكَلُوۡا مِنۡ
فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ؕ مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا
يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾

''اگر یہ تورات، انجیل اور جو بھی ان کی طرف نازل کیا گیا، قائم کرتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں جبکہ زیادہ تر بد عمل ہیں۔ (مائدہ: ۶۶)

۸۔ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ
وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۷﴾

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے حساب سے انہیں جزا دیں گے۔ (نحل: ۹۷)

۹۔ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾

''اور جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی اس پر تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا محشور کریں گے۔ (طٰہٰ: ۱۲۴)

۱۰۔ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ

''جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' (انفال: ۴۶)

تشریح اور نتیجہ

مندرجہ بالا ان آیات میں سے پہلی آیت میں زمین و آسمان کی برکات اور تقویٰ کے باہمی تعلق کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تقویٰ اور ایمان کی بدولت آسمان و زمین کی برکات انسان رواں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس آیات الٰہی کی تکذیب اور تقویٰ سے دوری کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے:

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰۤى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

آسمان و زمین کی برکات کے معنی بہت وسیع ہیں۔ بارش کا برسنا، پودوں کا اگنا، نعمتوں کی فراوانی اور انسانی ذرائع میں اضافہ، سب اس میں آجاتے ہیں۔

برکت اصل میں کسی چیز کے ثابت اور برقرار رہنے کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر پائیدار نعمت پر کیا جاتا ہے۔ بنابرایں بے برکت چیزیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ثبات و قرار حاصل نہ ہو اور وہ جلد فنا ہو جاتی ہوں۔

بہت سی اقوام جو بہت زیادہ مادی وسائل، قدرتی ذرائع، صنعتی پیش رفت اور ترقی میں بہت آگے ہیں، اخلاقی انحطاط اور بد عملی کے نتیجہ میں ان نعمتوں کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہیں اور یہی نعمتیں ان کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآنی آیات میں ایسے لوگوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کی نعمتیں ان کی تباہی اور بدبختی کا سبب بن گئیں۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۸۵ میں ہے:

وَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

یعنی ''ان کے اموال اور اولاد تمہارے لیے باعث تعجب نہ ہونے چاہئیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ دنیا میں انہیں ان کے ذریعے سزا دے اور ان کی جان اس طرح نکلے کہ وہ کافر ہوں۔''

اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط یکجا ہو جائیں تو یہ دنیا میں بھی باعث عذاب ہے اور اخروی

زیان اور خسارے کا بھی سبب ہے۔

بالفاظ دیگر جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور ایمان، اخلاق اور انسانی اصول ایک ساتھ ہوں تو یہ آبادی، ترقی، فلاح و بہبود اور سعادت و خوش نصیبی کا سبب ہوتی ہیں۔ زیر بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط، بخل، ظلم، خودسری و ہوس رانی ایک ساتھ ہو جائیں تو اس کا نتیجہ تباہی و فساد ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں کینہ و نفرت اور دشمنی کو ختم کرنے کا بہت موثر اور اہم طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں دشمنی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اخلاق کے تعامل کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ایسا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر کسی میں یہ بزرگی اور وسیع القلبی نہیں پائی جاتی بلکہ صرف وہی لوگ اس مقام پر پہنچتے ہیں جو صبر و استقامت رکھتے ہیں اور اس اخلاقی فضیلت کو صرف وہی پا سکتے ہیں جنہیں ایمان و تقویٰ سے بڑا حصہ ملا ہو:

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾

نفرت اور کینہ آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور ایک پہاڑ بن جاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی معاشروں کی ایک بڑی مشکل رہی ہے۔ تمام جنگوں کے پیچھے یہی خرابی کارفرما ہے جو ہر چیز کو نگل لیتی ہے اور ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اگر اس آیت میں بیان کردہ طریقہ، یعنی بدی کا مقابلہ نیکی سے، اختیار کیا جائے تو سب کینے اور نفرتیں اس طرح زائل ہو جائیں گے جیسے گرمیوں کی دھوپ میں برف پگھل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ بہت سی خطرناک جنگوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ جرائم کم ہو جائیں گے اور تعاون و دوستی کی راہیں کھل جائیں گی۔

لیکن جیسا کہ خود قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان نے ایمان و تقویٰ اور اخلاقی تربیت سے بہت زیادہ حصہ پایا ہو۔

ظاہری بات ہے کہ اگر آپ سختی کا جواب سختی سے دیں اور بدی کے جواب میں بدی سے پیش آئیں تو برائی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور روز بروز ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ وسیع سطح پر بدقسمتی کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن بدی کا نیکی سے مقابلہ کرنے کی بھی کچھ حدود و شرائط ہیں جن کو مناسب مقام پر بیان کیا جائے گا۔

تیسری آیت لوگوں کو جذب کرنے میں حسن اخلاق کی تاثیر کو بیان کر رہی ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے کہ اگر کوئی سربراہ اخلاق الٰہی سے آراستہ ہو تو اسے اپنے امور کی انجام دہی میں کتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور کس طرح بکھرے ہوئے دلوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے معاشرے کی پیش رفت اور ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان پر نرم اور مہربان ہوگئے۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ آپ کے اردگرد سے بکھر جاتے۔ آپ انہیں معاف کیجیے۔ ان کے لیے استغفار کیجیے۔ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ کوئی فیصلہ کریں تو اس پر ثابت قدم رہئے اور اللہ پر توکل کیجیے کیونکہ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہ آیت انتظامی امور میں کامیابی، دلوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور معاشرے میں اتحاد پیدا کرنے میں حسن اخلاق کی گہری تاثیر کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حسن اخلاق کی یہ تاثیر صرف الٰہی اور معنوی امور میں محدود نہیں ہے بلکہ انسان کی مادی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے:

عفو و درگزر۔ استغفار۔ مشورہ۔

یہ تینوں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لیے کہ جو اخلاقی کیفیت مہربانی اور تواضع کی بنیاد پر ہوتی ہے، وہ لوگوں کی خطاؤں سے چشم پوشی، استغفار اور غلطیوں کی تلافی کا سبب بنتی ہے اور لوگوں کے انسانی احترام کا باعث ہوتی ہے۔

چوتھی آیت بداخلاقی کے بعض منفی اثرات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہمیشہ عیش پرست افراد نے انبیاء کے خلاف صف آرائی کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا سراپا تکبر اور خود پسندی سے بھرا ہوا تھا۔ آیت یہ کہتی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٤﴾

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن شریف ان کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے کہ یہ اس قدر مغرور تھے کہ کہتے تھے کہ:

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٣٥﴾

''اور ہم مال و اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔''

یہ اخلاقی کیفیت معاشرے میں اصلاح کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کے خلاف صف آرائی کا سبب بنتی ہے۔ ایسے لوگ اہل حق کو قتل کر دیتے ہیں، حق پرستوں کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور معاشرے میں ظلم اور بدعنوانی کے بیج پھیلاتے

ہیں۔ یہاں سے انسانی معاشرے پر اخلاقی انحطاط کے منفی اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ناز و نعمت کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تکبر کی وجہ سے یہ افراد فکری لحاظ سے بھی واضح اور بھیانک غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ نعمتوں کی فراوانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں بہت پسندیدہ ہیں کیونکہ اگر وہ مقرب بارگاہِ الٰہی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں یہ نعمتیں عطا نہ فرماتا۔ اس طرح یہ افراد ہر قسم کی اخلاقی اقدار کا انکار کر دیتے تھے۔ قرآن شریف اگلی آیت میں اس طرزِ تفکر کی غلطی کو نمایاں کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیار قرب صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔

صرف قریش کے ثروت مند مشرکین ہی نہیں بلکہ ناز و نعمت کے پروردہ سارے متکبر، انبیاء اور مصلحین کے سامنے اسی مؤقف کو اختیار کرتے رہے۔

پانچویں آیت میں اسی مسئلہ کا ایک اور رخ دکھایا گیا ہے۔ یہ آیت بنی اسرائیل کے مغرور اور متکبر دولتمند قارون کا حال بیان کر رہی ہے۔

جب بنی اسرائیل کے اہل علم و دانش نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے مال و دولت کو اپنی اور اپنے معاشرے کی سعادت کے لیے کام میں لاؤ اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان سے پیش آؤ اور ظلم و فساد کی راہ پر نہ چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾

اس نے مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ جواب دیا:

''میں نے یہ ساری دولت اپنے علم اور اپنی قابلیت سے حاصل کی ہے۔''

یعنی یہ نہ کہو کہ یہ دولت اللہ نے مجھے دی ہے بلکہ یہ کہو کہ میرے علم اور میری قابلیت کے نتیجہ میں یہ دولت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ آخر کار اسی تکبر اور غرور نے اسے انکارِ آیاتِ الٰہی کی ہولناک کھائیوں میں گرا دیا اور وہ ظلم و فساد اور دشمنانِ حق و عدالت کے ساتھ دوستی اور تعاون میں مشغول ہو گیا۔ پھر ایک حادثہ میں اپنے تمام اموال سمیت زمین میں دھنس گیا۔

یہاں ایک بار پھر یہی حقیقت واضح ہو کر نظر آتی ہے کہ رذائل اخلاقی کس حد تک انسان اور معاشرے کے چہرے کو تبدیل کر دیتے ہیں اور انہیں سعادت اور خوش نصیبی تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دوران گفتگو بنی اسرائیل کے اہل علم و دانش نے اس سے کہا:

''خوش نہ ہو، اللہ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾

یہ بات واضح رہے کہ اسلام اور عقل کی رو سے خوش رہنا اور خوشی و مسرت کی زندگی گزارنا برا عمل نہیں ہے۔ یہاں خوشی و مسرت سے مراد غرور و تکبر، اللہ تعالیٰ سے غفلت اور ظلم و بدعنوانی و گناہ سے حاصل ہونے والی خوشی و مسرت ہے جو مزید سرکشی اور فساد کا سبب بنتی ہے۔

چھٹی آیت میں ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی شکایت کو دیکھتے ہیں۔ اس میں ہمیں اس حقیقت کی طرف متعدد اشارے ملتی ہیں کہ انسان کے اعمال اور اس کی اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

''یا اللہ! میں نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب کے حضور استغفار کرو (غرور و نخوت کی سواری سے نیچے اتر آؤ، اپنے گناہوں، کفر و عناد اور ہٹ دھرمی سے توبہ کرو) اس لیے کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تاکہ وہ آسمان سے مسلسل بابرکت بارش نازل کرتا رہے اور تمہیں اموال و اولاد کی کثرت سے نوازے اور تمہیں باغات اور نہریں عطا کرے۔''

آگے چل کر انہی آیات میں اللہ کے احکام کے سامنے ان کی سرکشی اور ان کی ان بری خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے گناہوں کی بنیادی وجہ تھیں۔

ممکن ہے کوئی یہ کہہ دے کہ مندرجہ بالا آیت توبہ و استغفار اور نعمتوں کی فراوانی کے درمیان ایک معنوی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں معنوی تعلق کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلق بھی مراد ہو۔ لہٰذا قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

''جو کچھ لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے زمین اور سمندر میں فساد ظاہر ہوا۔'' (روم: ۴۱)

سورۂ ہود میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے جہاں رسول اللہؐ مشرکین مکہ سے فرماتے ہیں:

أَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى

''میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اپنے رب کی خدمت میں استغفار کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، وہ ایک مقررہ مدت تک تمہیں اچھی نعمتوں سے بہرہ مند فرمائے گا۔'' (ہود: ۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مقررہ مدت تک ''متاع حسن'' سے بہرہ مند فرمانا دنیوی زندگی کی مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جس کا دارومدار گناہوں سے توبہ، استغفار اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنے اور اچھی اخلاقی صفات اپنانے پر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صفات رذیلہ مختلف قسم کے گناہوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں جبکہ گناہ معاشرے میں مختلف قسم کی

خرابیوں اور تعلقات کے ٹوٹنے، اتحاد، دوستی، محبت اور اعتماد کے خاتمہ کا سبب بنتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ معاشرتی بگاڑ، اقتصادی بدحالی اور امن وامان کے برباد ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ساتویں آیت میں اہل کتاب کی سرکشی اور طغیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

''اگر اہل کتاب تورات وانجیل کو اور جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوا، قائم کرتے (اور تقویٰ اختیار کرتے اور عمل صالح انجام دیتے) تو آسمان اور زمین سے رزق حاصل کرتے۔ (لیکن) ان میں سے بہت کم اعتدال کی راہ پر ہیں جبکہ ان کی اکثریت کے اعمال برے ہیں۔''

اس آیت میں بھی ہم اعمالِ صالح اور تقویٰ اور زمین وسمان سے برکتوں کے نزول کے درمیان قریبی تعلق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ تعلق روحانی بھی ہوسکتا ہے اور طبیعی بھی، بلکہ حقیقت میں یہ دونوں تعلق پائے جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ فیض الٰہی محدود نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اس سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہونے کی صلاحیت اور قابلیت پیدا کریں۔ لیکن راہِ اعتدال سے انحراف نے، خواہ افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی شکل میں، انسانی زندگی کو اندھیروں سے بھر دیا ہے اور آرام وسکون کی بساط لپیٹ دی ہے۔ ویران کن جنگیں انسانی جانوں اور معنوی ومادی سرمائے کو چاٹ جاتی ہیں اور انسانوں کی کئی برس کی محنت کو تباہ وبرباد کردیتی ہیں۔

اس آیت کا یہ جملہ ''وما انزل الیھم'' سب آسمانی کتاب، حتیٰ کہ قرآن مجید کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ سب آسمانی کتابوں کی بنیادی تعلیمات ایک ہی ہیں۔ اگرچہ اسلامی وقرآنی تعلیمات گزشتہ کتب کی نسبت زیادہ کامل اور جامع ہیں۔

آٹھویں آیت میں ہم ایک نئی تعبیر کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ آیت حیات طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی اور اعمال صالح (اور جو صفات اعمال صالح کا سرچشمہ ہیں) کے درمیان موجود تعلق کو بیان کرتی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت اور مومن بھی ہو تو ہم انہیں پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے مطابق انہیں جزا دیں گے۔''

گزشتہ آیات میں زیادہ تر اخلاق اور معاشرتی زندگی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی لیکن زیر بحث آیت میں زیادہ تر ذاتی

زندگی کو مد نظر رکھا گیا ہے۔لہٰذا ارشاد فرمایا کہ جو انسان خواہ مرد ہو یا عورت، اگر ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہے تو اسے حیات طیبہ نصیب ہوگی۔اس آیت میں کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حیات طیبہ صرف آخرت میں محدود ہے بلکہ زیادہ تر دنیوی زندگی یا دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی زندگی پیش نظر ہے۔

حیات طیبہ کیا ہے؟ مفسرین نے حیات طیبہ کی متعدد تشریحات بیان کی ہیں۔بعض نے اس سے رزق حلال مراد لیا ہے۔ بعض نے قناعت اور اللہ کی عطا پر راضی رہنا مراد لیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رزق حلال اور توفیق عبادت ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی پاکیزگی اور ہر قسم کی آلودگی، ظلم وخیانت، عداوت وغیرہ سے دوری اور ہر قسم کی پاکیزگی مراد ہے۔لیکن ''**ولنجزینھم اجرھم**'' جو کہ اخروی اجر کو بیان کر رہا ہے، سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات طیبہ کا اشارہ زیادہ تر اس دنیا میں پاکیزہ زندگی کی طرف ہے۔

نویں آیت میں اللہ تعالی کی یاد سے غفلت اور روگردانی کو ''معیشت ضنک'' (تنگ اور سخت زندگی) کا سبب قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

''جو بھی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ اور سخت ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا محشور کریں گے۔''

ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اللہ تعالی کی یاد اور اس کے اسماء وصفات کی طرف توجہ تمام اخلاقی فضائل کی پرورش کا سبب ہے اور انسان کو روز بروز اخلاق وصفات کے حوالہ سے اسماء وصفات الٰہی کے قریب کرتی ہے۔یہ اخلاقی خصوصیات جو انسان کے اعمال صالح کا اصل سرچشمہ ہیں، اس کی زندگی کو وسیع، آسان اور پاکیزہ بنا دیتی ہیں۔

اس کے برعکس اللہ کی یاد سے روگردانی انسان کو اس سرچشمۂ نور سے دور کر کے اسے تاریک شیطانی صفات کے قریب کر دیتی ہے جو معیشت ضنک یعنی تنگ زندگی کا سبب ہو جاتی ہیں اور وہ ایک مرگبار زندگی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔اس طرح یہ آیت بھی بہت وضاحت کے ساتھ اخلاق وایمان اور انفرادی واجتماعی زندگی کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے ''معیشت ضنک'' کی تشریح کرتے ہوئے اسے رزق حرام سے بسر ہونے والی زندگی قرار دیا کیونکہ ایسی زندگی بہت سی پریشانیوں کا سبب بنتی ہے۔بعض دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ ایمان سے محروم افراد عام طور پر بہت حریص ہوتے ہیں۔مادی خواہشات کی شدت اور نہ ختم ہونے والی پیاس، مادی نعمتوں کے ضائع ہو جانے کا خوف، بخل اور دیگر مذموم صفات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام مادی وسائل کے باوجود انسان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

قیامت کے دن ان لوگوں کا اندھا پن بھی درحقیقت دنیا میں ان کے اندھے پن کا تجسم ہوگا کیونکہ انہوں نے دنیا میں اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں اور حق وسعادت کی راہ کو نہیں دیکھا اور شہوت کی تاریکیوں میں ڈوب گئے۔

اس نکتہ کی مزید تشریح کتاب کے اس حصہ کے آخر میں بیان ہوگی۔

دسویں آیت میں دشمنی اور اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ وحدت کے خاتمہ اور قوت و طاقت کے گھٹنے کا سبب ہوتے ہیں:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

''آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ اس سے تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

ظاہری بات ہے کہ تمام اختلافات اور ہر کشمکش صفات رذیلہ کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ ہر چیز پر اپنی حاکمیت کی خواہش کرنا، خود پسندی، مفاد پرستی، احساس برتری، حرص و کینہ و حسد جیسی صفات میں سے ہر ایک اختلاف اور دشمنی کا سبب ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ کمزوری اور عزت و شوکت کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف نے "تذهب ريحكم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''ریح'' کے معنی اصل میں ''ہوا'' کے ہیں اور بطور کنایہ طاقت، قوت اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب ہوا چلتی ہے تو پرچم، جو کسی قوم کی طاقت، قوت اور غلبہ کی علامت ہوتا ہے، لہرانے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ:

''اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہاری طاقت، قوت اور غلبہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''ہوا کے چلنے کے نتیجہ میں کشتی کی رفتار زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ جلدی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔''

لغت کی معروف کتاب ''التحقیق'' کے مؤلف فرماتے ہیں کہ روح اور ریح کے معنی میں ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ روح غیر مادی دنیا میں روحانی حرکت کے معنی دیتی ہے جبکہ ریح مادی دنیا میں حرکت کے معنی رکھتی ہے۔

بعض اوقات ریح کا لفظ خوشبو کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے:

إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ

''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔'' (یوسف: ۹۴)

اس لحاظ سے ممکن ہے اس جملہ کے معنی یہ ہوں کہ طاقتور افراد یا اقوام کی خوشبو ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے لیکن اگر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اختلاف کی وجہ خواہ خود پسندی، مفاد پرستی، حسد، بخل ہو یا کچھ اور، انسانی زندگی پر اس کے منفی اثر اور معاشرتی پسماندگی میں اس کے کردار کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سے اخلاقی مسائل اور معاشرتی زندگی کے مسائل کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی ہر اخلاقی صفت، معنوی اور اخروی پہلو کے علاوہ مادی اور دنیوی زندگی سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور یہ معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز ہے، بلکہ اس کے برعکس، ان کا قریبی اور قوی تعلق ہے۔ کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی اخلاقی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر اگر کسی بڑے معاشرے کے لوگ سعادت مندانہ اور صلح وامن پر مبنی تعاون و رواداری کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوں تو کم از کم اتنی اخلاقی پختگی ان میں ضرور ہونی چاہیے کہ انسانوں کے فکری، روحی اور جذباتی اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ سب انسان مختلف پہلوؤں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ امید ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ سب لوگ ہر چیز میں ہماری پیروی کریں، بلکہ مشترکہ اصولوں کی حفاظت کی کوشش کرنی چاہیے اور فکر وعمل کے اختلافات کو بالغ نظری اور وسیع القلبی، نرمی اور بردباری سے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر دو افراد بھی طویل المدت تعاون جاری نہ رکھ سکیں گے۔

ظاہری بات ہے کہ اختلاف کو برداشت کرنے کی اخلاقی جرأت جو اتحاد، قدرت اور عظمت کے حصول کے لیے ضروری ہے، صرف باتوں سے پیدا نہیں ہوسکتی، اس کے لیے کافی زیادہ تزکیہ نفس اور تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے۔

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق

گزشتہ صفحات میں جن باتوں کا ہم نے قرآنی آیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے، وہ احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر نظر آتی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ہم یہاں پر چند احادیث کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فی سعة الاخلاق کنوز الارزاق

''رزق کے خزانے اخلاق کی وسعت میں پائے جاتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۵۳)

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الخلق یزید فی الرزق

''حسن اخلاق رزق میں اضافہ کرتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۶۸:۳۹۶)

۳۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من حسن خلقه کثر محبوه و آنست النفوس به (غرر الحکم)

''جس کا اخلاق اچھا ہو، اس کے چاہنے والے زیادہ ہوتے ہیں اور دل اس سے مانوس ہوتے ہیں۔''

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان البر و حسن الخلق یعمر ان الدیار و یزیدان فی الاعمار

''نیکی اور حسن اخلاق شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۶۸:۳۹۵)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شہروں کی آبادی اتحاد، اخلاص اور تعاون کی مرہون منت ہے۔ جو چیزیں ان اقدار کو پختہ کرنے میں موثر ہوتی ہیں، وہ شہروں کو آباد رکھنے میں بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہیں۔

طویل عمری بھی آرام وسکون، فکری آسودگی، غربت کی روک تھام اور معاشرتی تعاون کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں بھی حسن اخلاق کی بدولت ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

حسن الخلق یثبت المودة

''حسن اخلاق سے محبت میں ثبات پیدا ہوتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۴:۱۴۸)

متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بد اخلاقی معاشرے میں نفرت، اختلاف، رزق کی تنگی اور بے سکونی کا باعث بنتی ہے۔

۶۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ساء خلقه ضاق رزقه

''بد اخلاق کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۷۔ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

من ساء خلقه اعوزه الصدیق و الرفیق

''بد اخلاق کے دوست اسے چھوڑ جاتے ہیں۔'' (غرر الحکم)

۸۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

سوء الخلق نکد العیش و عذاب النفس

''بد اخلاقی زندگی میں گھٹن اور روحی عذاب کا باعث ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا:

من ادوم الناس غما

''کون سب سے زیادہ غمگین ہوتا ہے؟'

آپؑ نے فرمایا:

اسوئھم خلقا

''جو سب سے زیادہ بداخلاق ہوتا ہے۔''(مستدرک الوسائل،۹:۸ ۳۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں ہے کہ لقمان حکیم اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتے تھے:

اياك والضجر وسوء الخلق وقلة الصبر فلا يستقيم على هذه الخصال صاحب

''بے حوصلگی، بداخلاقی اور کم صبری سے پرہیز کر کیونکہ ان صفات کے مالک کا کوئی دوست باقی نہیں رہتا۔''(بحارالانوار،۱۰:۱۹ ۴)

تیسرا باب

اخلاقی مکاتب فکر

علم اخلاق میں بہت سے مکاتب فکر ہیں جن میں سے زیادہ تر گمراہ ہیں اور ان کا نتیجہ بھی خلافِ اخلاق ہوتا ہے۔قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ان مکاتب فکر کی شناخت مشکل نہیں ہے۔قرآن شریف فرماتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٥٣﴾

''یہی میرا سیدھا راستہ ہے،لہٰذا اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو،وہ تمہیں اس راہ سے الگ کرکے متفرق کردیں گے۔اللہ نے تمہیں یہ نصیحت کی ہے تاکہ تم متقی بن جاوٴ۔''(انعام:۱۵۴)

یہ آیت اسلامی عقائد اور عملی و اخلاقی تعلیمات کے ایک بڑے حصے کے بیان کے بعد آئی ہے اور دس اسلامی احکام پر مشتمل ہے۔سب انفرادی اور اجتماعی نظام ہائے زندگی کی طرح اخلاقی مکاتب فکر بھی ''نظریہ کائنات'' اور کائنات کے متعلق کلی اور عمومی نظریات سے جنم لیتے ہیں۔یہ دونوں ایک اکائی کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں۔

جو لوگ نظریہ کائنات کو آئیڈیالوجی سے الگ سمجھتے ہیں اور ان کے باہمی تعلق کا انکار کرتے ہیں،ان کا استدلال یہ ہے کہ نظریہ کائنات منطق اور سائنسی دلائل پر قائم ہوتا ہے جبکہ آئیڈیالوجی یعنی ''یہ ہونا چاہیے'' اور ''یہ نہیں ہونا چاہیے'' احکام ہیں۔یہ طرزِ فکر رکھنے والے افراد اس اہم نکتہ سے غفلت کرگئے ہیں یہ احکام اسی صورت میں صحیح اور حکیمانہ ہوسکتے ہیں جب کائنات کے حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ورنہ یہ ناقابل قبول فرضی باتیں متصور ہوں گی۔

اس بات کو کئی مثالوں کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے،مثلاً جب اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ شراب خوری نہ کرو یا بین الاقوامی قوانین یہ کہتے ہیں کہ منشیات کا استعمال ممنوع ہے تو یہ احکام،خواہ الٰہی ہوں یا انسانی،یقیناً کچھ حقائق کی بنیاد پر بنتے ہیں۔وہ حقیقت یہ ہے کہ شراب اور منشیات کا استعمال انسان کی روح اور جسم پر بہت منفی اور تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی احکام مصلحت پر مبنی ہیں تو اس کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔جب ہم کہتے ہیں،

كلما حكم به العقل حكم به الشرع

''ہر وہ حکم جو عقل دیتی ہے،شریعت بھی وہی حکم دیتی ہے۔''

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ احکام اور حقائق کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

انسانی معاشروں کے قانون ساز اداروں میں جب ماہرین انفرادی واجتماعی مسائل پر بحث کر کے قانون سازی کرتے ہیں تو وہ بھی اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی حکیمانہ حکم انسانی زندگی کے حقائق سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ حکم، حکم اور قانون نہیں بلکہ بیہودگی اور دھونس کہلائے گا۔ چونکہ حقیقت ایک ہی ہے، لہٰذا کسی چیز کے بارے میں صحیح حکم بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم حقائق اور ان کی بنیاد پر قائم قوانین کو جاننے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں نظریات کا اخلاقی مسائل کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے اور مختلف اخلاقی مکاتب فکر کی پیدائش اور ان کے اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم اخلاقی مکاتب فکر پر نظر ڈالتے ہیں۔

ا۔ اخلاق اور مکتب توحید

اس مکتبہ فکر کی بنیاد پر تمام موجودات مخلوق خدا ہیں۔ ہم سب اسی کی طرف سے ہیں اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد معنوی اور روحانی کمال حاصل کرنا ہے۔ مادی ترقی جہاں تک اس ہدف کے حصول کی راہ ہموار کرے، وہ بھی معنوی ترقی ہی محسوب ہوگی۔

معنوی وروحانی ترقی یا تکامل کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اور ایسی راہ پر چلنا ہے جو انسان کو اس کی صفات کمال سے نزدیک کردے۔

اس مکتب کی رو سے وہ تمام صفات افعالی جو انسان کو اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کریں، معیارِ اخلاق قرار پاتی ہیں۔ اس مکتب کے نظام اقدار کا مرکز ومحور بھی اعلیٰ انسانی صفات، معنوی کمال اور قرب خدا ہے۔

۲۔ اخلاق اور مادیت

ہم جانتے ہیں کہ مادہ پرستی کے کئی شعبے ہیں جن میں کمیونسٹ مکتب فکر زیادہ مشہور ہے۔ یہ مکتب فکر ہر چیز کو مادی نظر سے دیکھتا ہے اور خدا اور معنوی کمال پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ مکتب فکر اقتصاد کو ہی ہر چیز کی بنیاد قرار دیتا ہے اور تاریخ کے لیے بھی مادی اور اقتصادی ماہیت کا قائل ہے۔ اس مکتب فکر کی رو سے ہر وہ چیز جو کمیونسٹ اقتصادی نظام سے نزدیک کرے، عین اخلاق ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

”ہر وہ چیز جو کمیونسٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کردے، وہ اخلاق ہے۔“

مثلاً جھوٹ یا سچ کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ ان میں کون سی چیز انقلاب کی رفتار تیز کرتی

ہے۔ اگر جھوٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کر رہا ہو وہ اخلاقی ہے اور اگر سچ انقلاب پر منفی اثر ڈالے تو وہ غیر اخلاقی ہے۔

مادہ پرستی کے دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اخلاق کی تشریح کرتے ہیں۔ جو مادی لذتوں کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ بہ عبارت دیگر ان کے نزدیک ہر وہ صفت یا فعل جو حصولِ لذت کی راہ ہموار کرے، عین اخلاق ہے۔

جو مادہ پرست ذاتی مفاد کو ہر چیز کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ہر چیز کو حتی کہ انسانی معاشرے کو بھی اس حد تک محترم سمجھتے ہیں جب تک ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل ہو رہی ہو۔ (مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرے اسی کا نمونہ ہیں)۔ ان کے یہاں وہی چیز اخلاقی ہے جو ان کے ذاتی مفادات کے حصول میں معاون ثابت ہو۔ یہ ہر چیز کو ذاتی مفاد پر قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

۳۔ اخلاق اور عقلی فلسفہ

وہ فلاسفہ جو عقل کو بنیادی حقیقت قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی دنیا کی مانند انسان کے اندر ایک عقلی دنیا آباد کرے، ان کے نزدیک وہ تمام صفات واعمال اخلاق کے زمرے میں شمار ہوں گے جو انسان کی عقل کو اس کے حیوانی میلانات پر حاکم بنانے میں مدد دیں۔

۴۔ اخلاق اور دیگر پسندی

فلاسفہ کی وہ جماعت جو زیادہ تر معاشرے کے بارے میں سوچتے ہیں اور فرد کی بجائے معاشرے کو اصل قرار دیتے ہیں، ان کی نظر میں وہ افعال اخلاق کہلاتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہو اور ہر وہ چیز جس کا فائدہ دوسروں کی بجائے اپنے آپ کو پہنچے، وہ غیر اخلاقی ہے۔

۵۔ اخلاق اور ضمیر پرستی

وہ فلاسفہ جو عقل انسانی کی بجائے ضمیر انسانی کو اصل قرار دیتے ہیں، جنہیں ''ضمیر پرست'' کا نام دیا جا سکتا ہے، وہ ایسے امور کو معیار اخلاق قرار دیتے ہیں جن کا حکم انسانی ضمیر دیتا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کو ضمیر انسانی بغیر عقلی استدلال کے ضروری قرار دیتا ہے، مثلاً انسانی ضمیر عدل کو اچھا اور ظلم کو برا، ایثار کو اچھا اور خود پرستی کو برا، شجاعت کو اچھا اور بزدلی کو برا کہتا ہے۔

اس مکتب فکر کی تاکید اس بات پر ہے کہ اخلاقی ضمیر کو زندہ و بیدار کیا جائے اور ہر چیز جو اخلاقی ضمیر کو کمزور کرتی ہے، اس کا خاتمہ ہونا چاہیے تا کہ انسانی ضمیر اچھے اور برے کے درمیان ایک اچھے جج کی طرح فیصلہ کر سکے۔

حسن و قبح عقل کے طرفدار اگرچہ عقل کی بات کرتے ہیں لیکن ان کی مراد عقل استدلالی نہیں بلکہ عقل وجدانی ہے جس کا دوسرا نام اخلاقی ضمیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احسان کا حسن اور ظلم کا قبح ثابت کرنے کے لیے کسی عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ

سلیم النفس انسان کے ضمیر پر یہ حقیقت خود بخود آشکار ہے۔

لیکن ان فلاسفہ میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس حقیقت کا انکار نہیں کرتے کہ ممکن ہے بعض امور میں اخلاقی ضمیر کوئی فیصلہ نہ کر سکتا ہو بلکہ خاموش ہو۔ ایسے مرحلہ پر اخلاقی امور کو غیر اخلاقی امور سے پہچاننے کے لیے وحی اور شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر عقل کے حکم کو شریعت کی تائید حاصل ہو جائے تو انسان زیادہ اطمینان کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو گا۔

نتیجہ

اہم اخلاقی مکاتب فکر کے بارے میں مختصر گفتگو سے اسلام کے اخلاقی مکتب فکر کی برتری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس خدا پر ایمان ہے جو کمال مطلق اور مطلق کمال ہے اور اس کا حکم تمام موجودات پر حاکم ہے۔ انسانوں کا کمال اس میں ہے کہ اس کی صفات جمال وجلال کا عکس اپنے اندر پیدا کریں اور اس کی ذات مقدس سے نزدیک سے نزدیک تر ہوں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اخلاقی صفات انسانی معاشرے کی فلاح اور انسانوں کی مشکلات سے نجات دینے میں موثر نہیں ہیں۔ صحیح اسلامی نظریہ کائنات، ساری کائنات کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ذات واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ اس دائرے کا مرکز اور ماسوا اللہ ہر چیز، اس سے متصل اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی باہم پیوستہ ہیں۔ بنا برایں ہر وہ چیز جو فرد کے لیے مفید ہے، معاشرے کے لیے بھی مفید ہے اور ہر چیز جو معاشرے کے لیے مفید ہے، فرد کے لیے بھی مفید ہے۔

بالفاظ دیگر اخلاقی اقدار دوطرفہ اثر رکھتی ہیں۔ وہ فرد کی بھی تعمیر کرتی ہیں اور معاشرے کی بھی۔ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اخلاقی امور صرف وہی ہیں جو دوسروں کے لیے مفید ہوں، نہ کہ اپنے لیے، وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان دونوں میں جدائی نظر آتی بھی ہے تو وہ بہت محدود اور مختصر ہے۔ ہم اس بات کی وضاحت پہلے بھی کر چکے ہیں۔ مناسب مواقع پر اس کی مزید وضاحت ہوتی رہے گی۔

اہم نکات

۱۔ اخلاق اور نسبیت (Relativity)

آیا اچھے اور برے اخلاق اور فضائل ورذائل مطلق (Absolute) ہیں یا نسبی (Relative)، مثلاً شجاعت، ایثار اور اپنے نفس پر تسلط رکھنا، بغیر کسی استثناء کے ہر زمان ومکان میں اچھی صفات تصور کی جاسکتی ہیں، یا یہ کہ ان کا اچھا یا برا ہونا نسبی (Relative) ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ صفات بعض معاشروں میں اور بعض زمانوں اور بعض جگہوں پر اچھی

ہیں اور بعض میں بری؟

جوحضرات اخلاق کونسبی سمجھتے ہیں، ان کے دوگروہ ہیں:

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جونسبیت کو سارے عالم وجود پر حاکم سمجھتے ہیں۔ جب وجود اور عدم نسبی ہوں تو اخلاق بھی لامحالہ نسبی ہوں گے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو وجود اور اخلاق کے درمیان کسی تعلق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی فضائل و رذائل کی شناخت کا معیار معاشرے میں ان کی قبولیت یا عدم قبولیت ہے۔ اس طرح ایک ہی صفت مثلاً شجاعت کسی معاشرے میں مقبول اور کسی معاشرہ میں غیر مقبول ہو۔ جس معاشرے میں یہ مقبول ہو، وہاں اس کا شمار اخلاقی فضائل میں ہوگا۔ جہاں یہ غیر مقبول ہو، وہاں اس کا شمار رذائل اخلاقی میں ہوگا۔

یہ گروہ اخلاقی افعال کے حسن وقبح کو بھی معاشرے کے ردوقبول کے معیار پر جانچتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذاتی طور پر کوئی بھی فعل اچھا یا برا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں، اخلاقی مسائل کا تعلق ان معیاروں سے ہے جو نظریۂ کائنات سے جنم لیتے ہیں، جو معاشرے کو ہی اصل سمجھتے ہیں، وہ بھی اس کی خالص مادی شکل میں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اخلاق کو نسبی سمجھیں۔ اس لیے کہ انسانی معاشرہ ہر وقت تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کی مادی شکل بھی بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ بات باعث تعجب نہیں ہوگی کہ اگر یہ گروہ معاشرتی ردوقبول کو اچھے اور برے اخلاق کی شناخت کا معیار قرار دے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ واضح ہے۔ اس طرزِ فکر کی رو سے اخلاقی اصول معاشرے کے رہنما اور پیشرو ہونے کی بجائے معاشرے کے تابع ہوں گے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فعل تھا کیونکہ معاشرہ اسے قبول کرتا تھا۔ اسی طرح غارت گری جو زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے لیے باعث فخر تھی، وہ بھی ایک اخلاقی فعل محسوب ہوگی۔ اسی طرح ہم جنسیت ان معاشروں میں ایک اخلاقی فعل شمار ہوگی جہاں یہ بدبختی موجود ہے۔

اس قسم کے مکاتب فکر انسانی معاشروں کے لیے جس قسم کے مہلک اثرات اور خطرات کا باعث ہو سکتے ہیں، وہ کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اسلام میں اخلاقی فضائل ورذائل کا معیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ثابت اور نا قابل تغیر ہے، لہٰذا اسلام میں اخلاقی معیار بھی مستقل اور نا قابل تغیر ہے۔ انسانی معاشروں اور افراد کا فرض ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کی پیروی کریں، نہ کہ اسے اپنا تابع بنائیں۔

خدا پرست، انسانی فطرت اور اخلاقی ضمیر کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا پرتو سمجھتے ہیں، بشرطیکہ یہ آلودہ نہ ہو چکے ہوں۔ اس لیے اخلاقی ضمیر پر مبنی اخلاق اور حسن وقبح عقلی (عقل عملی مراد ہے) ثابت اور مستقل سمجھتے ہیں۔ اسلام اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی

کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اچھے اور برے یا بالفاظ دیگر ''خبیث'' و''طیب'' کو بطور مطلق بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں انسانی معاشرے کے حالات کو غیر موثر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ

''کہہ دیجئے کہ طیب اور خبیث کبھی برابر نہیں ہو سکتے، خواہ خبیثوں کی کثرت آپ کے لیے حیران کن ہو۔'' (مائدہ:۱۰۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

''وہ ان کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔'' (اعراف:۱۵۷)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴿۲۴۳﴾

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر فضل اور احسان کرتا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔'' (بقرہ:۲۴۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۰۳﴾

''آپ جس قدر اصرار کریں لوگوں کی اکثریت مومن نہیں بنے گی۔'' (یوسف:۱۰۳)

ان تمام آیات میں ایمان، پاکیزگی اور شکر کو ایک ''قدر'' (Value) قرار دیا گیا ہے، خواہ لوگوں کی اکثریت ان کی مخالف ہو۔ اسی طرح کفر، ناپاکی اور ناشکری کو منفی قدریں قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اکثریت انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے خطبات میں، جو نہج البلاغہ میں مندرج ہیں، بار بار اس بات پر تاکید کی ہے کہ آپ کسی عمل یا قدر کا لوگوں کی اکثریت کی طرف سے رد یا قبول ہونا معیار فضیلت ورذیلت نہیں ہے۔ ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

ایها الناس لا تستو حشوا فی طریق الهدی لقلة اهله فان الناس قد اجتمعوا علی مائدة شبعها قصیر وجوعها طویل

''اے لوگو! راہ حق پر چلتے ہوئے اس وجہ سے وحشت زدہ نہ ہو جانا کہ اس پر چلنے والے کم ہیں، اس لیے کہ لوگ ایک ایسے دستر خوان کے گرد جمع ہو گئے ہیں جس کی سیری مختصر اور بھوک طویل ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

حق و باطل، ولکل اھل؛ فلئن امر الباطل لقدیما فعل، ولئن قل الحق فلربما ولعل

''حق اور باطل دونوں موجود ہیں اور دونوں کے حامی اور طرفدار بھی موجود ہیں۔ اگر باطل کی حکمرانی قائم ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے اور اگر حق کے پیرو کم ہیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے (اور وہ کامیاب ہو جائیں)۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶)

یہ سب باتیں اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی کرتی ہیں اور معاشرے کی اکثریت کے ردوقبول کو اعمال اور اخلاق کے اچھا یا برا ہونے کا معیار نہیں مانتی ہیں۔

قرآن مجید اور ارشاداتِ معصومینؑ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

سوال

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آسمانی شریعتوں، خصوصاً اسلام کی تعلیمات میں بھی کہیں کہیں نسبت کو قبول کیا گیا ہے، مثلاً اسلام جھوٹ کو ایک غیر اخلاقی عمل قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے اسے اخلاقی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں۔ یہ کسی حد تک اخلاق اور حسن و قبح کے نسبی ہونے کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔

جواب

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب بھی واضح ہے۔ وہ یہ کہ اخلاق یا حسن و قبح کا نسبی ہونا اور بات ہے اور مختلف مباحث میں استثناء کا موجود ہونا ایک الگ بات ہے۔

بالفاظ دیگر نسبیت میں کوئی ثابت اور مستقل معیار موجود نہیں ہے۔ اس میں جھوٹ اچھا ہے نہ برا۔ اسی طرح احسان اور ظلم کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ کسی معاشرے کی اکثریت انہیں قبول کرتی ہے یا رد کرتی ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیمات میں جھوٹ، ظلم، بخل، کینہ اور حسد وغیرہ غیر اخلاقی افعال ہیں، خواہ اکثریت انہیں قبول کرے یا نہ کرے۔

یہ ایک ثابت اور مستقل اصول ہے لیکن کہیں کہیں کسی استثنائی صورتحال کا پیدا ہو جانا عین ممکن ہے۔ لہٰذا استثناعات کا پایا جانا جو کہ ہر کلی قاعدے میں پائے جاتے ہیں، نسبیت کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ اگر ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی

غلط فہمیوں کا سد باب ہو جائے گا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ احکام موضوعات کے تابع ہیں، اس لیے ان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو کسی صورت میں نسبیت کی دلیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس بات کی وضاحت اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ہر حکم کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے، مثلاً کسی شخص کے جسم پر زخم لگانا ایک جرم ہے جس کا قصاص لینا واجب ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع بدل جاتا ہے۔ ایک جراح ایک چاقو ہاتھ میں لے کر ایک مریض کی جان بچانے کے لیے اس کا پیٹ چاک کر دیتا ہے یا اس کے قلب کو شگافتہ کر دیتا ہے تاکہ اس کے دل کی رگوں کی اصلاح کر سکے۔ ایسی صورت میں موضوع بدل جاتا ہے اور یہ عمل جرم نہیں کہلاتا بلکہ طبیب اور جراح قابل تعریف اور انعام کے حقدار قرار دیئے جاتے ہیں۔

موضوعات کی تبدیلی سے احکام میں رونما ہونے والی تبدیلی کو نسبیت کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نسبیت یہ ہے کہ کوئی موضوع اپنی ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر مختلف اشخاص یا مختلف اوقات میں مختلف احکام کا محکوم ہو جائے۔

شرعی احکام بھی اسی طرح سے ہیں۔ شراب حرام اور نجس[1] ہے۔ لیکن اگر وہ سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو پاک اور حلال ہے۔ اس بات کا نسبیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نسبیت یہ ہے کہ جو معاشرے شراب کو پسند کرتے ہیں، وہ شراب کو حلال قرار دیں اور جو معاشرے اسے ناپسند کرتے ہیں، وہ اسے حرام قرار دیں۔

اخلاقی مسائل میں بھی بعض اوقات ہمارا سامنا ایسے موضوعات سے ہوتا ہے جو ایک صورت میں فضیلت اور اس شکل کے تبدیل ہو جانے سے رذیلت بن جاتے ہیں۔ حد اعتدال میں نڈر ہونا شجاعت ہے جو ایک فضیلت ہے۔ لیکن اگر یہ حد اعتدال سے نکل کر تہور کی صورت اختیار کر لے تو یہ فضیلت سے نکل کر رذیلت بن جاتی ہے یا یہ کہ جھوٹ، جہاں عام طور پر برائی کا سبب اور اعتماد کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے، حرام اور رذیلت ہوتا ہے۔ لیکن جہاں اس کا مقصد لوگوں کے تعلقات میں بہتری پیدا کرنا ہو، وہاں حلال اور فضیلت بن جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ موضوع کی اس تبدیلی کو نسبیت کا نام دینا چاہیں، ہم نام رکھنے کے معاملہ میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے اور یہ اختلاف ہمارے نکتہ نظر سے ایک لفظی اختلاف ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں موضوع اور ماہیت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اگر نسبیت کے طرفداروں کا مؤقف بھی یہی ہو تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ مسئلہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ہم کسی موضوع کے ایک ہی حالت پر ہوتے ہوئے معاشرے کی اکثریت کی پسند و ناپسند کو فضیلت و رذیلت اور حسن و قبح کا معیار قرار دیں۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام، قرآن، عقل اور منطق کی رو سے اخلاق کا نسبی ہونا غلط ہے۔ درحقیقت اخلاق کا نسبی ہونا اخلاق کی نفی کے مترادف ہے، اس لیے کہ اخلاق کے نسبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو برائی معاشرے میں

---

[1] شراب کے نجس ہونے میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صحیح فتویٰ یہ ہے کہ شراب حرام ہے مگر نجس نہیں ہے۔

عام ہو جائے، وہ فضیلت ہے۔ وسیع پیانہ پر پھیلنے والی ہر اخلاقی بیماری صحت اور سلامتی سمجھی جانے لگے گی۔ اس طرح اخلاق معاشرے کی اصلاح کی بجائے معاشرہ میں بگاڑ اور خرابی کا سبب بن جائے گا۔

۲۔ اخلاق اور رویے کا متقابل اثر

اخلاق اور عمل کا باہمی تعلق اور اخلاق کا انسان کے عمل پر اثر کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اعمال عام طور پر ہمارے اندرونی صفات کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں۔ جس شخص کے دل میں بخل، حسد یا تکبر نے ٹھکانہ بنالیا ہو اور اس کی فکر اور روح کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہو، ظاہر سی بات ہے کہ اس کے اعمال بھی اس رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک حاسد شخص کے اعمال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حسد کی آگ اس کے دل میں جل رہی ہے اور کسی پل اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس طرح متکبر افراد کی تمام حرکات وسکنات میں تکبر کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ تمام اچھی اور بری اخلاقی صفات کا انسان کے اعمال پر اسی طرح کا اثر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے ان اعمال کو اخلاقی اعمال کا نام دیا ہے، اس لیے کہ یہ اعمال انسان کی اخلاقی صفات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل وہ اعمال ہوتے ہیں جو کبھی انسان سے سرزد ہوتے ہیں، مثلاً وہ اعمال جو امر بالمعروف، نہی از منکر یا کسی نصیحت کے زیر اثر سرزد ہوتے۔ البتہ ان اعمال کا تناسب اخلاقی اعمال کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے اور لوگوں کے اعمال کی اصلاح کے لیے اخلاقی بنیادوں کی اصلاح کرنا ہوگی، اس لیے کہ زیادہ تر اعمال کی بنیاد اخلاقی صفات ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے الٰہی اور اسلامی معاشرے کے مصلحین کی زیادہ تر کوشش یہی رہی ہے کہ صحیح تربیت کے ذریعے معاشرے کے افراد میں اخلاقی فضائل کو پروان چڑھائیں اور رذائل اخلاق کو کم سے کم حد تک لے جائیں تاکہ اس طریقہ سے لوگوں کے اعمال کی اصلاح کی جاسکے۔ قرآن شریف میں تزکیۂ نفس کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے، وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جس طرح اخلاق ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی طرح ایک عمل کو بار بار انجام دینے سے اس کا اثر انسان کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عمل کو جس قدر دہرایا جائے، اسی قدر روح پر اس کا اثر بھی گہرا ہوگا اور بتدریج وہ عمل ایک پختہ عادت میں تبدیل ہوجائے گا۔ مزید تکرار سے یہ عمل عادت سے گزر کر ایک ''حالت'' اور ''ملکہ'' میں تبدیل ہوجاتا ہے اور انسان کی ایک اخلاقی صفت بن جاتا ہے۔

اس طرح عمل اور اخلاق ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے۔ اس حقیقت کا قرآن مجید اور احادیث میں وسیع پیمانے پر ذکر ملتا ہے۔

اہل جہنم کی بعض خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٤

''ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔'' (مطففین: ۱۴)

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برے اعمال زنگ کی طرح دل پر اثر کرتے ہیں اور اس کے فطری نور اور پاکیزگی کو برطرف کر کے اسے تاریک کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٨١

''جو کوئی برائی کا مرتکب ہوا اور اس کی خطا اس کے وجود پر مکمل طور پر چھا جائے، وہ جہنمی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (بقرہ: ۸۱)

انسان کے وجود پر گناہ کے مکمل طور پر چھا جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اثر انسان کی روح پر اس قدر زیادہ ہو جائے کہ اسے تاریک کر دے اور اسے گناہ کے رنگ میں رنگ دے۔ جب انسان کی یہ حالت ہو جائے تو کوئی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ گویا انسان کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے۔ بار بار گناہ کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف انسان کی اخلاقی صفات بلکہ اس کے عقائد و نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔

جیسا کہ کفر پر اڑے رہنے والے افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧

''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔'' (بقرہ: ۷)

ظاہری بات ہے کہ اللہ کسی سے عداوت اور کینہ نہیں رکھتا کہ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے۔ درحقیقت یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو حجاب اور پردوں کی صورت میں انسان کے حواس کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان کو حقیقت کے ادراک سے روک دیتا ہے۔ (ایسے امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر سبب اور مسبب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس کی ذات ہی مسبب الاسباب ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ برے اعمال انسان کے عقیدہ کو بھی تباہ کر دیتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا

یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

''جن لوگوں نے برے اعمال انجام دیئے، آخر ان کا حال یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔'' (روم:۱۰)

ان الفاظ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اگر انسان مسلسل برے کام کرتا رہے تو اس کا اثر انسان کی روح میں بہت گہرائی تک ہوتا ہے اور نہ صرف اس کے اخلاق بلکہ اس کے عقائد کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

قرآن شریف میں تو یہاں تک بیان ہوا ہے کہ برے اعمال کی مسلسل انجام دہی سے انسان کی اچھائی اور برائی کی پہچان کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ نیکی اسے بدی نظر آنے لگتی ہے اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

''کہہ دیجئے کہ آیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جن کی کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک گئیں (اور انہوں نے سارا الٰہی سرمایہ برباد کر دیا) اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' (کہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

ایک اور مقام پر مسلسل جھوٹ بولنے اور اللہ سے وعدہ خلافی کو نفاق کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

''ان کے عمل نے ان کے دلوں میں ایسا نفاق پیدا کر دیا جو اس دن تک ان کے ساتھ رہے گا جب وہ اللہ سے ملاقات کریں گے، ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔'' (توبہ: ۷۷)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ ''یکذبون'' استعمال ہوا ہے جو استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے اور نفاق کی پیدائش میں اس عمل کی تاثیر کو بیان کرتا ہے، اس لئے جھوٹ بولنا اور اسے سچ ظاہر کرنا انسان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس حالت کے مستقل ہو جانے کا نام نفاق ہے۔

اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں

یہ حقیقت کہ انسان کے اچھے اور برے اعمال اس کی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اچھی بری صفات کی تشکیل کرتے ہیں،

احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر بیان ہوئی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كان ابي يقول ما من شي افسد للقلب من خطيئة. ان القلب ليواقع الخطيئة فما تزال به حتى تغلب عليه فيصير اعلاه اسفله

”میرے والد (حضرت امام محمد باقر علیہ السلام) فرماتے تھے کہ گناہ سے بڑھ کر کوئی چیز انسان کے دل کو تباہ نہیں کرتی۔ گناہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل الٹ جاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ نیچے ہو جاتا ہے۔“ (اصول کافی، ۲:۲۶۸)

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا اذنب الرجل خرج في قلبه نكتة سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت، حتى تغلب على قلبه. فلا يفلح بعدها ابدا

”جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے۔ اگر وہ مزید گناہ کرتا رہے تو یہ نقطہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔“ (اصولِ کافی، ۲:۲۷۱)

اسی بنیاد پر احادیث میں گناہ پر اصرار کرنے کے بارے میں بہت تنبیہ کی گئی ہے، یہاں تک کہ گناہِ صغیرہ پر اصرار کو بھی گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ (بحار الانوار، ۱۰:۳۵۹)

حلال و حرام اور فرائض و سنن کے بارے میں مامون کے ایک سوال کے جواب میں حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گناہ صغیرہ پر اصرار کرنا اسے گناہِ کبیرہ میں بدل دیتا ہے۔ (بحار الانوار، ۱۰:۳۶۶)

۳۔ کتاب ”الخصال“ میں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اربع خصال يمتن القلب: الذنب على الذنب.........

”چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں: گناہ پر گناہ کرتے چلے جانا............“ (خصال، ۱:۲۵۲)

دار المنثور، جلد ۶ صفحہ ۳۲۶ پر بھی ایسی ہی احادیث مندرج ہیں۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عمل کا تکرار یقینی طور پر انسان کے دل اور جان پر اثر انداز ہوتا ہے اور بری صفات کی تشکیل کا سبب بنتا ہے۔ اسی لئے تاکید کی گئی ہے کہ جب بھی مومن سے گناہ سرزد ہو تو اسے چاہئے کہ فوراً توبہ کے پانی سے اپنے قلب کو دھوئے اور گناہ کے منفی اثرات کو مٹا دے تا کہ گناہ اس کی مستقل باطنی کیفیت نہ بن جائے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ

حکم دیا گیا ہے کہ معصومین علیہم السلام کی نورانی احادیث سے دلوں کے زنگ کو برطرف کیا جائے ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ:

ان القلوب لترین کما یرین السیف وجلائہ الحدیث (نور الثقلین، ۵:۵۲۳)

''لوگوں کے دل زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسے تلوار زنگ آلود ہوجاتی ہے، اس کی چمک حدیث ہے۔''

۳۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق

ایک اور اہم مسئلہ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ آیا اخلاقی مسائل دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص بالکل تنہا زندگی بسر کر رہا ہو تو اس کے لیے اخلاق ایک بے معنی چیز ہوگی؟ یا یہ کہ بعض اخلاقی مفاہیم اکیلے انسان پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی مسائل کا بڑا حصہ دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں تشکیل پاتا ہے، آیا اس لحاظ سے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم آپ کی توجہ اس بحث کی طرف مبذول کراتے ہیں جو ''زندگی در پرتو اخلاق'' میں آئی ہے:

''بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ تمام اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کے دوسروں کے ساتھ معاشرتی رابطوں کے ساتھ ہے۔ اگر معاشرہ موجود نہ ہو اور ہر شخص تنہا اور دوسروں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہو اور کسی کو دوسرے کی خبر تک نہ ہو تو ایسی صورت میں اخلاق کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

اس لئے کہ رشک، حسد، تواضع، تکبر، حسن ظن، عدالت، ظلم، عفت، سخاوت اور ان جیسی صفات صرف معاشرے میں انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ اور تعلق کی صورت میں ہی کوئی مفہوم رکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا معاشرے کے بغیر انسان اخلاق کے بغیر انسان ہوگا۔

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ بہت سے فضائل و رذائل اخلاقی کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے لیکن یہ کوئی عام قانون نہیں ہے۔ بہت سے اخلاقی مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق صرف انفرادی زندگی سے ہے اور وہ ایک اکیلے انسان پر بھی مکمل طور پر صادق آتے ہیں، مثلاً مسائل اور مشکلات پر صبر یا جزع، حوادث کے مقابل شجاعت یا بزدلی، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سستی یا استقامت، خالق کائنات کے بارے میں توجہ یا غفلت، اس کی وسیع و بے انتہا نعمتوں پر شکرگزاری یا ناشکری اور اس قسم کے بعض دیگر امور ایسے ہیں جنہیں علمائے اخلاق نے کتب اخلاق میں زیر بحث قرار دیا ہے اور انہیں فضائل و رذائل اخلاقی میں شمار کیا ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو انفرادی بھی ہوسکتے ہیں اور اگر کوئی انسان معاشرے سے الگ تھلگ بھی ہو تو یہ اس پر صادق آسکتے ہیں۔ یہاں سے اخلاق کی انفرادی اخلاق اور اجتماعی اخلاق میں تقسیم کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ علم اخلاق میں اجتماعی اخلاق کی حیثیت زیادہ وزنی ہے اور انسان کی شخصیت کا زیادہ تر دارومدار اسی پر ہے۔ اگرچہ انفرادی اخلاق بھی انسان کی شخصیت کی تشکیل

میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔[1]

ظاہری بات ہے کہ اخلاق کی اس تقسیم سے اخلاقی مسائل کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ البتہ اس سے گروہ بندی کے لحاظ سے اخلاقی مباحث کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس بحث پر وقت صرف کرنا کہ کون سی اخلاقی صفات صرف انفرادی پہلو رکھتی ہیں اور کون سی اخلاقی صفات صرف اجتماعی پہلو رکھتی ہیں، مفید معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اس سلسلہ میں مذکورہ بالا کلی اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انفرادی اخلاق بھی معاشرتی مسائل پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔

[1] زندگی در پرتو اخلاق، صفحہ 29 تا 31

چوتھاباب

اخلاقی بنیادیں

اگر اخلاق کوایک بڑے پھلدار درخت سے تشبیہ دی جائے تو اخلاقی سہاروں کو باغبان اور پانی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اگر باغبان یا پانی نہ ہوتو درخت خشک ہوجائے گا یا مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجائے گا جن کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہو جائے گی یااس کے پھل میں کمی ہوجائے گی۔

علمائے اخلاق اورفلاسفہ نے اخلاق کے لیے جن سہاروں کا ذکر کیا ہے، وہ مختلف اقسام کے ہیں۔درحقیقت ان کا تعلق ان کی جہاں بینی (نظریۂ کائنات) سے ہے۔ہم یہاں ان میں سے چند اہم نمونوں کی طرف اشارہ کریں گے:

ا۔منفعت طلبی کی بنیاد

ایک گروہ صرف اس لئے اخلاقی مسائل پر تاکید کرتا ہے کہ مادی مفادات کا اس کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک معاشی ادارہ امانت اور سچائی کے اصولوں پر اچھی طرح کاربند رہے تو وہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ اپنی طرف جذب کرسکتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے بھاری منافع حاصل ہوگا۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد مختلف حالات میں مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں،مثلاً جب وہ بنک میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کے سرمایہ کے ساتھ سروکار رکھتے ہیں تو بہت ایمانداری برتتے ہیں تاکہ اپنے بنک یا ادارہ کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں۔لیکن جیسے ہی اپنے ادارہ سے باہر آتے ہیں تو ممکن ہے کہ ایک خائن انسان بن جائیں۔اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اب ان کا منافع خیانت سے وابستہ ہو۔

اس کی ایک اور مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے ایک تاجر یا دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ بہت محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہوتا کہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ گاہک اپنی طرف کھینچ سکے لیکن ممکن ہے کہ یہی شخص اپنے گھر میں بیوی بچوں سے اور ہمسایوں سے بدزبانی اور بداخلاقی سے پیش آتا ہو۔

یہ اخلاق جس کی بنیاد منفعت طلبی ہے، اس کا سب سے بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ یہ اخلاق کے لیے کسی اصل اور بنیادی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر ہر وقت اور ہر لحظہ مفاد اور منفعت کی طلب میں گامزن رہتا ہے،خواہ یہ فائدہ اور منفعت اخلاق میں ہو یا خلافِ اخلاق میں۔

بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کا مقصد ذاتی فوائد و منافع نہیں بلکہ معاشرتی مفاد اور اجتماعی مصالح

ہونا چاہئے، اس لیے کہ اگر انسانی معاشرے میں اخلاقی بنیادیں متزلزل ہو جائیں تو دنیا ایک ایسے جہنم میں تبدیل ہو جائے گی جہاں سب عذاب میں ہوں گے اور وہ تمام مادی وسائل جو زندگی کو بہتر بنانے میں کام آ سکتے ہیں، اس جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

اس گروہ کا طرزِ فکر اگرچہ نسبتاً بہتر ہے لیکن جس اخلاق کی بات یہ گروہ کرتا ہے، اس کا مقصد بھی حصولِ منفعت ہے۔ یہ گروہ بھی اخلاقی فضائل کے لیے ذاتی قدر و قیمت کا قائل نہیں ہے۔

وہ مادہ پرست لوگ جو کسی وحی و نبوت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے پاس اس طرزِ تفکر کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ لوگ اخلاق کو آسمان کی بلندی سے زمین کی سطح پر لے آتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ رفاہ اور آسائش کے حصول کا ذریعہ قرار دینے لگتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسانی معاشرے پر اخلاق کے مثبت مادی نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں اور ہم گزشتہ صفحات میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن بحث اس نکتہ پر ہے کہ آیا اخلاق کی بنیاد صرف یہی ہے یا یہ کہ ان نتائج کو علم اخلاق کے ذیلی فوائد اور برکات قرار دیا جائے۔

بہرحال اخلاق کے بارے میں منفعت پرستی پر مبنی نظریہ ایک طرف سے اخلاق کی بنیادی اہمیت کو مخدوش کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اخلاق اور مفاد میں تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہو جائے، وہاں یہ نظریہ اخلاق کو چھوڑ کر مفاد کی راہ پر چل نکلتا ہے۔

۲۔ عقلی بنیاد

وہ مفکرین جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عقل ہر چیز پر حاکم ہے اور تمام امور میں عقل کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے اخلاق کے بنیاد بھی اسی پر ہے کہ عقل نیک و بد کو پہچانتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل اس حقیقت کو بخوبی سمجھتی ہے کہ شجاعت فضیلت اور بزدلی رذیلت ہے۔ امانت وصداقت کمال ہیں اور خیانت اور جھوٹ نقص اور عیب ہیں۔ یہی عقلی ادراک ہمیں فضائل اخلاقی کے حصول اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی طرف راغب کرتا ہے۔

بعض لوگ انسانی ضمیر کو اخلاق کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ضمیر جس کا دوسرا نام عقل عملی ہے، انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل نظری کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے لیکن ضمیر کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا اور یہی انسانیت کا حقیقی رہنما ہوسکتا ہے۔

لہٰذا انسانی ضمیر کا یہ حکم کہ امانت، صداقت، ایثار، سخاوت اور شجاعت اچھی خصوصیات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات کے حصول کے لیے متحرک ہو جائیں۔ اسی طرح انسانی ضمیر کا یہ فیصلہ کہ بخل و خود پسندی ناپسندیدہ صفات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات سے دوری اختیار کریں۔

اس طرح عقل اور ضمیر ایک ہی نکتہ پر متفق ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ اخلاق کی یہ بنیاد مبنی بر حقیقت ہے اور بذاتِ خود اس قابل ہے کہ تربیت نفس اور حصولِ فضائل اخلاقی کی محرک ہو سکے۔ لیکن جیسا کہ یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہے کہ ضمیر کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور برے کاموں کو بار بار انجام دینے کے نتیجہ میں ضمیر بے اثر ہو جاتا ہے اور کبھی تو ضمیر مردہ ہو کر بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی سمجھنے لگتا ہے، اس کے علاوہ انسانی ضمیر اپنے تمام تر تقدس کے باوجود بعض اوقات خطا کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے، لہٰذا ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف عقل اور ضمیر پر بھروسہ کرتے ہوئے دیگر عوامل سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی مضبوط اور ناقابل فریب بنیادوں کو تلاش کیا جائے جو نہ تو غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں بے اثر ہوں اور نہ ہی ان کی ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔

۳۔شخصیت کی بنیاد

بعض لوگ اس لئے اخلاقی مسائل کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں اخلاقی خصوصیات انسان کی شخصیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے بقول چونکہ انسان اچھی شخصیت کا خواہش مند ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ دیکھتا ہے کہ صداقت اور امانت سے شخصیت بنتی ہے تو وہ ان صفات کو اپنانے لگتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ بہادر، سخی، وفادار اور مہربان افراد کے لیے عزت و احترام کا قائل ہے تو وہ ان صفات کا طالب نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس جب وہ دیکھتا ہے کہ بزدل، بخیل، کم ہمت، خائن اور بے وفا افراد کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے تو وہ ان صفات سے دور ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کی بازگشت بھی عقل اور ضمیر کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں انفرادی ضمیر کی بجائے اجتماعی ضمیر کارفرما ہے۔ یعنی جو چیز اجتماعی ضمیر کی رو سے صحیح ہے، وہ فضیلت ہے اور جو چیز اجتماعی ضمیر کے خلاف ہو، وہ رذائل اخلاقی میں شمار ہوگی۔ معاشرے کا یہی اجتماعی فیصلہ انسان کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور اسے بدی سے روکتا ہے۔

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعی ضمیر اخلاقی اقدار کے لیے ایک موثر محرک ہو سکتا ہے لیکن جن نقائص کی طرف ہم نے انفرادی ضمیر کے ضمن میں اشارہ کیا تھا، وہ سب یہاں بھی صادق آتے ہیں۔

اجتماعی ضمیر بھی خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اگر حکومتوں کی طرف سے وسیع سطح پر پروپیگنڈا کیا جائے تو ممکن ہے کہ اجتماعی ضمیر نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی جاننے لگے۔ تاریخ میں اس کے نمونے بکثرت موجود ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں لڑکیوں کو قتل کرنا، حتیٰ کہ انہیں زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی بعض ترقی یافتہ معاشروں میں طاقت اور وسائل پر قابض حلقے اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کر کے اجتماعی ضمیر کو دھوکہ دیتے ہیں اور غیر اخلاقی چیزوں کو اخلاقی اقدار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ انسان کا ضمیر رحمت الٰہی کی ایک تجلی ہے اور انسان کے اندر اللہ کی عظیم

انسانی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، مگر اس کے باوجود وہ معصوم نہیں ہے اور بعض اوقات خطا کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اطمینان بخش اور معصوم ذریعہ اس کی اصلاح نہ کرے تو ممکن ہے کہ سالہا سال تک وہ اپنی غلط روش پر چلتا رہے۔

۴۔ الٰہی بنیاد

اگر چہ مذکورہ بالا اخلاقی بنیادوں میں سے ہر ایک اخلاقی مسائل کی طرف بڑھنے کے سلسلہ میں ایک کردار ادا کرتی ہے لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کجی اور انحراف بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ منفعت طلبی کی بنیاد، جو ہر حال میں اپنے راستے پر چلتی ہے اور کبھی اخلاقی مسائل میں سے گزر کرتی ہے اور بعض اوقات ان سے الگ ہو جاتی ہے۔

بعض دیگر بنیادوں میں اگر چہ یہ صورتحال نہیں ہے مگر ان کی قوت اور تاثیر یقیناً محدود ہے۔ ان میں نقائص پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی بنیاد اور محرک موثر ہونے کے ساتھ ساتھ نقائص سے بھی پاک ہو اور اس میں غلطی کا امکان بھی نہ ہو تو وہ صرف الٰہی بنیاد اور الٰہی محرک ہو سکتا ہے جو وحی کی بنیاد پر قائم اور استوار ہوتا ہے۔

یہاں اخلاقی فضائل کسی منفعت طلبی اور معاشرتی رفاہ کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوتے۔ (اگر چہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ اخلاق امن وسکون، انفرادی ومعاشرتی رفاہ اور مادی فوائد کا بھی ضامن ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بنیادی اہمیت معنوی محرک کی ہوتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ جو کمالِ مطلق اور مطلق کمال ہے اور تمام صفاتِ جمال وجلال کی جامع ہے، اخلاق کا مرکز ومحور ہوتی ہے۔ ہر انسان کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس کمالِ مطلق کے نزدیک کرے۔ اس کے اسماء وصفات کے پرتو کو اپنی ذات کے اندر پیدا کرے اور روز بروز اس کے قریب تر ہوتا جائے۔ اس راہ پر چلنے والا انسان کسی حد کو قبول اور تسلیم نہیں کرتا بلکہ لامحدود کمال کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اس کا باطن کمالِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کے انوار سے اس کا باطن منور ہو جاتا ہے اور وہ ہر لحظہ فضیلت وکمال کے اعلیٰ ترین درجات کا طالب ہوتا ہے۔ مادی مفادات اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اخلاقی فضائل کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی اس تگ ودو کا محرک صرف اخلاقی ضمیر نہیں ہوتا بلکہ وہ ان سب سے بالاتر اور عظیم تر محرک کی بنیاد پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔

وہ عقل اور ضمیر کی بجائے وحی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو کر اس راہ میں گامزن رہتا ہے۔

قرآن مجید واضح طور پر اخلاقی اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور بہت سی آیات میں عمل صالح کا ذکر ایمان کے بعد اور شجرۂ ایمان کے ثمر کے طور پر آیا ہے۔

قرآن مجید ایمان کو ایک ثابت اور پائیدار درخت سے تشبیہ دیتا ہے جس کی جڑیں بہت مضبوط اور انسان کے قلب و جان میں بہت گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔ اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک انتہائی خوبصورت اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی جس کی جڑیں پائیدار اور شاخیں آسمان میں ہیں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔'' (ابراہیم: ۲۴، ۲۵)

ظاہری بات ہے کہ جس درخت کی جڑیں انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اور اس کی شاخیں انسان کے سارے وجود اور تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہوں، وہ ایسا پھلدار درخت ہوگا جس پر کوئی خزاں نہیں آ سکتی اور نہ ہی کوئی طوفان اسے اکھیڑ سکتا ہے۔

سورۂ والعصر میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے۔ اس صورت میں تمام انسانوں کو خسارے اور نقصان میں بتایا گیا ہے اور صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو سب سے پہلے ایمان رکھتے ہیں، پھر عمل صالح کرتے ہیں، حق کی حفاظت کرتے ہیں اور صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہیں۔

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

یہ بات ایک اور دلچسپ انداز میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

''اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتے تو تم میں سے کوئی بھی تزکیہ نہ کر سکتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے (اور قابل سمجھتا ہے) اس کا تزکیہ کرتا ہے۔'' (نور: ۲۱)

بنابراین انسان کے اخلاق و عمل کی پاکیزگی اور مکمل تزکیہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی بات سورہ اعلیٰ میں ان الفاظ میں بیان کی گئی:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

''یقیناوہ شخص فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کیا، اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز ادا کی۔'' (اعلیٰ: ۱۴، ۱۵)

ان آیات کے مطابق اخلاق و عمل کا تزکیہ اللہ کے ذکر اور نماز سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اگر تزکیہ کا عمل ذکر خدا اور نماز سے

سیراب ہوتا رہے تو وہ پائیدار رہتا ہے اور اگر کسی اور بنیاد پر استوار ہو تو سست اور کمزور ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر تقویٰ اور اخلاقی عمل کے ایمان کے ساتھ مضبوط تعلق کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے:

لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اَحۡسَنُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۹۳﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے، ان پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے کھایا، اگر وہ تقویٰ اختیار کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔ پھر تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں، پھر تقویٰ اختیار کریں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''(مائدہ:۹۳)

اس آیت میں کبھی تقویٰ کو ایمان اور عمل صالح پر مقدم رکھا گیا اور کبھی ان کے بعد اور کبھی نیکی پر مقدم رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے جہاں اخلاقی اور عملی تقویٰ ایمان سے پہلے ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ قبولیت ایمان کی آمادگی اور جستجوئے ایمان کی ذمہ داری کے احساس کا دوسرا نام ہے۔

اس کے بعد جب انسان حق کو پہچان کر اس پر ایمان لے آتا ہے تو تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ اس کے وجود پر سایہ فگن ہو جاتا ہے اور مختلف اقسام کی نیکیوں کے انجام دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ایمان اور تقویٰ کے درمیان بہت قریبی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاص کی مضبوط ترین اور اعلیٰ ترین بنیاد اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بارگاہ میں احساس ذمہ داری ہے۔ ایمان جو مادی مسائل سے بہت بالاتر ہے اور اس کا کسی بھی چیز سے مبادلہ نہیں کیا جا سکتا، ہر وقت اور ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوتا، ہر چیز اس کے مقابلہ میں ناچیز اور حقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ جس میں قربانی و ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں نظر آتی ہیں، اولیاء اللہ کی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نیز یہی وجہ ہے کہ مادی معاشروں میں جہاں ہر چیز کو مادی اور ذاتی منفعت کی بنیاد پر پرکھا جاتا ہے، اخلاقی مسائل بہت کمزور دکھائی دیتے ہیں اور زیادہ تر وہیں نظر آتے ہیں جہاں مفادات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ خوش اخلاقی، ادب، ایمانداری، وفا، سخاوت اور دیگر تمام اخلاقی اقدار صرف اس وقت تک محترم ہوتی ہیں جب وہ مادی مفادات کے حصول میں مفید ثابت ہوں۔ جہاں مادی مفادات خطرے میں پڑ جائیں، وہاں یہ اخلاقی اقدار بھی غیر موثر ہو جاتی ہیں۔

ماں باپ جو بڑھاپے میں مفید نہیں رہتے، فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ انہیں بوڑھوں کے ہوسٹل میں داخل کر کے ان کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔

بچے جیسے ہی کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں، گھر سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ معاشی لحاظ سے خودکفیل ہوجائیں بلکہ اس لئے کہ ہمیشہ کے لیے فراموش ہوجائیں۔

شریک حیات سے محبت بھی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب وہ مادی فائدہ اور لذت پہنچانے کے قابل ہو، ورنہ وہ بھی فراموش کردی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان ممالک میں طلاق کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے۔

مادی مکاتب فکر، جہاں اخلاق کی کوئی الٰہی بنیاد نہیں ہوتی، وہاں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے شوقِ شہادت ایک بے معنی چیز ہوتی ہے۔ ان معاشروں میں ایک حد سے زیادہ سخاوت کو دیوانگی سمجھا جاتا ہے۔ عفت اور پاکدامنی کو نا اہلی، زہد اور دنیوی لذتوں سے بے رغبتی کو سادہ لوحی قرار دیا جاتا ہے۔

ان ممالک سے رونما ہونے والی طاقتیں اور ان کے حکمرانوں کی زندگی اس اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک کا انسانی حقوق کے معاملے میں دوہرا معیار کس قدر وحشت انگیز ہے، جہاں انسانی حقوق ان کے مفادات کے لیے ذرا بھی نقصان دہ ہوں، وہ انہیں مکمل طور پر نظرانداز کردیتے ہیں اور اس اعلیٰ اخلاقی حقیقت کو اپنے مفادات پر قربان کردیتے ہیں۔

خطرناک ترین اور انسانی حقوق کے خلاف بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد یہاں پر پسندیدہ اور ہردلعزیز نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس پاکیزہ سیرت وکردار کے افراد جو حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے میدان عمل میں اتر آتے ہیں لیکن ان کے کچھ مادی مفادات کے لیے خطرناک ہوتے ہیں، وہ انہیں ایسے شیاطین قرار دینے لگتے ہیں جنہیں ہر لحاظ سے کچلنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایک ہی وقت میں دنیا کے ایک حصہ میں جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے زبردست حامی نظر آتے ہیں تو دنیا کے کسی اور حصہ میں بدترین آمریت کی حمایت کررہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک بنیادی اہمیت ان کے اپنے مادی مفادات کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اخلاق کی کوئی واضح بنیاد نہیں ہوتی۔

یہاں پر ایک نکتہ بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ مادی مفادات کو سب کچھ سمجھنے والے یہ افراد صرف اپنے زمان ومکان پر نظر رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ گزشتہ لوگوں نے کیا کیا اور آنے والے لوگ کیا کریں گے۔ ہاں! اگر ان باتوں کا کسی حد تک ان کی موجودہ زندگی سے کوئی تعلق ہو تو اس حد تک وہ اسے اہمیت بھی دیتے ہیں، ورنہ ان کی منطق یہ ہوتی ہے کہ جب ہم نہ ہوں گے تو دنیا کو سیلاب بہالے جائے یا باقی رہے، ہمیں اس سے کیا سروکار!

لیکن جو خدا پرست ہوتے ہیں، وہ حیات بعدازموت کے عقیدہ کی بنیاد پر اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عدل میں حاضری کے احساس کی وجہ سے اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی نیکی دنیا میں چھوڑ جائیں گے جو ضرورت مند انسانوں کے کام آتی رہے گی تو اس کی برکتیں اگلے جہان میں بھی انہیں ملتی رہیں گی۔ اس طرح ایسے افراد صرف اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال کے بعد بھی انسانوں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ:

اذا مات المؤمن انقطع عمله الا من ثلاث: صدقة جارية، اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوله

''جب مومن مر جاتا ہے تو اس کا عمل رک جاتا ہے، سوائے ان تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، وہ علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔''

(بحارالانوار، ۲۲:۲)

اس طرح آخرت پر ایمان صدقۂ جاریہ، مفید علمی خدمات اور نیک اولاد کی تربیت جیسے عظیم اخلاقی کاموں کا سبب بنتا ہے جبکہ مادہ پرستوں کے یہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب ''فلسفۂ اخلاق'' میں خود پسندی کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

ذاتی خود پسندی، خاندانی خود پسندی اور قومی خود پسندی۔ اس کے بعد وہ ان تینوں کو اخلاق کے خلاف قرار دے کر مشہور فرانسیسی مفکر گوسٹاولوبون کی کتاب ''تمدنِ اسلام عرب'' سے اس کے ایک بیان کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر یہاں پر مفید معلوم ہوتا ہے:

گوسٹاولوبون اس بارے میں کہ اہل مشرق مغربی ثقافت کا اس طرح استقبال کیوں نہیں کرتے جیسے انہیں کرنا چاہیے، چند وجوہات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ہمارے طرزِ زندگی سے مختلف ہے۔ ان کی زندگی سادہ ہے جبکہ ہم نے اپنی زندگی کی مصنوعی ضروریات بنا رکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل مغرب نے ان کے بارے میں جو ظالمانہ رویہ اختیار کیا، وہ اس سلسلہ کا سب سے اہم سبب ہے۔

اس کے بعد وہ ان مظالم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہل مغرب نے امریکہ، چین اور ہندوستان میں کئے۔ اس سلسلہ میں وہ خاص طور پر ''افیون کی جنگ'' کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے مراد انگریزوں کی وہ چال ہے کہ انہوں نے چینیوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے انہیں افیون کا عادی بنا دیا تاکہ ان کی مزاحمت کو توڑا جا سکے۔ چینی ان کی اس چال کو سمجھ گئے اور مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ آخر کار انگریز توپ اور بندوق کے ذریعے ان پر مسلط ہو گئے اور افیون کو ان میں رواج دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں چین میں سالانہ چھ لاکھ افراد افیون کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔

جب اخلاق کی بنیاد ایمان اور معنوی اقدار پر نہ رکھی جائے تو جہاں اخلاق اور مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوگا، وہاں اخلاق پسپا ہو جائے گا۔

اہم نکتہ

جو کچھ ہم نے اس بارے میں کہا کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان، اخلاق کی مضبوط بنیاد ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اخلاقیات کو گہرائی بخشنے میں ہم "عقل فطری" کے کردار کا انکار کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا ضمیر انسان کے اندر اللہ کا نمائندہ ہے اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان کی طاقت سے بھی بہرہ مند ہو اور خود پرستی اور ہوائے نفس کی قید سے آزاد ہو۔

قرآن مجید میں بار بار اس مسئلہ پر زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٠﴾

"اور اللہ ان لوگوں پر رجس قرار دے دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" (یونس:١٠٠)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

"اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (یعنی حق بات کو سنتے ہیں نہ حق بات کہتے ہیں)۔" (انفال:٢٢)

جو لوگ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾

"اور جب تم نماز کے لیے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔" (سورہ مائدہ آیت ٥٨)

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں اخلاقیات سے متعلق قرآنی نکتہ نظر کا خلاصہ واضح ہو جاتا ہے۔

پانچواں باب

اخلاق اور آزادی

اس سوال پر بہت بحث وتمحیص ہوتی رہی ہے کہ کیا اخلاق انسان کی آزادی کو محدود کر دیتا ہے اور یہ کہ یہ محدودیت انسان کے لیے مفید ہے یا مضر؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان بحثوں کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ آزادی کے مفہوم کو درست طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ اخلاق انسان کو محدود کر دیتا ہے، لہٰذا اس کی استعداد وصلاحیت پروان نہیں چڑھ سکتی۔

۲۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق انسان کی فطری خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے تاکہ انسان حقیقی کمال تک پہنچ سکے، حالانکہ اگر یہ خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ تعالیٰ انہیں پیدا کیوں کرتا۔

۳۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق لذت پسندی کے خلاف ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا مقصد ہی حصولِ لذت ہے۔

۴۔ بعض اوقات اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر غیر آزاد ہے اور ہمیشہ جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، لہٰذا اخلاقی پند ونصیحت کی نوبت ہی نہیں آ سکتی۔

۵۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ دینی اخلاق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر رکھی جاتی ہے جو کہ بذاتِ خود خوف یا طمع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی غیر اخلاقی ہیں۔

انسان کی متضاد قسم کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو آزادی کے مفہوم کو صحیح طرح سے سمجھا گیا ہے اور نہ ہی دینی اخلاق، خصوصاً اسلامی اخلاق اور اس کی بنیادوں کے بارے میں صحیح غور وفکر کیا گیا ہے۔

اسی وجہ سے ہم سب سے پہلے آزادی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

انسان کیوں اپنے وجود کی گہرائی سے آزادی کا خواہاں ہے؟ انسان کیوں آزاد ہو؟ انسان کے جسم اور روح کی پرورش میں آزادی کا کیا کردار ہے؟ مختصر یہ کہ آزادی کا فلسفہ کیا ہے؟

ان تمام سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں اور خصوصیات پنہاں ہیں جو آزادی کے بغیر نشوونما نہیں پا سکتی ہیں۔ چونکہ انسان ان صلاحیتوں کی پرورش اور نشوونما کا خواہش مند ہے، لہٰذا وہ آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ اس لیے کہ آزادی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزادی جو ان تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ضروری ہے، ہر قسم کی قید وشرط سے آزاد

آزادی ہے یا محدود اور مشروط آزادی ہے؟

اس بات کو ایک دو مثالوں کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔

ایک باغبان کی مثال پر غور کریں جو مختلف قسم کے پھلوں اور پھولوں کی پرورش کے لیے بیج بوتا ہے اور بروقت پانی دیتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اگر یہ درخت اور پودے آزاد فضا میں نہ ہوں، انہیں سورج کی گرمی اور روشنی اور بارش سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملے، یا اس کی جڑیں کسی پتھر سے ٹکرا کر زمین کے اندر گہرائی تک نہ جا سکیں تو باغبان کو کوئی پھل یا پھول حاصل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ درخت کے پھلدار ہونے کے لیے جڑوں، تنے اور شاخوں کی آزادی ضروری ہے۔

لیکن بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ کسی درخت میں غیر ضروری شاخیں پیدا ہو جائیں یا درخت اپنے اصل راستے سے بھٹک جائے یا ٹیڑھا ہو جائے۔ ایسی صورت میں باغبان اپنا مخصوص قینچہ اٹھا کر نہایت بے رحمی سے غیر ضروری شاخوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کوئی عقلمند اس باغبان پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے درخت کی شاخوں کو کیوں آزادی سے بڑھنے نہیں دیا۔

اسی طرح وہ ٹیڑھے تنے کو ایک سیدھی اور مضبوط لکڑی سے باندھ دیتا ہے تاکہ وہ اپنی صحیح سمت کی طرف بڑھ سکے۔ یہاں بھی کوئی عقلمند اس پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے درخت کو کیوں پا زنجیر کر دیا اور کیوں اس کی آزادی کو محدود کر دیا۔ اس لیے کہ ایسے ہر اعتراض کے جواب میں باغبان یہ کہے گا کہ درخت کے پھل دینے کے لیے اس کی آزادی ضروری ہے لیکن اس مقصد سے بھٹکنے کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

انسان کے بارے میں بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس میں بھی بے پناہ غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی آزادی ہے لیکن اسے یہ آزادی ہرگز نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان صلاحیتوں کو تباہ کر دے۔

جو لوگ آزادی سے ہر قسم کی مادر پدر آزاد، آزادی مراد لیتے ہیں، انہوں نے آزادی کے معنی کو نہیں سمجھا ہے۔ آزادی کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ انسان اعلیٰ ترین مادی یا معنوی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سڑک پر چلنے میں آزاد ہے۔ لیکن اس آزادی کے یہ معنی ہرگز نہیں لیے جا سکتے کہ انسان ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرے۔ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ چوراہے پر سرخ بتی دیکھ کر رکنا اور ٹریفک کے دوسرے قوانین کی پابندی کرنا گاڑی چلانے کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو سب اس پر ہنسیں گے اور اسے کہیں گے کہ آزادی کو کسی قانون کا پابند ہونا چاہئے تاکہ انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکے، نہ یہ کہ اموال اور صلاحیتیں ضائع ہوں، جانوں کا نقصان ہو اور انسان اپنے مقصد تک نہ پہنچ پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی آزادیاں جھوٹی آزادیاں ہیں اور درحقیقت امارت اور غلامی ہیں۔ جو جوان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے منشیات کا عادی ہو جاتا ہے، درحقیقت وہ قید میں ہے۔ وہ آزادی جو اخلاقی قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو، وہی

حقیقی آزادی ہے جو انسان کو ہوائے نفس کی قید سے آزادی دلاتی ہے۔امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان کس قدر معنویت کا حامل ہے:

ان تقوی الله مفتاح سداد، و ذخیرة معاد، و عتق من کل ملکة، و نجاة من کل هلکة

''تقویٰ بند دروازہ کی چابی، آخرت کا ذخیرہ، ہر قسم کی غلامی سے آزادی اور ہر قسم کی ہلاکت سے نجات ہے۔''(نہج البلاغہ: خطبہ ۲۳۰)

مندرجہ بالا تجزیہ اور مثالوں سے حقیقی آزادی اور جھوٹی آزادی کا فرق واضح ہوجاتا ہے جس کی مدد سے آزادی جیسی مقدس حقیقت کے غلط استعمال کو روکا جاسکتا ہے۔اس سے ان لوگوں کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق فطری خواہشات کو کچل دیتا ہے اور اگر فطری خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ انہیں پیدا کیوں کرتا!

انسان کی فطری خواہشات درحقیقت بارش کے ان حیات بخش قطروں کی مانند ہیں جو آسمان سے برستے ہیں۔بلاشبہ اگر یہ غیر ضروری ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں نازل نہ کرتا۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قطروں کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اکٹھے ہوکر تباہ کن سیلاب کی شکل اختیار کرلیں۔عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے پانی کو ڈیم بنا کر روک لیا جائے اور اس الٰہی نعمت کو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے زراعت کی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جائے۔انسان کی فطری خواہشات بھی بارش کے قطروں کی مانند ہیں۔اگر انہیں کسی منصوبہ بندی کے تحت مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو وہ ایک تباہ کن سیلاب کی طرح انسان کی ہر چیز کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیں گے۔

مندرجہ بالا بحث سے بہت واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اخلاق انسان کو محدود کرتا ہے نہ اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے اور نہ ہی فطری خواہشات کو کچلتا ہے۔اخلاق کا کام یہ ہے کہ آزادی کو سعادت کی راہ میں بروئے کار لائے اور فطری خواہشات کو کمال مطلوب تک پہنچنے میں رہنمائی فراہم کرے۔

آزادی کی اس تشریح سے، جو ہمارے خیال میں آزادی کی صحیح تشریح ہے، اخلاق کے مخالفین کے بہت سے اعتراضات کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عقیدۂ جبر اور غیر اخلاقی مسائل

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ارادہ کی آزادی، ایمان اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اگر انسان کی آزادی کی نفی ہو جائے تو تمام اخلاقی مفاہیم کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ادیانِ الٰہی جو انسان کی تہذیب نفس اور اخلاقی تربیت کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، انسانی آزادی کے زبردست حامی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ان آیات سے بھرا پڑا ہے جو انسانی ارادے کی آزادی کو ثابت اور جبر کی نفی کرتی ہیں۔ اس قسم کی آیات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور جبر واختیار کے بارے میں ان پر بحث کی گئی ہے۔

بنیادی طور پر امر و نہی، نیکی اور اطاعت کی دعوت اور اللہ کی نافرمانی سے رکنے کا حکم، سزا و جزا، اللہ کی عدالت، قوانین کا نفاذ اور حدود الٰہی کا نفاذ، سب انسانی ارادے کی آزادی پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے جبر کے قائلین اپنے نظریہ کے حق میں استدلال کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات کے حقیقی اور صحیح مفہوم کو سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ آیات تفویض کی نفی کرتی ہیں مگر ان سے جبر کا اثبات نہیں ہوتا۔

عقیدۂ جبر ہر قسم کی غیر اخلاقی روش اختیار کرنے کا ایک اہم سبب ہو سکتا ہے۔ ہر گناہگار انسان اس بات کو بہانہ بنا کر کہ اس کی قسمت کا فیصلہ روزِ اول سے یہی کر دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ اس الٰہی فیصلہ کے خلاف نہیں جا سکتا، گناہ اور بدکاری کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے تاریخ میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بہت سے گناہگار انسان اسی عقیدہ کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو معذور گردانتے تھے۔ ان کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ ہم اچھے یا برے، اس میں ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، کاتب تقدیر نے روزِ اول سے ہماری تقدیر ہی ایسی بنا دی ہے۔ لہٰذا نہ نیک لوگوں کو اپنی نیکی پر فخر کرنا چاہئے اور نہ ہی برے لوگوں کو ان کی برائی پر سرزنش کی جانی چاہئے۔

اسی بنیاد پر تمام ابنیاء علیہم السلام خصوصاً رسولؐ اسلام نے اخلاقیات کی بنیادوں کی مضبوطی اور تزکیہ نفس کے لیے سب سے پہلے انسانی ارادے کی آزادی کا اثبات کیا۔

بہرحال جبر و اختیار، قضا و قدر، ہدایت و ضلالت، سعادت و شقاوت اور ان جیسے دیگر مسائل مستقل اور مفصل موضوعات ہیں۔ مستقبل میں تفسیر موضوعی کے مباحث میں ہم انہیں زیر بحث لائیں گے۔ یہاں ہمارے پیش نظر صرف اس مسئلہ کی نشاندہی کرنا اور اخلاقی مسائل پر اس کے اثرات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

جو لوگ حصولِ لذت کو ہی زندگی کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اخلاقیات کو اس کے منافی قرار دیتے ہیں[1]، وہ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ اگر ہم لذت کو صرف مادی لذت میں محدود کر دیں اور روحانی لذتوں کو نظر انداز کر دیں، تب بھی اخلاقی اصولوں کی پابندی کے بغیر مادی لذت کا حصول ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قید و شرط لذت طلبی کا نتیجہ بہت دردناک ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دردناک نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ بہت سی نقد لذتوں کو ترک کر دیا جائے۔

یہ نکتہ نظر پیش کرنے والے اگرچہ گزشتہ دور کے فلاسفہ میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کی یہ بات منشیات کے عادی اس شخص کی بات کی مانند ہے جسے یہ کہا جائے کہ تمہارا آج کا نشہ مستقبل میں تمہارے لیے بہت برے نتائج لے کر آئے گا تو وہ جواب دیتا ہے کہ موجودہ لمحہ کو غنیمت جانو، آج عیاشی کر لو، کل کس نے دیکھا ہے۔

لیکن جب قلبی، اعصابی اور دماغی امراض منشیات کے استعمال کے نتیجہ میں اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ اپنی اس منطق پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتا ہے لیکن اس وقت بدقسمتی سے عموماً واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔

عفت، امانت، صداقت اور جوانمردی جیسی اقدار کے بارے میں اخلاقی نصائح کی یہی حیثیت ہے۔ جس معاشرہ میں خیانت اور بدعنوانی عام ہو جائے، اس معاشرہ کے لوگوں کو کونسی لذت میسر آ سکتی ہے۔ بخل جیسی صفت جس معاشرہ پر حاکم ہو اور ہر شخص اپنی ذات کے لیے لذت کی جستجو کر رہا ہو، اس معاشرے کے لوگ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس معاشرہ کا ہر فرد تنہا ہوتا ہے اور مشکلات کا تنہا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرہ میں سخاوت عام ہو، وہاں اگر ایک شخص کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو سب اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی تنہا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی مشکلات کے سامنے عاجز و ناتواں ہوتا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف ہم قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام اخلاقی صفات کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک معنوی اور دوسرا مادی۔ اگر اس کے معنوی اثر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس کے مادی فوائد ہی اس قدر وسیع ہیں کہ سب لوگوں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان اخلاقی اصولوں کو اپنا لیں تاکہ یہ دنیا ایک جنت بن جائے جس میں سب لذت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اخلاقی برائیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والے جہنم سے محفوظ ہوں۔

آخر میں ان لوگوں کے نکتہ نظر کا جائزہ لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دینی اخلاق اللہ کی اطاعت پر مبنی ہے اور اللہ کی اطاعت خوف اور طمع پر مبنی ہے جو کہ بذات خود غیر اخلاقی صفات ہیں۔

اس نکتہ نظر پر دو پہلوؤں سے تنقید کی جا سکتی ہے۔

خوف اور طمع کی اصطلاح کا استعمال یہاں پر درست نہیں ہے۔ اس کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ اخروی

---

[1] اس مکتبہ فکر کا ایک معروف علمبردار آرلیسٹیپ ہے جو زمانہ قبل از مسیح میں رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خیر سے مراد لذت ہے، شر سے مراد رنج والم ہے۔ انسان کا حقیقی مقصد زندگی دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے اور انسان کو اس کے اچھے یا برے نتائج کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ (علم اخلاق یا حکمت عملی: ۲۴۳)

سعادت کے حصول اور عدل الٰہی کی میزان سے سزا سے بچنے کی خاطر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپناتے ہیں اور یہ بات ہرگز غیر اخلاقی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ فانی زندگی کی عارضی لذتوں کو ابدی زندگی پر قربان کر دیتے ہیں اور بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے سے فائدے کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص خیانت اور جھوٹ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ذلت و رسوائی سے بچنے کی خاطر ان دو برائیوں سے پرہیز کرتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اگر کوئی شخص اپنی صحت و سلامتی کے پیش نظر شراب خوری سے اجتناب کرتا ہو اور منشیات سے دور رہتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اسی طرح اگر کوئی شخص لوگوں سے ادب، تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آتا ہو تا کہ لوگ اس سے دور نہ جائیں اور وہ زندگی میں تنہا نہ رہ جائے تو کیا اسے غیر اخلاقی عمل کہا جائے گا؟

مختصر یہ کہ ہر اخلاقی عمل کے مادی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ ان فوائد کے حصول کی کوشش کو طمع کہنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں رونما ہونے والے مضر اثرات سے بچنے کو خوف اور بزدلی جیسی غیر اخلاقی صفات نہیں کہنا چاہیے۔

چھٹا باب

قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول

اس بحث کا آغاز کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم دوسرے مکاتب فکر میں اخلاق کے بنیادی اصولوں پر ایک نظر ڈالیں۔

زمانہ قدیم کے فلاسفہ کا ایک گروہ جنہیں علم اخلاق کے بانی قرار دیا جاتا ہے، اخلاق کے چار بنیادی اصولوں کے قائل تھے۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار چیزوں میں سمیٹ دیا تھا:

۱۔حکمت ۲۔عفت ۳۔شجاعت ۴۔عدالت

کبھی کبھار وہ ان میں خدا پرستی کا اضافہ بھی کر دیتے تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر اخلاق کے بنیادی اصولوں کی تعداد پانچ ہو جاتی تھی۔

اس مکتبہ فکر کا بانی سقراط کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ:

''نیکی اور اخلاق کا دارومدار نیک و بد کی پہچان (یعنی دانائی) پر ہے اور علم و دانش ''حکمت'' کے علاوہ کوئی فضیلت مطلق نہیں ہے۔ جب علم کا تعلق اس بات سے ہو کہ انسان کو کن چیزوں سے ڈرنا چاہئے اور کن چیزوں سے نہیں ڈرنا چاہیے تو اس دانائی کو ''شجاعت'' کہتے ہیں۔ جب اس کا تعلق انسان کی نفسانی خواہشات سے قائم ہو جائے تو اسے ''عفت'' کہا جاتا ہے۔ جب اس کا تعلق انسانوں پر حکم اور قوانین سے قائم ہو جائے تو اسے عدالت کہتے ہیں۔ اگر انسان کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کے حوالہ سے اس کی ذمہ داریوں پر غور کیا جائے تو یہ ''خدا پرستی'' اور ''دینداری'' ہے۔ یہ پانچ فضائل یعنی حکمت، شجاعت، عفت، عدالت اور خدا پرستی سقراط کے مکتبہ فکر میں اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔'' (سیر حکمت در اروپا، ۱۸:۱)

بہت سے مسلمان علماء جنہوں نے علم اخلاق پر کتب لکھی ہیں یا اس سلسلہ میں بحث کی ہے، نہ صرف ان چار یا پانچ اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اس میں مزید تحقیق اور موشگافی کر کے ان کی بنیاد کو اور بھی پختہ کیا ہے اور انہیں اپنی اخلاقی بحث کی بنیاد قرار دیا ہے۔

وہ اس بارے میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے نفس اور روح میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ قوۂ ادراک یعنی حقائق کو پہچاننے والی قوت۔

۲۔ قوۂ جاذبہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو حصولِ منافع کے لیے سرگرم عمل رہتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں ''شہوت'' کہا جاتا ہے۔ (البتہ اس سے مراد صرف جنسی شہوت نہیں ہے بلکہ انسان کی ہر قسم کی خواہشات اس کے زمرے میں آ جاتی ہیں)۔

۳۔ قوۂ دافعہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو نقصانات اور خطرات کو دور کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس قوت کو دوسرے الفاظ میں

''غضب'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ ان تینوں قوتوں کے اعتدال کو اخلاقی فضائل شمار کرتے ہیں جو بالترتیب حکمت، عفت اور شجاعت کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں کہ جب شہوت اور غضب قوۂ عقل کے تابع ہوں تو جو کیفیت انسان کی ہو جاتی ہے، اسے ''عدالت'' کہا جاتا ہے جو کہ چوتھا اخلاقی اصول ہے۔

بالفاظ دیگر مذکورہ بالا تینوں قوتوں میں ہر ایک کا نکتہ اعتدال پر ہونا بذاتِ خود فضیلت ہے جن کا نام حکمت، عفت اور شجاعت ہے جبکہ ان سب کا اس طرح جمع ہو جانا کہ شہوت اور غضب قوۂ ادراک کے تابع ہو جائیں تو یہ ایک اور فضیلت ہے جسے عدالت کہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی انسان میں شجاعت پائی جاتی ہے مگر اس کا مناسب موقع پر استعمال نہیں ہوتا۔(مثلاً ان کی شجاعت بیہودہ جنگوں میں استعمال ہوتی ہے)۔ایسی صورت میں شجاعت تو موجود ہوتی ہے لیکن عدالت موجود نہیں ہوتی۔لیکن اگر یہ فضیلت جسے شجاعت کہتے ہیں، کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے بروئے کار لائی جائے، یعنی یہ حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو عدالت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

اس طرح مسلم مفکرین کا یہ گروہ انسان کے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار بنیادی فضائل کے تابع قرار دیتا ہے۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی اخلاقی فضیلت ایسی نہیں ہے جو ان چار فضائل میں سے کسی ایک کی شاخ نہ ہو۔اس کے برعکس تمام اخلاقی رذائل انہی چار فضائل اخلاقی سے افراط وتفریط کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے''احیاء العلوم''، ''محجۃ البیضاء'' اور دیگر معروف کتب اخلاق کی طرف رجوع فرمائیں۔

تنقید و تحقیق

اخلاقی فضائل کو مذکورہ بالا چار بنیادی فضائل میں تقسیم کرنے کی کوئی مسلمہ اسلامی بنیاد اور اساس نظر نہیں آتی بلکہ یہ ان تحقیقات کا نتیجہ ہے جو مسلم مفکرین نے حکمائے یونان کے نظریات پر کی ہیں اور ان کے نقائص کو برطرف کرکے انہیں مکمل کیا ہے۔
اگرچہ بعض روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ایک روایت میں آتا ہے:

الفضائل اربعة اجناس: احدها الحكمة و قوا مها فی الفكرة، و الثانی العفة وقوامها فی الشهوة، و الثالث القوة و قوامها فی الغضب، و الرابع العدل و قوامه فی اعتدال قوی النفس

''فضائل کی چار اقسام ہیں، ان میں سے ایک حکمت ہے جس کی جڑیں غور وفکر میں ہیں، دوسری عفت

ہے جس کی جڑیں شہوت میں ہیں، تیسری قوت ہے جس کی جڑیں غضب میں ہیں، چوتھی عدالت ہے جس کی بنیاد تمام قوائے نفسانی کا اعتدال ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۸۱)

یہ حدیث اگرچہ علمائے اخلاق کی مذکورہ تقسیم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے مگر کافی حد تک اس کے قریب ضرور ہے۔ لیکن یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند ضعف سے خالی نہیں ہے۔

بہرحال علمائے اخلاق نے فضائل کو جس طرح مندرجہ بالا چار فضائل میں تقسیم کیا ہے، اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ بعض عادات کو جو یقیناً فضائل اخلاقی کا حصہ ہیں، کو مندرجہ بالا چار اخلاقی فضائل کے ذیل میں قرار دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حسن ظن ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی ضد بدگمانی اور سوء ظن ہے۔ اگر اس کو مندرجہ بالا چار فضائل میں سے کسی ایک کے تحت قرار دینا چاہیں تو اسے حکمت کے ذیل میں رکھا جائے گا جبکہ حسن ظن کو کسی بھی طور پر حکمت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن ظن اور چیزوں کی صحیح شناخت دو الگ چیزیں ہیں بلکہ کبھی تو ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ بعض اوقات ظنی قرائن اس بات کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں گناہ یا جرم کیا ہے مگر انسان حسن ظن کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسی طرح مصائب پر صبر اور نعمتوں پر شکر فضائل اخلاق میں شمار ہوتے ہیں، حالانکہ نہ تو انہیں قوۂ ادراک کے تحت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ قوۂ شہوت وغضب کے تحت۔ خاص طور پر اگر صابر و شاکر شخص ان صفات کے کسی فائدے کی بجائے خود انہی کو فضیلت سمجھتے ہوئے انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

اسی طرح اور بھی بہت سی صفات ہو سکتی ہیں جو فضائل کے زمرے میں آتی ہیں مگر انہیں مندرجہ بالا چار میں سے کسی ایک فضیلت کے تحت درج کرنا بہت مشکل ہے۔

۲۔ مذکورہ تقسیم میں حکمت کو بنیادی اخلاقی فضائل میں شمار کیا گیا ہے اور اس کے معاملہ میں افراط وتفریط کو رذائل میں شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکمت حقائق کی شناخت کا فرض انجام دیتی ہے جبکہ اخلاق کا تعلق جذبات، جبلت اور ملکات نفس سے ہے، نہ کہ عقلی ادراک سے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی سوچ رکھنے والے افراد کو خوش اخلاق نہیں کہا جا سکتا۔

اخلاق عقل کے لیے ایک ہتھیار تو ہو سکتا ہے لیکن عقل اور ''اچھائی کی پہچان'' کو اخلاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر عقل اور قوۂ ادراک انسانی جبلت اور جذبات کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کو مناسب شکل وصورت دیتے ہیں جبکہ اخلاق ان کیفیات کا نام ہے جو ان فطری خواہشات اور جذبات کے اوپر عارض ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ بات اگرچہ عام طور پر صحیح مانی جا سکتی ہے مگر اس کے باوجود ایسی چیزیں بھی نظر آتی ہیں جن میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قوۂ عقلیہ جس قدر زیادہ ہو، بہتر ہے اور اس میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ بعض

لوگ جو ''جربزہ'' کو قوۂ عقلیہ کے افراط کا نام دیتے ہیں، ان کا اندازِ فکر صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''جربزہ'' عقل و ذہانت کی کثرت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک انحراف اور کج روی ہے جو مسائل کے فیصلہ میں جلد بازی کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے۔ (جربزہ سے مراد انسان کی وہ ذہنی اور عقلی کیفیت ہے جس کی مدد سے وہ حق کو باطل اور باطل کو حق، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے جس طرح عدالتوں میں بعض تیز اور ذہین وکیل کیا کرتے ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقل اور فکر کی بلندی میں اس مقام پر تھے کہ آپ کو ''عقلِ کل'' کہا جاتا ہے۔ کیا یہ خلاف فضیلت ہے؟

یہ بات بجا ہے کہ بعض اوقات زیادہ عقل اور ذہانت مشکلات اور تکالیف کا سبب بن جاتی ہے جبکہ غافل اور نادان افراد ان سے محفوظ رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا شمار فضائل میں ہوتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ تقسیم کے قائلین نے ''عدالت'' کو فضیلت اور اس کے افراط و تفریط کو ظلم کرنے اور ظلم برداشت کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ ظلم کرنا یا ظلم برداشت کرنا کسی بھی لحاظ سے ''عدالت'' میں افراط و تفریط نہیں ہیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضائل کو رذائل کے افراط و تفریط کے مقابل حد اعتدال سے تعبیر کرنا اگرچہ غالباً صحیح ہے لیکن اسے ایک کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اخلاقی مباحث میں اسے کوئی بنیادی مقام دیا جا سکتا ہے۔

نتیجہ

علمائے قدیم نے جن چار چیزوں کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے، وہ درحقیقت فلاسفۂ یونان کے طرزِ فکر کی تکمیل ہے۔ اسے اخلاقی صفات کی درجہ بندی کا ایک جامع معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اگرچہ بہت سے اخلاقی مسائل پر یہ صادق بھی آتا ہے۔

قرآن کے اخلاقی اصول

اب ہم قرآن کے اخلاقی اصولوں کے بارے میں بحث کی طرف واپس آتے ہیں۔ جس طرح عام طور پر کتابوں کے مباحث کو باقاعدہ ابواب اور فصول کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے، قرآن اس طرح کی جمع کردہ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ آسمانی وحی کا ایک مجموعہ ہے جو بتدریج اور مختلف صورتوں اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوا۔ اس کے باوجود تفسیر موضوعی کے اسلوب کی رو سے اسے یہ شکل دی جا سکتی ہے۔ قرآن شریف کی تمام آیات کی تقسیم کے پیش نظر، اخلاق کے مبادیات کو مندرجہ ذیل چار شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۲۔ مخلوق سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۳۔ اپنی ذات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۴۔ دنیا اور کائنات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا، اس کے حضور خشوع وخضوع اور اس کے احکام کے سامنے راضی برضا رہنا اور سر تسلیم خم کرنا ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق پہلے شعبہ سے ہے۔

تواضع ،فروتنی، ایثار وقربانی، محبت وخوش اخلاقی اور ہمدردی ورحم دلی جیسے مسائل کا تعلق دوسرے شعبہ سے ہے۔

دل کو ہر قسم کی ناپاکی اور آلودگی سے پاک کرنا، مشکلات ومصائب پر ثابت قدم رہنا، ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق تیسرے شعبہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متعلق اسراف وتبذیر نہ کرنا اور اس جیسے مسائل کا تعلق چوتھے شعبہ سے ہے۔

ان چاروں اخلاقی بنیادوں کی جڑیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور آئندہ مباحث میں ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

البتہ یہ چار شعبے معروف فلسفی ملا صدرا کی مشہور کتاب ''اسفار'' کے چار شعبوں سے مختلف ہیں۔ ملا صدرا اور ان کے ہم فکر انسان کو ایک مسافر اور خودسازی کو سیر وسلوک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق عارف انسان کو چار سفر درپیش ہوتے ہیں:

۱۔ مخلوق سے حق کی طرف سفر (السفر من الخلق الی الحق)۔

۲۔ حق کے ساتھ حق میں سفر (السفر بالحق فی الحق)۔

۳۔ حق کی مدد سے حق کی طرف سے خلق کی طرف سفر (السفر من الحق الی الخلق بالحق)۔

۴۔ مخلوق کے اندر حق کی طرف سفر (السفر بالحق فی الخلق)۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ اسفارِ اربعہ یا سیر وسلوک الی اللہ کے چار مراحل ایک مختلف راستے کو طے کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض حصوں اور اخلاق کے مذکورہ چار شعبوں میں کچھ شباہتیں بھی پائی جاسکتی ہیں۔

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے اصول ان میں بیان کردیئے گئے ہیں۔ ان میں سورۂ لقمان کی آیات ہیں جو اس آیت سے شروع ہوتی ہیں:

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِكۡمَةَ اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور بذریعہ الہام حکم دیا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو۔'' (لقمان:۱۲)

اس طرح معارف وعقائد کی گفتگو میں سب سے پہلے نعمتیں بخشنے والے کے شکر کی بات کی گئی ہے۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ شکر منعم خدا شناسی کا پہلا قدم ہے جیسا کہ علم عقائد وعلم کلام کے علماء نے وضاحت سے کہا ہے کہ شناخت خدا کا بنیادی محرک شکر نعمت کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اپنے آپ کو اللہ تعالی کی بے شمار نعمتوں میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ ایسے میں اس کا

ضمیر بلا فاصلہ اسے ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی شناخت اور معرفت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہی معرفۃ اللہ کا پہلا قدم ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں توحید کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳

''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

گفتگو کے ایک اور مرحلہ پر آخرت کا ذکر آتا ہے جو کہ معارف دینی میں دوسرے اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ

''اے میرے بیٹے! اگر خردل کے دانے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو اور کسی چٹان کے اندر یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ (قیامت کے دن حساب کے لیے) اسے حاضر کر دے گا۔''

(لقمان:١٦)

اس کے بعد اخلاقیات اور حکمت عملی کے اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

١۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کا حکم دینے کے بعد ماں باپ کا احترام اور ان کی شکرگزاری:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ (لقمان:١٤)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے، یہ کہ تو اپنے ماں باپ کی شکرگزاری کیا کر۔''

٢۔ نماز، اللہ تعالیٰ سے تعلق، اس کے حضور میں خشوع وخضوع اور دعا کی اہمیت:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ

''نماز قائم کرو۔'' (لقمان:١٧)

٣۔ امر بالمعروف اور نہی از منکر:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔'' (لقمان:١٧)

٤۔ زندگی کے تلخ حوادث پر صبر کرنا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ

''جو مصیبت تمہیں پیش آئے، اس پر صبر کرو۔'' (لقمان:۱۷)

۵۔ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

''اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر۔'' (لقمان:۱۸)

۶۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ تواضع وفروتنی اور ترک تکبر:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾

''اور زمین پر اترا کر مت چل، بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (لقمان:۱۸)

۷۔ بول چال میں میانہ روی اور اعتدال:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ

''اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔'' (لقمان:۱۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فضائل اخلاق کا ایک بڑا حصہ ان آیات میں حکمت لقمان کے نام سے بیان ہوا ہے اور آیت ۱۳ سے آیت ۱۹ تک شکر، صبر، خوش اخلاقی، تواضع میانہ روی، امر بالمعروف، نہی از منکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورۂ انعام کی تین آیات (۱۵۱، ۱۵۳) میں دس اہم احکام بیان کئے گئے ہیں جن میں اخلاقیات کا ایک بڑا حصہ بیان کر دیا گیا ہے، جیسے بچوں، یتیموں اور عام لوگوں پر ظلم وستم سے اجتناب، ہر ایک کے ساتھ عدل سے پیش آنا، رشتہ داروں اور دوستوں کی تعصب پر مبنی غیر عادلانہ حمایت سے اجتناب، ظاہری اور باطنی برائیوں سے اجتناب، ماں باپ کے حقوق کا احترام، تفرقہ پردازی سے پرہیز اور ہر قسم کے شرک سے اجتناب۔[۱]

اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث

اسلامی احادیث میں اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کو حدیث کے اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا گیا ہے جو حکمائے یونان کی روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث جو کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، معروف صحابی امام سماعہ بن مہران کہتے

---

[۱] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں ان آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب کی ایک جماعت آپؑ کی خدمت میں حاضر تھی کہ عقل و جہل کی گفتگو شروع ہوگئی۔ آپؑ نے فرمایا:

''عقل اور جہل کے لشکروں کو پہچانو تا کہ ہدایت پاسکو۔''

میں نے عرض کیا: ''میں آپؑ پر قربان ہو جاؤں، جب تک آپؑ بیان نہ فرمائیں، ہم کیسے جان سکتے ہیں؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ نے پہلے عقل کو پیدا کیا، پھر جہل کو۔ (عقل اطاعت کے راستہ پر چلی اور جہل معصیت کی راہ پر) اللہ نے عقل کو ۷۵ لشکر دیئے اور انہی کی ضد ۷۵ لشکر جہل کو دیئے۔''

پھر آپؑ نے عقل و جہل کے لشکروں کو اس طرح بیان فرمایا:

الخير وهو وزير العقل	''نیکی عقل کی وزیر ہے۔''
وجعل ضده الشر وهو وزير الجهل	''اس کی ضد برائی ہے جو جہل کی وزیر ہے۔''
والايمان وضده الكفر	''ایمان اور اس کی ضد کفر ہے۔''
والتصديق وضده الجحود	''تصدیق اور اس کی ضد انکار ہے۔''
والرجاء وضده القنوط	''امید اور اس کی ضد ناامیدی ہے۔''
والعدل وضده الجور	''عدالت اور اس کی ضد ظلم ہے۔''
والرضاء وضده السخط	''رضا اور اس کی ضد ناراضگی ہے۔''
والشكر وضده الكفران	''شکر اور اس کی ضد ناشکری ہے۔''
والطمع وضده الياس	''طمع اور اس کی ضد مایوسی ہے۔''
والتوكل وضده الحرص	''توکل اور اس کی ضد حرص ہے۔''
والرافة وضده القسوة	''نرم دلی اور اس کی ضد سنگدلی ہے۔''
والرحمة وضدها الغضب	''رحمت اور اس کی ضد غضب ہے۔''
والعلم وضده الجهل	''علم اور اس کی ضد جہل ہے۔''
والفهم وضده الحمق	''فہم اور اس کی ضد حماقت ہے۔''
والعفة وضده التهتك	''عفت اور اس کی ضد ناپاک دامنی ہے۔''
والزهد وضده الرغبة	''زہد اور اس کی ضد دنیا طلبی ہے۔''

والرفق وضده الخرق	''خوش خوئی اور اس کی ضد بدخوئی ہے۔''
والرهبة وضده الجراة	''خوف اور اس کی ضد جرأت ہے۔''
والتواضع وضده الكبر	''تواضع اور اس کی ضد تکبر ہے۔''
والتودة وضدها التسرع	''آہستگی اور اس کی ضد جلد بازی ہے۔''
والحلم وضده السفه	''حلم اور اس کی ضد نابردباری ہے۔''
والصمت وضده الهذر	''خاموشی اور اس کی ضد فضول کلامی ہے۔''
والاستسلام وضده الاستكبار	''حق کے سامنے جھک جانا اور اس کی ضد استکبار ہے۔''
والتسليم وضده الشك	''حق کو تسلیم کرنا اور اس کی ضد شک ہے۔''
والصبر وضده الجزع	''صبر اور اس کی ضد بے صبری ہے۔''
والصفح وضده الانتقام	''عفو و درگزر اور اس کی ضد انتقام ہے۔''
والغنى وضده الفقر	''توانگری اور اس کی ضد فقر ہے۔''
والتذكر وضده السهو	''تذکر اور اس کی ضد غفلت ہے۔''
والحفظ وضده النسيان	''یادرکھنا اور اس کی ضد فراموشی ہے۔''
والتعطف وضده القطيعة	''محبت و پیوند اور اس کی ضد قطع تعلق ہے۔''
والقنوع وضده الحرص	''قناعت اور اس کی ضد حرص ہے۔''
والمواساة وضدها المنع	''ایثار اور اس کی ضد محروم کرنا ہے۔''
والمودة وضدها العداوة	''موت اور اس کی ضد عداوت ہے۔''
والوفاء وضده الغدر	''وفا اور اس کی ضد فریب کاری و پیمان شکنی ہے۔''
والطاعة وضدها المعصية	''اطاعت اور اس کی ضد معصیت ہے۔''
والخضوع وضده التطاول	''خضوع اور اس کی ضد برتری طلبی ہے۔''
والسلامة وضدها البلاء	''سلامتی اور اس کی ضد ابتلاء ہے۔''
والحب وضده البغض	''محبت اور اس کی ضد بغض ہے۔''
والصدق وضده الكذب	''سچ اور اس کی ضد جھوٹ ہے۔''

والحق وضده البالطل	''حق اور اس کی ضد باطل ہے۔''
والامانة وضدها الخيانة	''امانت اور اس کی ضد خیانت ہے۔''
والاخلاص وضده الشوب	''اخلاص اور اس کی ضد نیت کی آلودگی ہے۔''
والشهامة وضدها البلادة	''ہمت اور اس کی ضد پست ہمتی ہے۔''
والفهم وضده الغباوة	''فہم اور اس کی ضد نافہمی ہے۔''
والمعرفة وضدها الانكار	''معرفت اور اس کی ضد انکار ہے۔''
والمداراة وضدها المكاشفة	''پردہ پوشی اور اس کی ضد پردہ دری ہے۔''
وسلامة الغيب وضدها المماكرة	''کسی کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت اور اس کی ضد سازش ہے۔''
والكتمان وضده الافشاء	''راز کی حفاظت اور اس کی ضد افشائے راز ہے۔''
والصلاة وضدها الاضاعة	''نماز اور اس کی ضد نماز کو ضائع کرنا ہے۔''
والصوم وضده الافطار	''روزہ اور اس کی ضد روزہ نہ رکھنا ہے۔''
والجهاد وضده النكول	''جہاد اور اس کی ضد جہاد سے منہ موڑنا ہے۔''
والحج وضده نبذ الميثاق	''حج اور اس کی ضد اللہ کے پیمان کو توڑنا ہے۔''
وصون الحديث وضده النميمة	''گفتگو کی حفاظت، اس کی ضد چغل خوری ہے۔''
وبر الوالدين وضده العقوق	''والدین سے نیکی اور اس کی ضد بدسلوکی ہے۔''
والحقيقة وضدها الرياء	''جستجوئے حق اور اس کی ضد ریاکاری ہے۔''
والمعروف وضده المنكر	''معروف اور اس کی ضد منکر ہے۔''
والستر وضده التبرج	''حجاب اور اس کی ضد زینت کی نمائش ہے۔''
والتقية وضدها الاذاعة	''راز اور اس کی ضد افشائے راز ہے۔''
والانصاف وضده الحمية	''انصاف اور اس کی ضد تعصب ہے۔''
والتهيئة وضدها البغي	''صلح پسندی اور اس کی ضد بغاوت وسرکشی ہے۔''
والنظافة وضدها القذر	''پاکیزگی اور اس کی ضد گندگی ہے۔''
والحياء وضدها الجلع	''حیا اور اس کی ضد بے حیائی ہے۔''

والقصد وضده العدوان	''میانہ روی واعتدال اوراس کی ضد تجاوز ہے۔''
والراحة وضدها التعب	''راحت اوراس کی ضد تکلیف ورنج ہے۔''
والسهولة وضدها الصعوبة	''سہولت اوراس کی ضد صعوبت ہے۔''
والبركة وضدها المحق	''برکت اوراس کی ضد بربادی ہے۔''
والعافية وضدها البلاء	''عافیت اوراس کی ضد بیماری وابتلاء ہے۔''
والقوام وضدها المكاثرة	''اعتدال اوراس کی ضد کثرت طلبی ہے۔''
والحكمة وضدها الهواء	''حکمت اوراس کی ضد خواہشات کی پیروی ہے۔''
والوقار وضده الخفة	''وقاراوراس کی ضد سبکی ہے۔''
والسعادة وضدها الشقاوة	''سعادت اوراس کی ضد شقاوت ہے۔''
والتوبة وضدها الاصرار	''توبہ اوراس کی ضد گناہ پراصرار ہے۔''
والاستغفار وضده الاغترار	''استغفاراوراس کی ضد فریب خوردگی ہے۔''
والمحافظة وضدها التهاون	''حق کی حفاظت جس کی ضد حق کے بارے میں سستی ہے۔''
والدعاء وضده الاستنكاف	''دعااوراس کی ضد دعا سے انکار ہے۔''
والنشاط وضده الكسل	''نشاط اوراس کی ضد کاہلی ہے۔''
والفرح وضده الحزن	''خوشی اوراس کی ضد غم ہے۔''
والالفة وضدها الفرقة	''الفت اوراس کی ضد فرقت ہے۔''
والسخاء وضده البخل	''سخاوت اوراس کی ضد بخل ہے۔''

فلا تجتمع هذه الخصال كلها من اجناد العقل الا فى نبى اووصى نبى او مؤمن قد امتحن الله قلبه للايمان و اما سائر ذلك من مو الينا فان احدهم لا يخلو من ان يكون فيه بعض هذه الجنود حتى يستكمل وينقى من جنود الجهل فعند ذلك يكون فى الدرجة العليا مع الانبياء والا وصياء و انما يدرك ذلك بمعرفة العقل و جنوده و بمجانبة الجهل و جنوده وفقنا الله واياكم لطاعته و مرضاته انشاء الله

پھرامام علیہ السلام نے فرمایا

''عقل کے یہ لشکر نبی یا وصی کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتے یا پھر وہ مومن جس کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے آزما لیا ہو۔اس کے علاوہ ہمارے دیگر محبین میں ان میں سے کچھ لشکر پائے جاتے ہیں۔ وہ ان لشکروں کی تکمیل اور جہل کے لشکروں سے دوری کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔ جب وہ یہ عمل مکمل کر لیتے ہیں تو انبیاء واوصیاء کے درجہ میں قرار پاتے ہیں۔ یہ عقل اور اس کے لشکروں کی معرفت اور جہل اور اس کے لشکروں سے دوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنی اطاعت اور اپنی رضا کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔''(اصولِ کافی،۱:۲۰ تا ۲۳)

مندرجہ بالا حدیث اخلاق اسلامی کے اصول وفروغ کے بارے میں ایک جامع حدیث ہے۔بعض علماء نے اسے مستقل طور پر زیر بحث قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں مستقل کتب لکھی ہیں۔

۲۔ نہج البلاغہ میں کلماتِ قصار میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ (حدیث کے ذیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان سے مراد علمی اور عملی ایمان ہے جس میں اخلاقی اصول بھی شامل ہیں)

امام علیہ السلام نے جواب دیا:

الایمان علی اربع دعائم، علی الصبر و الیقین و العدل و الجهاد

''ایمان چار ستونوں پر قائم ہے: صبر، یقین، عدالت اور جہاد۔''

پھر آپؑ نے مزید فرمایا:

والصبر منها علی اربع شعب، علی الشوق والشفق والزهد والترقب

''صبر بھی چار بنیادوں پر قائم ہے: شوق، خوف، زہد اور انتظار۔''

(شوق سے مراد جنت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و پاداش کا شوق، خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کی سزا اور جہنم کا خوف ہے، یہ دونوں نیکی کی طرف حرکت اور برے کاموں سے باز رہنے میں موثر ثابت ہوتے ہیں۔ زہد یعنی دنیا کی چکا چوند سے بے رغبتی مصائب کو انسان کے لیے حقیر اور ناچیز بنا دیتا ہے جبکہ موت کا انتظار انسان کو اعمالِ حسنہ کی انجام دہی کی رغبت دلاتا ہے۔)

پھر آپؑ نے فرمایا:

و الیقین منها علی اربع شعب، علی تبصرة الفطنة و تأول الحکمة، و موعظة العبرة، وسنة الاولین

''یقین کے بھی چار شعبے ہیں: ہوشیاری میں بصیرت، حکمت کے دقیق نکات کا ادراک، حوادث سے

عبرت حاصل کرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا۔"

پھر آپؑ نے فرمایا:

والعدل منها علی اربع شعب، علی غائص الفهم، وغور العلم، و زهرة الحکم، و رساخة الحلم

"اورعدل کے بھی چار شعبے ہیں: فہم، امور کے لیے باریک بینی، علم میں غور وفکر، صحیح فیصلہ اور پائیدار حلم و بردباری۔"

آخر میں آپؑ نے فرمایا:

والجهاد منها علی اربع شعب، علی الامر بالمعروف و النهی عن المنکر و الصدق فی المواطن وشنئآن الفاسقین

"اور جہاد کے بھی چار شعبے ہیں: امر بالمعروف، نہی از منکر، معرکہ جنگ میں صداقت اور فاسقوں سے دشمنی۔"

اس کے بعد آپؑ نے کفر کے چارستونوں کی اسی طرح تفصیل سے بیان فرمایا جو ایمان کی ضد ہے۔

(نہج البلاغہ: کلماتِ قصار: ۱۳۱ اصولِ کافی، ۲، ۳۹۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

اربع من اعطیهن فقد اوتی خیر الدنیا و الاخرة، صدق حدیث واداء امانة وعفة بطن و حسن خلق

"چار چیزیں ایسی ہیں جو کسی کو مل جائیں تو اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے گی: بات چیت میں سچائی، امانت کی ادائیگی، عفت شکم (حلال خوری) اور حسن خلق۔" (غرر الحکم)

۴۔ اسی بات کا خلاصہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"مجھے ایسی نصیحت فرمایئے جس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی موجود ہو اور وہ نصیحت طویل بھی نہ ہو۔"

آپؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

لا تکذب

"جھوٹ نہ بولو۔" (تحف العقول: ۲۶۴)

حقیقت یہی ہے کہ تمام فضائل اخلاقی کی بنیاد سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نہ صرف دوسروں کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ اور خدا کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولے۔ جب انسان نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر "ایاك نعبد و ایاك نستعین" یعنی "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں"، تو اس کی اس بات میں جھوٹ نہ ہو۔ وہ ہر قسم کے شیطانی اور نفسانی معبودوں سے دور ہو اور اس کا سر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکا ہوا ہو وہ مال و دولت، مقام و منصب اور کسی دوسری طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور اسی سے مدد طلب کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا بن جائے تو اخلاقیات کے تمام اصول و فروع اس میں زندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ احادیث میں "افضل الاخلاق"، "اکرم الاخلاق"، "احسن الاخلق" اور "اجمل الخصال" جیسی اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں جن میں اخلاق اسلامی کے اہم اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

سئل الباقر عن افضل الاخلاق فقال الصبر و السماحة

"حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے افضل ترین اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: صبر اور سخاوت۔" (بحار الانوار، ۳۶:۳۵۸)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اکرم الاخلاق الشخاء و اعمها نفعا العدل

"معزز ترین اخلاق سخاوت اور نفع بخش ترین اخلاق عدل ہے۔" (غرر الحکم)

نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اشرف الخلائق التواضع و الحلم ولین الجانب

"بہترین اخلاقی صفات تواضع، حلم اور نرم دلی ہیں۔" (غرر الحکم)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا:

ای الخصال بالمرء اجمل فقال وقار بلامهابة، و سماح بلا طلب مكافاة، و تشاغل بغير متاع الدنيا

"انسانی صفات میں سے کونسی صفت سب سے خوبصورت ہے؟ آپؑ نے فرمایا: وہ وقار جس میں ہیبت نہ ہو، وہ سخاوت جس میں بدلہ کی توقع نہ ہو اور غیر متاع دنیا میں مشغول ہونا۔" (اصول کافی، ۲:۲۴۰)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں بری اخلاقی صفات کو اصول کفر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اصول الکفر ثلاثۃ: الحرص و الاستکبار و الحسد

''تین چیزیں کفر کی جڑ ہیں: حرص، تکبر اور حسد۔''

پھر آپؑ نے تینوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

فاما الحرص فان آدم حین نہی عن الشجرۃ حملہ الحرص ان اکل منہا، و اما الاستکبار فابلیس حین امر بالسجود لآدم استکبر، و اما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدھما صاحبہ

''آدم کو ایک درخت سے منع کیا گیا تھا۔ حرص نے ان پر حملہ کیا جس کی وجہ سے انہوں نے اس درخت سے کھالیا۔ تکبر کی برائی یہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے تکبر کیا (اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون اور مردود قرار پایا)۔ حسد کا اظہار اس وقت ہوا جب آدم کے ایک بیٹے نے حسد کی وجہ سے دوسرے کو قتل کر دیا۔'' (اصولِ کافی، ۲:۲۸۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کے سب سے بڑے حوادث جو اس نسل انسانی کے آغاز سے ہی رونما ہو گئے، ان تین صفات کی وجہ سے تھے۔ حرص نے آدم کو جنت سے نکالا، تکبر نے ابلیس کو ملعون و مردود بنایا اور حسد نے انسانی معاشرے میں قتل و خونریزی کی بنیاد ڈالی۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان اول ما عصی اللہ عزوجل بہ ست: حب الدنیا و حب الریاسۃ، و حب الطعام و حب النوم و حب الراحۃ و حب النساء

''چھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پہلی بار اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی: دنیا کی محبت، مقام اور عہدے کی محبت، غذا کی محبت، نیند کی محبت، آرام سے محبت اور عورتوں سے محبت۔'' (بحار الانوار، ۶۹:۱۰۵)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں اخلاقی فضائل اور اخلاقی رذائل کی بنیادوں کی اجمالی وضاحت ہوگئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی کوئی خاص تعداد معین نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھے یا برے اخلاق کی مختلف النوع وجوہات ہوسکتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح انسان کی جسمانی تعداد مقرر نہیں کی جاسکتی، اسی طرح اس کی روحانی صفات کی تعداد بھی گنتی سے باہر ہے۔

ساتواں باب

اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق

فضائل اخلاق غالباً ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور مربوط ہیں۔ اسی طرح رذائل اخلاق کے درمیان بھی قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان مکمل جدائی غالباً ناممکن ہے۔

یہ ربط و تعلق بعض اوقات مشترکہ بنیاد کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی ان کے نتائج و ثمرات کی یکسانیت کی وجہ سے۔ مشترکہ بنیاد پر رونما ہونے والی صفات کی ہمارے پاس واضح مثالیں موجود ہیں۔ اکثر مواقع پر غیبت کی بنیاد حسد ہوتا ہے۔ حاسد کسی شخص کے ساتھ اپنے حسد کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو کو داغدار کرنے کے لیے یا اس کی شخصیت کو خراب کرنے کے لیے اس کی غیبت کرتا ہے۔ اسی طرح کسی پر تہمت اور جھوٹا الزام لگانا، تکبر، احساس برتری اور دوسروں کو حقیر جاننا وغیرہ بھی حسد کے نتائج ہیں۔

اس کے برعکس بلند ہمتی جس طرح طمع کا راستہ روکتی ہے، اسی طرح حسد، تکبر، غرور اور خوشامد وغیرہ کا بھی مقابلہ کرتی ہے۔

نتائج اور ثمرات کے لحاظ سے بھی صفات کا باہمی ربط و تعلق واضح ہے۔ ایک جھوٹ کئی جھوٹ بولنے کا سبب ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے بعض دوسرے گناہوں کا مرتکب ہو جائے یا ایک جرم کو چھپانے کے لیے مزید جرائم کا مرتکب ہو جائے۔

اس کے برعکس ایک اچھا اخلاقی عمل مثلاً ایمانداری، لوگوں کے درمیان محبت، دوستی اور معاشرتی تعاون کا باعث ہو جائے۔

احادیث میں بھی اس بات کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا کان فی الرجل خلة رائعة فانتظر اخواتها

''جب تم کسی شخص میں کوئی ایک اچھی صفت دیکھو تو منتظر رہو کہ اس صفت کی ساتھی صفات بھی اس میں پیدا ہو جائیں گی۔'' (بحارالانوار، ٦٦: ٤١١)

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان خصال المکارم بعضها مقید ببعض

''اچھی صفات ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔''

اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

صدق الحدیث و صدق الباس و اعطاء السائل و المکافات بالصنایع واداء

الامانة و صلة الرحم والتودد الی الجار والصاحب و قری الضیف وراسهن الحیاء

''سچائی، میدان جنگ میں ثابت قدمی، سائل کوعطا کرنا، احسان کے بدلہ میں احسان، امانت کوادا کرنا، صلہ رحمی، ہمسایوں اور دوستوں سے محبت اور مہمان نوازی کی بنیاد حیاء ہے۔''

(بحارالانوار،٦٦:٥ےہ٣)

درحقیقت حیاء جو کہ گناہ سے نفرت کی روح ہے، تمام اخلاقی صفات کی بنیاد ہوسکتی ہے جس طرح سچائی کا امانت، میدانِ جنگ میں ثابت قدمی، دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ محبت سے گہرا تعلق ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله عزوجل جعل للشرا قفالا و جعل مفاتیح تلك الاقفال الشراب، و الکذب شر من الشراب

''اللہ تعالیٰ نے برائی کے تالے بنائے ہیں اور ان تالوں کی کنجی شراب ہے اور جھوٹ شراب سے بدتر ہے۔'' (بحارالانوار،٦٩:٦:٢٣٦)

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جھوٹ سب گناہوں کی جڑ بن سکتا ہے۔ یہی بات حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ایک حدیث میں مختصر طور پر اس طرح بیان فرمائی ہے:

جعلت الخبائث کلها فی بیت و جعل مفتاحها الکذب

''تمام برائیاں ایک گھر میں رکھ دی گئی ہیں اور ان کی کنجی جھوٹ ہے۔'' (بحارالانوار:٦٩، ٢٦٣)

ہم اس گفتگو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

روایت میں ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا:

''یارسولؐ اللہ! میں تنہائی میں زنا، شراب خوری، چوری اور جھوٹ کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپؐ ان میں سے جس ایک کو ترک کرنے کا حکم دیں، میں آپؐ کے لیے اسے چھوڑ دوں گا۔'' (معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سارے گناہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ آنحضرتؐ کی خاطر ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنے پر تیار تھا)۔

آپؐ نے فرمایا: ''جھوٹ چھوڑ دو''۔

وہ شخص چلا گیا۔ جب اس نے زنا کا ارادہ کیا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر آپؐ نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا اور میں نے سچ کہا تو آپ مجھ پر زنا کی حد جاری فرمائیں گے اور اگر جھوٹ بولا تو آپؐ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کی خلاف

ورزی ہوگی۔

اسی طرح چوری اور شراب خوری کے وقت بھی اس کے ذہن میں ایسا ہی خیال پیدا ہوا۔ وہ شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''آپؐ نے ان سب گناہوں کا راستہ مجھ پر بند کر دیا ہے اور میں نے ان تمام گناہوں کو ترک کر دیا ہے۔'' (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ۶:۳۵۷)

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تربیت نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے خاص طور پر کسی مخصوص اخلاقی صفت کی اصلاح کے لیے ان چیزوں سے کام کا آغاز کرنا چاہیے جو بنیادی حیثیت کی حامل ہیں اور ان اخلاقی صفات کی مدد حاصل کی جائے جو ان کے ساتھ پیوستہ اور مربوط ہیں۔

آٹھواں باب

کہاں سے شروع کریں؟

یہاں تک ہم علم اخلاق، اس کے آثار ونتائج اور محرکات وغیرہ کے بارے میں کلی اور عمومی آگہی حاصل کر چکے ہیں۔ اب ہم ان کلی اور عمومی معلومات کی روشنی میں تہذیب نفس کے راستے کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اب ہم مسائل ذہنی سے مسائل عینی کی طرف یا کلیات سے جزئیات کی طرف آتے ہیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہم یہاں بھی ذرا توقف کریں اور اس روحانی سفر کے لیے ضروری ساز وسامان کا انتظام کرلیں تاکہ دورانِ سفر حیرت وسرگردانی یا بدنظمی کا شکار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے:

۱۔ اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات۔

۲۔ کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

۳۔ اندرونی اور بیرونی واعظ کا کردار۔

۴۔ وہ امور جو انسان کو اس عظیم مقصد تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں جیسے اللہ کا ذکر، عبادات اور دعائیں، زیارات، مسلسل نصیحت اور تلقین۔

۵۔ ماحول کی پاکیزگی۔

اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات

پہلا نظریہ یہ کہتا ہے کہ تہذیب نفس اندرونی دشمنوں کے ساتھ جہاد ہے جو کہ انسانوں کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ نظریہ رسولؐ اللہ کی معروف حدیث پر مبنی ہے جس کے مطابق آنحضرتؐ نے جہاد سے واپس آنے والے مجاہدین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

مرحبا بقوم قضو الجهاد الاصغر و بقي عليهم الجهاد الاكبر فقيل يا رسول الله ماالجهاد الاكبر. قال: جهاد النفس

''آفرین ہے ان لوگوں پر جو جہاد اصغر کر آئے ہیں اور جہاد اکبر ابھی ان پر باقی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نفس کے خلاف جہاد۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۱: ۱۲۲)

بحارالانوار میں اس حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی ہے:

ثم قال: افضل الجهاد من جاهد نفسه التي بين جنبيه

''پھر آپؑ نے فرمایا: سب سے افضل جہاد نفس کے خلاف جہاد ہے جو انسان کے دونوں پہلوؤں کے بیچ میں ہے۔'' (بحارالانوار، ۶۵:۶۷)

قرآن مجید میں جہاد کے بارے میں آنے والی آیات میں سے بعض کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جہاد اکبر کے بارے میں ہیں۔ اس لیے کہ یا تو خاص طور پر ان میں نفس کے خلاف جہاد مدنظر ہے، یا اس لیے کہ ان کا مفہوم وسیع ہے اور جہاد کی دونوں اقسام اس میں داخل ہیں۔

تفسیر قمی میں سورۂ عنکبوت کی آیت ۶

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''جو جہاد کرتا ہے اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تمام عالمین سے بے نیاز ہے۔''

کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شہوات، ناجائز لذتوں اور گناہوں کے خلاف جہاد ہے۔

اس آیت کی اس تفسیر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ جہاد کا فائدہ خود جہاد کرنے والے کو ہوتا ہے اور یہ بات زیادہ تر نفس کے خلاف جہاد میں صادق آتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس پہلی آیت میں لقاء اللہ کے بارے میں بات کی گئی ہے:

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو، سو اللہ تعالیٰ (سے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور آنے والا ہے اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔''

یہ بات بالکل واضح ہے کہ لقاء اللہ اور شہودِ الٰہی اور قرب خدا کا حصول نفس کے خلاف جہاد کے مقاصد ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں بھی یہ بات کہی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''جو لوگ (خلوص نیت سے) ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم یقیناً ان کو ہدایت دیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ آیت بھی ''فینا'' (ہماری راہ میں) اور ''لنهدينهم سبلنا'' (ہم یقیناً ان کو اپنی راہوں کی ہدایت کریں گے) جیسے قرائن کی وجہ سے زیادہ تعلق جہادِ نفس سے ہی رکھتی ہے، یا یہ کہ اس کا مفہوم عام ہے اور دونوں اقسام کے جہاد اس میں آجاتے ہیں۔

سورۂ حج کی آیت ۷۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی مقرر نہیں کی۔''

اکثر مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں جہاد سے مراد، جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر دونوں ہیں یا خاص طور پر جہادِ اکبر مراد ہے۔ جیسا کہ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے کہ جہاد کا حق ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خلوصِ نیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔ (مجمع البیان، ۷:۹۷)

علامہ مجلسیؒ نے بھی بحارالانوار میں اس آیت کو ان آیات کے زمرے میں قرار دیا ہے جو جہادِ اکبر سے متعلق ہیں۔ (بحارالانوار، ۶۷:۶۳)

ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا: (میزان الحکمہ، ۲:۱۴۱)

یارسول اللہ ای الجهاد افضل؟ قال ان یجاهد الرجل نفسه و هواه

''یارسولؐ اللہ! کونسا جہاد افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا۔''

عقل و جہل کے لشکروں سے متعلق حدیث جو گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے، بھی اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہے کہ انسان کا وجود ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ایک طرف عقل اور اس کے لشکر کھڑے ہیں اور دوسری طرف جہل اور ہوائے نفس اور اس کے لشکر صف آراء ہیں۔ یہ دونوں لشکر مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ کمالات انسانی میں انسان کی ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ عقل کے لشکر جہل کے لشکروں پر غالب آ جائیں۔ ان کی جزئی کامیابی بھی کمالات انسان میں جزئی ترقی شمار ہوتی ہے۔

دوسرا نظریہ: روحانی طب

اس نظریہ کے مطابق انسان کے جسم کی طرح انسان کی روح بھی بیمار ہوتی ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے بھی روحانی معالجوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اخلاقی بیماریوں سے نجات کی دواؤں کا استعمال کرنا چاہیے تا کہ انسان کی روح صحت مند، پرنشاط اور فعال ہو جائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں روحی اور اخلاقی بیماریوں کو ''مرض'' کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰ میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

''ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے اور اللہ نے (ان کے گناہ اور نفاق کی وجہ سے) ان کی بیماری کو

بڑھا دیا ہے۔''

سورۂ احزاب آیت ۳۲ میں شہوت پرستوں کو ایسے بیمار قرار دیا گیا ہے جو پاکدامن عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔اس آیت میں رسولؐ اللہ کی ازواج کو حکم دیا گیا ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ

''ایسے نرم لہجہ میں بات نہ کرو جس کی وجہ سے بیمار دل افراد کسی طمع میں مبتلا ہو جائیں۔''

دوسری آیات میں بھی ایسے معنی یا ان سے وسیع تر معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہر قسم کے اخلاقی اور عقیدتی انحراف پر محیط ہیں۔

ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نور معرفت،تقویٰ اور اخلاق سے سرشار دل کو قلب سلیم کا نام دیا گیا ہے:

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾

''جس دن لوگ حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے، مجھے رسوا نہ کرا اور اس دن جب مال اور اولاد کسی کو فائدہ نہ دیں گے سوائے اس کے جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے۔''

(سورۂ شعراء:۸۷ تا ۸۹)

سلیم کا لفظ سلامت سے مشتق ہے جو فساد، انحراف اور بیماری کی ضد ہے۔آئمہ معصومینؑ سے مروی روایات کی رو سے اس آیت میں قلب سلیم سے مراد وہ قلب ہے جو غیر اللہ سے خالی ہو (یعنی ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی بیماری سے دور ہو)۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آرزو پوری ہوگئی اور وہ صاحب قلب سلیم ہوگئے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿٨٣﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٤﴾

''اور ان کے پیروکاروں میں ابراہیم بھی تھے۔ جب وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوئے۔''

صاحب قلب سلیم ہونے کی خواہش جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں تھی، بندگی خدا کی راہ میں کوشش وجدوجہد، ایثار وقربانی، شرک اور ہوائے نفس کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں پوری ہوگئی اور آخر کار وہ اس مقام پر فائز ہوگئے۔

احادیث میں بھی اس نظریہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جن کے چند نمونے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام رسولؐ اللہ کی توصیف میں فرماتے ہیں:

طبيب دوا ربطبه قدا حكم مراهمه و احمى مواسمه يضع ذلك حيث الحاجة

الیه من قلوب عمی وآذان صم والسنة بکم، متتبع بدوائه مواضع الغفلة و مواطن الحیرة

''وہ ایک طبیب تھے جو اپنی طب کے ساتھ معاشرے میں چلتے تھے۔ آپؐ نے مرہم کو خوب محکم کیا اور اپنے اوزاروں کو گرم رکھا تا کہ اندھے دلوں، بہرے کانوں اور گونگی زبانوں کا علاج کر سکیں۔ وہ اپنی طب کو ساتھ لیے ان بیماروں کی تلاش میں پھرتے تھے جو فراموش ہو چکے تھے اور حیرت و سرگردانی میں گم تھے۔'' (خطبہ ۱۰۸)

۲۔ قلب سلیم، جس کے بارے میں دو آیات کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا:

ما القلب السلیم؟

یعنی ''قلب سلیم کیا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

دین بلا شك وهوی، و عمل بلا سمعة وریاء (مستدرک الوسائل، ۱:۱۰۳)

''اس سے مراد ایسا دین ہے جو شک اور ہوس پرستی سے پاک ہو اور ایسا عمل جو سمعہ اور ریا سے دور ہو۔''

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا علم کطلب السلامة ولا سلامة کسلامة القلب

''کوئی علم سلامتی کی جستجو جیسا نہیں ہے اور کوئی سلامتی قلب کی سلامتی جیسی نہیں ہے۔'' (بحار الانوار ۷۵:۱۶۴)

ایک اور حدیث میں حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

اذا احب الله عبدا رزقه قلبا سلیما و خلقا قویما

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے قلب سلیم اور معتدل اخلاق عطا فرماتا ہے۔''

۳۔ متعدد احادیث میں اخلاق رذیلہ کو قلبی بیماریاں قرار دیا گیا ہے۔ حضورؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

ایاکم والمراء والخصومة فانهما یمرضان القلوب علی الاخوان، وینبت علیهما النفاق

’’جھگڑے اور مخالفت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ دلوں میں بھائیوں کے خلاف بیماری پیدا کرتے ہیں اور ان کے اوپر منافقت اگتی ہے۔‘‘ (بحار الانوار، ۷۰:۳۹۹)

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما من شیء افسد للقلب من خطیئته

’’گناہ سے زیادہ کوئی چیز انسان کے دل کو خراب نہیں کرتی۔‘‘ (بحار الانوار، ۷۰:۳۱۲)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الا و من البلاء الفاقة و اشد من الفاقة مرض البدن، و اشد من مرض البدن مرض القلب

’’خبردار! فقر ایک مصیبت ہے۔ اس سے بری مصیبت جسمانی بیماری ہے اور اس سے بڑی مصیبت دل کی بیماری ہے۔‘‘ (نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۸۸)

۵۔ رسول اللہؐ سے مروی ایک حدیث میں حسد کو ایسی بیماری کہا گیا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں موجود رہی ہے:

الا انه قد دب الیکم داء الامم من قبلکم وهو الحسد، لیس بحالق الشعر، لکنه حالق الدین، و ینجی فیه ان یکف الانسان یده و یخزن لسانه و لا یکون ذا غمز علی اخیه المومن

’’ایک بیماری جس میں گزشتہ اقوام مبتلا تھیں، تمہاری طرف آ چکی ہے۔ وہ بیماری حسد ہے جس سے جسم کے بال نہیں جھڑتے لیکن ان کا دین جھڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ جب حسد کے آثار نظر آئیں تو اپنے ہاتھ اور زبان کو روک رکھے اور آنکھ کے اشارے سے بھی اپنے مومن بھائی کی اہانت نہ کرے۔‘‘ (میزان الحکمہ، ۱:۶۳۰)

۶۔ بہت سی احادیث میں اخلاقی رذائل کو ’’داء‘‘ کہا گیا ہے جس کے معنی بیماری کے ہیں۔ نہج البلاغہ میں خطبہ ۱۷۶ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاستشفوه من ادوائکم .... فان فیه شفاء من اکبر الداء و هو الکفر والنفاق و الغی والضلال

’’قرآن سے اپنی بیماریوں کی شفا طلب کرو۔ اس میں سب سے بڑی بیماری کفر، نفاق، گمراہی و

ضلالت کی شفا موجود ہے۔''

یہ الفاظ اور بھی بہت سی احادیث میں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ اس نقطہ نظر کے مطابق فضائل ورذائل اخلاقی انسان کی روح کی صحت یا بیماری کی علامات ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے رسول، آئمہ معصومینؑ اور معلمین اخلاق روحانی طبیب ہیں جبکہ ان کی تعلیمات اور نصائح شفا بخش دوائیں ہیں۔

اس لحاظ سے جس طرح جسمانی بیماری کے علاج میں صحت مند ہونے کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی ضروری ہے، اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے نجات کے لیے بدکار دوستوں، برے ماحول اور ان تمام عوامل سے پرہیز ضروری ہے جو اخلاقی بیماریوں کے زیادہ ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

جسمانی بیماریوں کے علاج میں بعض اوقات جراحی یعنی آپریشن کی ضرورت پیش آتی ہے اور طبیب جراحی کے آلات سے جسم کو چاک کر کے علاج کرتا ہے۔ طب روحانی میں بھی غیر اخلاقی افعال کی سزا کے طور پر نافذ ہونے والی حدود، تعزیرات اور سزائیں جراحی یعنی آپریشن کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی طب میں دو مراحل بالکل واضح ہیں: احتیاط اور علاج۔ طب روحانی میں بھی یہ دونوں مراحل موجود ہیں۔ روحانی معالج اور معلمین اخلاق ایک طرف سے روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں تو دوسری طرف سے روحانی طور پر صحت مند افراد کو بیماری سے محفوظ رہنے میں احتیاطی تدابیر بتاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۰۸ میں حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں جہاں مرہم کا ذکر کیا، وہاں زخموں کو جلانے والے اوزاروں کا بھی ذکر فرمایا۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی جسمانی بیماریوں کی طرح مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

جسمانی بیماریوں کے علاج کی طب میں بعض عام ضابطے ہیں جن کا ہر بیماری کے علاج میں خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہر بیماری کے علاج کے کچھ مخصوص قوانین اور ضوابط بھی ہوتے ہیں۔ طب روحانی میں بھی اسی طرح سے ہے۔ توبہ، ذکر الٰہی، نماز، روزہ اور دیگر عبادات، محاسبہ اور مراقبہ وغیرہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے عام قوانین ہیں جبکہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے مخصوص قوانین بھی موجود ہیں جو کتب روایات واخلاق میں موجود ہیں۔

تیسرا نظریہ: سیر و سلوک

اس نظریہ کے مطابق انسانوں کو مسافروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو نقطہ عدم سے سفر کا آغاز کر کے لقاء اللہ اور قرب خدا کی طرف گامزن ہیں جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔

اس روحانی سفر میں بھی جسمانی سفر کی طرح رہنما، سواری، سامانِ سفر، زادِ راہ، مشکلات وموانع کی برطرفی، ڈاکوؤں،

چوروں اور جان و مال کے دشمنوں سے بچاؤ کے انتظامات ضروری ہیں۔

اس روحانی سفر میں بھی کئی منازل اور دشوار گھاٹیاں، خطرناک کھائیاں درپیش ہوتی ہیں۔ انسان ان سب سے گزر کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اگرچہ بعض حضرات کا اصرار ہے کہ سیر وسلوک، راستے اور منازل سے آگاہی، سواری، زادِسفر اور رہنما سے آگاہی کا علم، علم کا اخلاق سے جدا اور الگ علم ہے۔ ممکن ہے ایک لحاظ سے ان کی بات درست ہو لیکن اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیر وسلوک روحانی بھی انہی راستوں سے گزرتا ہے جہاں سے اخلاقی تربیت کی راہیں گزرتی ہیں، یا کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اخلاق الٰہی سیر وسلوک کا ایک حصہ ضرور ہے۔

بہرحال آیات قرآنی اور احادیث معصومینؑ میں بھی اس نظریے کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵،۱۵۶ میں ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اے رسولؐ! ان صابرین کو بشارت دے دیجیے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

اس آیت کی رو سے انسان ایک طرف سے اپنے آپ کو اللہ کی ملکیت قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سے خود ایک ایسا مسافر بن جاتا ہے جو اللہ کی طرف محوِ سفر ہے۔

سورۂ علق میں ہے:

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾

''یقیناً سب کی بازگشت تیرے رب کی طرف ہے۔'' (علق:۸)

سورۂ انشقاق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾

''اے انسان! تو بہت کوشش اور مشقت کے ساتھ اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے اور آخرکار اس سے ملاقات کرے گا۔'' (انشقاق:۶)

سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ

تُوْقِنُوْنَ۝۲

''اللہ نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے ذریعے اٹھا رکھا ہے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ وہ اسی طرح اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین حاصل کرلو۔'' (رعد:۲)

قرآن مجید میں بیس سے زیادہ آیات میں لقاء اللہ کا ذکر پایا جاتا ہے جو سالکانِ الی اللہ اور عارفانِ الٰہی کی آخری منزل مقصود ہے۔ یعنی اس بے نظیر محبوب اور بے مثال مقصود کا معنوی اور روحانی دیدار۔

یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی آیات ایک لحاظ سے عمومیت رکھتی ہیں اور سب اس میں داخل ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فطرت اور خلقت کے اعتبار سے مومن اور کافر دونوں کی منزل وہی ہو جبکہ بعض لوگ انحراف اور گمراہی کی وجہ سے راستے میں ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں اور اولیائے الٰہی اپنے اپنے درجات کے مطابق اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے نطفہ آغازِ تخلیق سے ہی ایک مکمل انسان بننے کے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے اور مکمل انسان بننے کے بعد بھی اپنے ارتقاء اور تکامل کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض نطفے ابتدائی مراحل میں ہی ہلاکت کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ بعض ولادت کے بعد مختلف حوادث و آفات کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ان سب باتوں سے زیادہ واضح اور روشن بات وہ ہے جس میں قرآن مجید نے تقویٰ کو بہترین زادِراہ قرار دیا ہے۔ (زادِراہ عام طور پر مسافر کے غذائی سامان کو کہا جاتا ہے لیکن لغت کی رو سے اس کے معنی وسیع تر ہیں اور ہر قسم کی ذخیرہ سازی اس میں آجاتی ہے۔)

بنابرایں یہ عبارت جو تقویٰ کو بہترین زادِراہ قرار دے رہی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کے سفر کی نشاندہی کرتی ہے جس میں بہرحال زادِراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سفر روحانی ہے، لہٰذا اس کا زادِراہ بھی روحانی ہے۔ احادیث میں بھی ایسی عبارات وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔

نہج البلاغہ میں متعدد خطبات میں اس دنیا سے آخرت کے سفر کے لیے زادِراہ لینے کی بات کی گئی ہے، خطبہ ۱۵۷ میں ہے:

فتزودوا فی ایام الفناء لایام البقاء

''ان فانی ایام میں باقی رہنے والے ایام کے لیے زادِراہ کا انتظام کرلو۔''

خطبہ ۱۳۲ میں ہے:

ان الدنیا لم تخلق لکم دار مقام، بل خلقت لکم مجاز التزودوا منها الاعمال الی دار القرار

''یہ دنیا تمہارے لیے اقامت گاہ نہیں بلکہ گزرگاہ ہے تاکہ اس میں سے اقامت گاہ کے لیے اعمال کا

زادِراہ حاصل کرو۔''

خطبہ ۱۳۳ میں ایک انتہائی لطیف انداز میں اس طرح کہا گیا ہے:

والبصیر منہا متزودو الاعمی لہا متزود

''بینائی رکھنے والا اس دنیا سے زادِراہ حاصل کرتا ہے جبکہ اندھا اس کے لیے زادِراہ حاصل کرتا ہے۔''

سورۂ ابراہیم کی آیت ا میں ''صراط العزیز الحمید''، سورۂ حمد میں ''الصراط المستقیم'' اور بہت سی آیات میں سبیل اللہ اور انفال، آیت ۳۶ میں ''لیصدوا عن سبیل اللہ'' جیسے الفاظ اس نظریہ کی طرف اشارہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

نواں باب

سیر وسلوک کے مختلف طریقے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن ارباب سیر وسلوک اور علماء نے اس راہ میں قدم رکھا ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنا رہنما قرار دیا ہے (نہ وہ صوفیاء جنھوں نے غیر اسلامی طریقے اپنائے) ان میں سے ہر ایک نے ایک روش اور طریقہ کا تجویز کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس راہ کی منازل ومراحل کو بیان کیا ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں مختصراً اشارہ کرتے ہیں تا کہ یہ بحث مکمل تر اور مفید تر ہوجائے۔

ا۔ سیر وسلوک بحر العلوم

اس کتاب کو علامہ بحر العلوم کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ اگر چہ اس کے بعض حصوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی طرف ان کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کتاب کے بعض حصے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں قرب الٰہی کو طے کرنے کے چار عوالم یا بعبارت دیگر چار منازل کا ذکر کیا گیا ہے:

ا۔ اسلام　　۲۔ ایمان　　۳۔ ہجرت　　۴۔ جہاد

ان چاروں عوالم میں سے ہر ایک کے تین مراحل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد بارہ بنتی ہے۔ ان بارہ مراحل کو طے کرنے کے بعد سالك الی اللہ عالم خلوص میں داخل ہوتا ہے۔

یہ بارہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ **اسلام اصغر:** اس سے مراد شہادتین کا اقرار، ان کی ظاہری تصدیق اور دینی فرائض کی بجا آوری ہے۔

۲۔ **ایمان اصغر:** اس سے مراد تمام معارف اسلامی کی قلبی تصدیق اور ان پر باطنی یقین ہے۔

۳۔ **اسلام اکبر:** اس سے مراد اسلام کے تمام حقائق اور اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

۴۔ **ایمان اکبر:** اس سے مراد اسلام اکبر کی روح اور معنویت ہے جس میں انسان مرتبہ اطاعت سے مرتبہ شوق ورضا ورغبت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

۵۔ **ھجرت صغری**، اس سے مراد دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا ہے، جیسے مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی تھی۔

۶۔ **هجرت کبری:** اس سے مراد گناہگاروں، ظالموں اور بدکاروں سے دوری اختیار کرنا ہے۔

۷۔ **جهادِ اکبر:** رحمن کے لشکروں کی مدد سے جو کہ عقل کے لشکر ہیں، شیطان کے لشکروں کے خلاف جہاد کرنا۔

۸۔ شیطان کے لشکر پر فتح و کامیابی اور ان کے تسلط سے آزادی اور عالم جہل وطبیعت سے نکلنا۔

۹۔ **اسلام اعظم:** اس سے مراد اپنی خواہشات نفس اور آرزوؤں پر غلبہ پانا ہے کیونکہ فتح وظفر کے بعد بیداری کے بیرونی عوامل، انحراف وگمراہی کے اندرونی عوامل پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس مقام پر قلب سالک مرکز انوارِ الٰہی و فیوض ربانی بن جاتا ہے۔

۱۰۔ **ایمان اعظم:** اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کے سامنے اپنے فنا کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اس مرحلہ میں سالك **فادخلي في عبادي و ادخلي جنتي** (پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا) کے عالم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر عبودیت اور بندگی کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ **هجرت عظمی:** اس سے مراد اپنے وجود سے ہجرت کر کے اسے فراموش کر دینا ہے۔ یہ عالم وجودِ مطلق کی طرف سفر کا مرحلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کی طرف کامل توجہ کا مرحلہ ہے جس کی طرف **وادخلي جنتي** میں خطاب کیا گیا ہے۔

۱۲۔ **جهاد اعظم:** اپنی ذات سے ہجرت کے بعد اس مرحلہ میں سالک اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے توسل کرتا ہے تا کہ اپنی خود بینی کے سارے آثار کو مٹا دے اور نابود کر دے اور توحید مطلق کے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔

ان بارہ عوالم کو طے کرنے کے بعد سالک عالم خلوص میں داخل ہو جاتا ہے اور "**بل احياء عند ربهم يرزقون**" (وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پاتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے۔[1]

اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت

علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک میں مندرجہ بالا عوالم کا ذکر کرنے کے بعد اس مشکل اور پر مشقت راہ کو طے کرنے کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں پچیس اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

قرب خدا کی راہ پر چلنے والا سالک الی اللہ انسان، اصول دین اور احکام دین اسلام سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد سامان سفر باندھتا ہے اور مندرجہ ذیل پچیس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے لگتا ہے:

۱۔ ان عادات و رسوم و آداب کو ترک کرنا جو انسان کو اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اسے آلائشات میں غرق کر دیتے ہیں۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس رسالہ میں بارہ عوالم کی ترتیب اور رسالہ "لب اللباب" میں علامہ طباطبائی کے ارشادات میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ان کو باہم ملا دیا ہے۔

۲۔ منزل کی طرف بڑھنے کا پختہ عزم: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اثنائے سفر میں کسی چیز سے خوفزدہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی قسم کے شک وشبہ کو دل میں داخل نہ ہونے دے۔

۳۔ نرمی اور تحمل: اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وقت میں زیادہ امور کو اپنے اوپر مسلط نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ اس کا حوصلہ سرد ہو جائے اور وہ متنفر ہو کر آگے بڑھنے سے رک جائے۔

۴۔ وفا: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو توبہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور کی ہے، اس کے بارے میں وفادار رہے اور ان گناہوں کی طرف واپس نہ پلٹ جائے۔ نیز یہ کہ استاد اور رہنما کے احکامات و ہدایات کے بارے میں بھی وفادار رہے۔

۵۔ ثابت قدمی اور استقلال: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لائحہ عمل وہ اپنے لئے منتخب کرے، آہستہ آہستہ اسے ایک پختہ عادت میں تبدیل کر دے تا کہ کسی صورت میں اس سے واپس نہ ہو سکے۔

۶۔ مراقبہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام حالات میں اپنے اوپر کڑی نظر رکھے تا کہ کسی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔

۷۔ محاسبہ: حدیث میں ہے:

لیس منا من لا یحاسب نفسه کل یوم

''جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔'' (ارشاد القلوب، باب ۳۹)

۸۔ مواخذہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی کسی خطا کا مرتکب ہو، اپنے نفس کا مواخذہ کرے اور اس طرح اپنے آپ کو سزا دے۔

۹۔ مسارعہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآنی حکم پر:

وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف سرعت اور تیزی سے آگے بڑھو۔'' (آل عمران: ۱۳۳)

عمل کرتے ہوئے ہر قدم اٹھانے میں جلدی کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی کے ذریعے اسے عمل سے روک دے۔

۱۰۔ ارادت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے باطن کو اس طرح پاکیزہ اور خالص کرے کہ اس کے اندر کوئی کھوٹ باقی نہ رہے اور وہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کا مکمل عاشق ہو جائے۔

۱۱۔ ادب: یعنی اللہ تعالیٰ، رسولؐ اکرم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بارگاہ کے ادب کو ملحوظ رکھے اور زبان پر ذرا بھی حرف اعتراض نہ آئے۔ ان کے احترام کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، یہاں تک کہ دعا میں ایسے الفاظ بھی استعمال نہ کرے جو امر و نہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

۱۲۔ نیت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیر و سلوک کے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے کا قصد کرے۔

۱۳۔ صمت: صمت خاموشی کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کرے اور صرف ضروری گفتگو پر اکتفا کرے۔

۱۴۔ جوع: یعنی بھوکا رہنا اور کم کھانا۔ یہ بھی سیر و سلوک کی اہم شرائط میں سے ہے لیکن اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس میں اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ کمزوری پیدا ہو جائے۔

۱۵۔ خلوت یعنی تنہائی: اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہگاروں، دنیا پرستوں اور کم عقل لوگوں سے دور رہے اور عبادت اور ذکر کے وقت ہجوم اور شور و غوغا سے دور رہے۔

۱۶۔ شب بیداری: (خاص طور پر رات کے آخری حصے میں)، اس طرف قرآن شریف اور احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ دوامِ طہارت: یعنی ہمیشہ باوضو رہنا کیونکہ اس سے انسان کے باطن میں ایک خاص نور پیدا ہوتا ہے۔

۱۸۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی: یہ جس قدر زیادہ ہو، اتنی ہی کم ہے۔

۱۹۔ خواہشات نفسانی سے، خواہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہوں، پرہیز کرنا۔

۲۰۔ رازداری: یہ سیر و سلوک کی سب سے اہم شرائط میں سے ہے اور اس راہ کے اساتذہ اس پر بہت تاکید کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادات اور اپنے لائحہ عمل کو پوشیدہ رکھے (تاکہ اس کے اندر ذرا بھی نمود و نمائش اور ریاکاری کا پہلو پیدا نہ ہو)۔ اسی طرح اگر عالم غیب سے کچھ حقائق اس پر منکشف ہوں تو انہیں بھی پوشیدہ رکھے اور کسی سے بیان نہ کرے (تاکہ عجب اور خود پسندی کا شکار نہ ہو جائے)۔

۲۱۔ استاد اور مربی کا ہونا: خواہ عام استاد اور مربی ہوں جن کی رہنمائی میں سیر و سلوک کے مراحل طے کرے یا خاص استاد اور مربی، جو کہ رسول اللہؐ اور آئمہ معصومینؑ ہیں۔

البتہ اس سلسلہ میں اس طرف دھیان رہے کہ استاد اور مربی کا انتخاب انتہائی احتیاط سے کیا جائے۔ جب تک کسی کی علمی اور دینی صلاحیت کو آزما نہ لے، اس کی ہدایت پر بھروسہ نہ کرے کیونکہ بعض اوقات شیاطین بھی استاد کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں یعنی بھیڑیئے گڈریے کا روپ دھار لیتے ہیں اور سالک کو گمراہ کر دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: ''حتی کہ غیر معمولی چیزوں کا ظاہر ہونا، انسان کے باطن کی خبر دینا، پانی اور آگ پر چلنا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا بھی ہمیں یہ اطمینان نہیں دے سکتے کہ ان اعمال کا انجام دینے والا سیر و سلوک میں کوئی مقام یا پیش رفت حاصل کر چکا ہے، اس لیے کہ یہ سب باتیں روحانی مکاشفہ کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتی ہیں جبکہ اس منزل سے منزل یقین تک کا راستہ بہت طویل ہے۔

۲۲۔ ورد: اس سے مراد وہ زبانی اذکار ہیں جو سالک کے لیے راستہ کھولتے چلے جاتے ہیں اور دشوار راستوں سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

۲۳۔ نفی خواطر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے دل کو مسخر کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ اس کی سوچوں کا مرکز (concentration) اس طرح ہو کہ اسکے ارادہ و اختیار کے بغیر کوئی خیال اس کے دل میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

۲۴۔ فکر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک معرفت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے صحیح اور گہرے غور و فکر کا مالک ہو اور اس کا تمام غور و فکر اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور افعال و تجلیات ہوں۔

۲۵۔ ذکر: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف قلبی توجہ ہے۔ یہ ورد سے الگ چیز ہے۔ ورد کا تعلق لفظ اور زبان سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک کی ساری نظر اللہ تعالیٰ کے جمال پر مرکوز ہو اور وہ غیر اللہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔

یہ تھا رسالہ سیر و سلوک کا خلاصہ جو کہ علامہ بحر العلوم کی طرف منسوب ہے۔ علامہ طباطبائی نے بھی معمولی فرق کے ساتھ رسالہ ''لب اللباب'' میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ

مرحوم حاج میرزا جواد آقا تبریزی کا شمار سیر و سلوک کے بلند مرتبہ اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ سیر و سلوک میں جو روش اختیار کی ہے وہ بعض جہات سے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سے مختلف ہے۔

موصوف قرآن شریف کی مختلف آیات اور بہت سی احادیث کی روشنی میں لقاء اللہ کو سیر و سلوک کا مقصد اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ لقاء اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاکیزہ اور منزہ ہے کہ اسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ اسی طرح لقاء اللہ سے مراد قیامت کے دن ثواب اور نعمتوں سے ملاقات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک قسم کا قلبی شہود ہے جس میں سالک دل کی آنکھ سے قلبی اور روحانی مشاہدہ کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ اس طویل اور نشیب و فراز سے بھرپور راستے کو طے کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ اس راہ کو طے کرنے کی پختہ نیت۔

۲۔ گزشتہ اعمال سے صحیح توبہ کرنا، ایسی توبہ جو انسان کے وجود کی گہرائی اور اس کے اعمال پر اثر انداز ہو اور اسے اس طرح بدل ڈالے کہ گناہ کے اثرات اس کے جسم و جان سے زائل ہو جائیں۔

۳۔ صراطِ مستقیم کے لیے توشۂ سفر اختیار کرنا: اس کے لیے وہ چند لائحہ ہائے عمل تجویز کرتے ہیں:

الف۔ صبح کے وقت مشارطہ: (یعنی اپنے آپ سے شرط کرے کہ حق کے سوا کسی راہ پر نہیں چلے گا)۔

دن بھر مراقبہ: (یعنی سارا دن اپنے آپ پر کڑی نظر رکھے کہ راہ حق سے منحرف نہ ہو جائے)۔

شام کو محاسبہ: (یعنی اس طرف توجہ کرنا کہ دن بھر کیا کرتا رہا ہے)۔

ب۔ اوراد و اذکار کی طرف توجہ اور بیداری اور سونے کے وقت کے اعمال کی طرف توجہ۔

ج۔ نماز شب کی طرف توجہ اور رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز اور یہ کہ نیند اور غذا کی ریاضت میں غیر ضروری زیادہ روی سے پرہیز کرے۔

د۔ تازیانہ سلوک کا استعمال: اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی طرف توجہ کرنے اور حق کے بارے میں کسی قسم کی کوتاہی پر اپنا مواخذہ کرنا، اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا اور اپنے پیمان سے بیوفائی اور شیطان کی پیروی پر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی سرزنش کرنا اور اخلاص کی راہ پر چلنے میں مسلسل جدوجہد کرنا۔

۴۔ تبدیلی کا آغاز: اس مرحلہ میں سالک ہر چیز سے قبل زندگی کے خاتمہ اور موت کے بارے میں غور وفکر کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بارے میں غور وفکر حب دنیا کو جلا کر خاکستر کر دینے اور بری صفات کی اصلاح کے لیے بہت موثر ہتھیار ہے۔ (اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے اسماء وصفات کے بارے میں غورروفکر کرے اور اولیائے حق کو یاد رکھے اور کوشش کرے کہ اپنے آپ کو ان کی صفات سے نزدیک کرے)۔

۵۔ منزل کے قریب: اس مرحلہ پر وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کے تین عالم ہیں:

۱۔ عالم حس وطبیعت ۲۔ عالم خیال ومثال ۳۔ عالم عقل وحقیقت

عالم حس وطبیعت صرف اور صرف تاریکی اور ظلمت ہے۔ جب تک آدمی اس عالم سے عبور کر کے آگے نہ بڑھ جائے تو وہ عالم مثال میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ عالم مثال کے حقائق شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں اور مادہ سے آزاد معلوم نہیں ہوتے۔

جب تک سالک عالم مثال سے عبور نہ کر لے، وہ عالم عقل میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس عالم سے مراد وہ عالم ہے جس میں حقیقت اور نفس انسانی کی کوئی صورت اور مادہ نہیں ہوتا۔ جب سالک عالم عقل میں داخل ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو مادہ اور صورت کے بغیر دیکھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت عطا ہوتی ہے اور وہ "من عرف نفسه فقد عرف ربه" کا مصداق بن جاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مرحوم ملکی تبریزی کا رسالہ ''لقاء اللہ'' مطالعہ فرمائیں)۔

ایک اور طریقہ

آقائے حسن مصطفوی نے، جو ایک بلند پایہ عالم اور محقق ہیں، اپنے رسالہ ''لقاء اللہ'' میں سیر وسلوک الہی کے لیے ایک اور لائحہ عمل کا ذکر فرمایا ہے۔

وہ اس جامع رسالہ میں، جو کہ آیات واحادیث پر مبنی ہے، پہلے لقاء اللہ کے بارے میں آیات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کی تفسیر میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ سے روحانی اور معنوی ملاقات ہے۔ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس منزل مقصود کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کی مادی حدود، زمان ومکان کی حدود، یہاں تک کہ ذاتی حدود کو توڑ کر عالم لاہوت میں فنا ہوجائے اور اس آیت کا مصداق بن جائے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

''اے مطمئن روح! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔'' (فجر: ۲۷ تا ۳۰)

اس کے بعد وہ اس عظیم منزل تک پہنچنے کے لیے پانچ مراحل کو طے کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

۱۔ عقائد کی تکمیل اور مضبوطی اور اصولِ دین کی طرف خاص توجہ۔

۲۔ توبہ کے ذریعے گناہوں، اعمال صالح کی طرف واپسی (گناہوں سے پرہیز) اور واجبات کی انجام دہی۔

۳۔ نفس کو رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرنے کے لیے تیار ہونا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی انانیت کو مٹا دینا اور اس کی عظمت کے سامنے فنا ہوجانا۔

اس مرحلہ میں مادی زندگی سے تعلق برطرف ہوجاتا ہے۔ مال، اولاد اور مادی لذتوں سے تعلق، روحانی اور معنوی تعلق میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف ایک تعلق باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے سالک کا اپنی ذات سے تعلق۔ یہ تعلق اس قدر گہرا اور مضبوط ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ شدتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔ یہاں پر ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں تک سالک نے جو بھی مراحل طے کیے، وہ اپنی ذات کے لیے کیے۔ بالفاظ دیگر وہ ''خود'' کو لقاء اللہ کی منزل تک لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خود اعلیٰ مقامات تک پہنچنا چاہتا تھا، بارگاہِ خدا کے مقربین میں شامل ہونا چاہتا تھا اور ان معنوی کمالات کے حصول کا خواہش مند تھا۔ یعنی وہ ہر مقام پر اپنے بارے میں سوچتا تھا نہ کہ ہدف کے بارے میں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی معنوی مقام پر پہنچتا تو اسے خوشی محسوس ہوتی تھی لیکن اگر کوئی اور اس مقام پر پہنچتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ یہاں سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ اب ساری توجہ اسی ''میں'' (خود پسندی) کی طرف مبذول کی جائے تاکہ سالک کی ساری توجہ ظہور جلوۂ حق کی طرف ہو جو اس کی اپنی ذات کے ساتھ مشروط اور مقید نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ''میں''، یعنی خود پسندی کا خاتمہ ہونا ضروری ہے تاکہ لقاء اللہ کی منزل تک پہنچنے کا یہ آخری حجاب برطرف ہوجائے۔

اس حجاب کو برطرف کرنے کے کئی طریقے ہیں:

الف۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی اور توحید صفاتی کی طرف قلبی توجہ: اس توجہ سے سالک پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

سامنے غیر اللہ کی حقیقت ہیچ ہے۔

ب۔ انانیت اور حجاب نفس کو برطرف کرنے کے لیے فکر واستدلال کا راستہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اللہ تعالیٰ کو ایک لامحدود، ازلی وابدی وجود کے طور پر دیکھتا ہے جو کہ حی مطلق ہے جبکہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے محدود، انتہائی عاجز وناتواں اور سراپا فقر واحتیاج پاتا ہے۔ ایسا محتاج اور فقیر جو ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ کے وجود کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔

ج۔ علاج بالاضداد: اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقام پر اپنے آپ کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے صالح بندوں کے بارے میں غور وفکر کرے اور اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرے۔

۵۔ اس مرحلہ میں سالک ایک ملکوتی انسان بن کر عالم جبروت میں داخل ہو جاتا ہے۔ عالم جبروت میں داخل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کمال خلوص وصفا کی وجہ سے اور نور الٰہی سے محو ہونے کی وجہ سے ایک اثر ورسوخ حاصل کر لیتا ہے اور الٰہی فرائض کو انجام دینے کے لیے، لوگوں کی ہدایت اور امر بالمعروف ونہی از منکر کے لیے مکمل معرفت کی بنیاد پر قدم اٹھاتا ہے۔

بالفاظ دیگر وہ کافی حد تک اپنی فکر سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے اور تمام مسائل، احکام، فرائض اور آداب شریعت اور علاج میں مہارت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے علامہ حسن مصطفوی کی کتاب ''لقاء اللہ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں ہر جگہ آیات اور احادیث سے اپنی بات کو ثابت کیا ہے۔

مکاتب سیر وسلوک کا خلاصہ اور نتیجہ

علمائے سیر وسلوک اور اس راہ پر چلنے والوں کی تعلیمات سے، جن کے نمونے پیچھے صفحات میں بیان ہو چکے ہیں، مندرجہ ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

۱۔ سیر وسلوک کا حقیقی مقصد لقاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا چشم ودل سے شہود اور اس کی بارگاہِ مقدس میں روحانی اور معنوی طور پر حاضر ہونا ہے۔

۲۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان تمام گناہوں سے توبہ کرے، اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔

۳۔ اس راہ میں آداب اربعہ یعنی مشارطہ، مراقبہ، محاسبہ اور مواخذہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی صبح کے وقت انسان یہ طے کرلے کہ دن بھر گناہ کے قریب نہیں جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں دے گا۔ پھر دن بھر اپنے سرکش نفس پر کڑی نظر رکھے۔ رات کو سونے سے قبل دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لے اور اپنا محاسبہ کرے۔ اگر محاسبہ

کے دوران ثابت ہو کہ اس سے کوئی غلط کام سرزد ہوا ہے تو بعض لذتوں کو ترک کر کے نفس کو سزا دے۔

۴۔ ہوائے نفس کے ساتھ جنگ کرنا، اس لیے کہ یہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ترین واجبات میں سے ہے۔

۵۔ شرع مقدس میں وارد ہونے والے اذکار و اوراد کی طرف توجہ کرنا جیسے "لاحول و لاقوۃ الا باللہ" اور "لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین"، اسی طرح "یا اللہ"، "یا حی" اور "یاقیوم" یہ اور ایسے اذکار اس راہ پر چلنے کی قوت کا سبب بنتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال کی طرف قلبی توجہ کرنا اور اس کی صفات کمال و جلال میں غرق ہو جانا۔ یہ بھی اس راہ پر نشیب و فراز کو طے کرنے کا ایک موثر توشہ وسامان ہے۔

۷۔ انانیت کے بت کو توڑنا جو سب سے بڑا بت ہے، یہ اس مقصد تک پہنچنے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔

۸۔ ایسے استاد اور مربی کے زیر سرپرستی کام کرنا جس کی حیثیت ایک طبیب کی سی ہوتی ہے اور جو بیمار کا علاج کرتا ہے۔

اگرچہ بعض علماء نے اسے سیر و سلوک کی شرط قرار دیا ہے جبکہ بعض اس پر خاص اصرار نہیں کرتے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے شیاطین کے خطرناک جال میں پھنس جاتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک فرشتہ کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پیروی میں لوگ اپنے دین، دنیا اور ایمان واخلاق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بعض علماء نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے کام کو اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کو، جو انبیاء و اولیا کا کام ہے، سیر و سلوک کے آخری مرحلہ پر قرار دیا ہے جبکہ بعض نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا اور اسے سالک کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

اس کتاب میں ان مباحث کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے:

۱۔ ان افکار و نظریات کا خلاصہ پیش کرنا جو کہ بہر حال اخلاقی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں تا کہ اس کتاب کے قارئین زیادہ آگہی اور بصیرت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی راہ پر قدم اٹھا سکیں۔

۲۔ اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرنا کہ حق اور باطل کے درمیان فرق بہت لطیف ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پاک دل نوجوان آب بقا تک پہنچنے کی امید میں اس وادی میں قدم رکھتے ہیں لیکن عقل و شریعت سے منحرف ہو کر کفر و ضلالت کی گھاٹیوں میں گر جاتے ہیں اور رہبر نمار ہزنوں کے ہتھے چڑھ کر اپنا سب کچھ برباد کر دیتے ہیں۔

دسواں باب

کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

سیر وسلوک کے بہت سے علماء کا عقیدہ ہے کہ کمال وفضیلت، تقویٰ واخلاق اور قرب الی اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی استاد کی سرپرستی میں عمل کریں۔ گزشتہ صفحات میں رسالہ سیر وسلوک، منسوب بہ بحرالعلوم اور مرحوم علامہ طباطبائی کے رسالہ ''لب اللباب' کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بیان کیا کہ ان دونوں کتابوں کی فصل ۲۱ میں استاد اور مربی کی سرپرستی میں عمل کرنے کو سالک کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، خواہ یہ اساتیدِ خاصہ یعنی انبیاء اور آئمہ معصومین علیہم السلام ہوں یا عام اساتذہ جو اس راہ پر چلنے والی شخصیات ہیں۔

لیکن اس فن کے صاحب نظر افراد خبردار کرتے ہیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس کی راہ پر چلنے والوں کو چاہیے کہ بآسانی اپنے آپ کو ہر کس وناکس کی سرپرستی میں نہ دیں بلکہ انہیں چاہیے کہ جب تک ان کی علمی اور دینی صلاحیت کو اچھی طرح پرکھ نہ لیں، کسی کی سرپرستی کو قبول نہ کریں۔ یہاں تک کہ غیر معمولی کام انجام دینا، پوشیدہ امور کی خبریں دینا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا حتی کہ پانی اور آگ کے اوپر سے گزرنا بھی کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ غیر مہذب جوگی وغیرہ بھی اس قسم کے کام انجام دے سکتے ہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیر وسلوک کے آغاز میں استاد کی سرپرستی میں عمل کرنا ضروری ہے لیکن جب اس سلسلہ میں قابل ذکر پیش رفت حاصل ہو جائے تو استاد اور سرپرست کی ہمراہی ضروری نہیں رہتی مگر یہ بات یقینی ہے کہ استادِ خاص یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے کسب فیض ہر مرحلہ پر لازم ہے۔

استاد اور مربی کی ضرورت کے اثبات کے لیے بعض اوقات سورۂ انبیاء کی آیت ۷ سے استدلال کیا جاتا ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

''اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔''

لیکن یہ آیت تعلیم کے بارے میں ہے، نہ کہ تربیت کے بارے میں۔ لیکن چونکہ بہت سے مقامات پر تربیت کی بنیاد تعلیم پر ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مقامات پر علماء سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس میں اور کسی خاص فرد کو اپنے اعمال اور اخلاق کا سرپرست اور نگہبان بنانے میں واضح فرق ہے۔

بعض اوقات اس مؤقف پر حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے جو قرآن شریف میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اولوالعزم نبی ہونے کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام سے بے

نیاز نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں:

طی این مرحله بی همرهی خضر مکن
ظلمات است بترس از خطر گمراهی
(اس مرحلہ کو خضر کی ہمراہی کے بغیر طے نہ کرو
تاریکیاں بہت ہیں، گمراہی کے خطرے سے ڈرو)

لیکن اگر داستانِ موسی وخضر میں غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے حضرت خضر کی شاگردی اختیار کی تھی جس کا مقصد کائنات میں ہونے والے مختلف حوادث کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار کا علم حاصل کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم، علم ظاہر تھا جس کا تعلق ظاہری اعمال وفرائض سے تھا جبکہ حضرت خضر کا علم، علم باطن تھا اوراس کا دائرہ کار ظاہری اعمال وفرائض سے بالاتر تھا۔[۱]

اس داستان میں اگرچہ استاد کے حضور سے کسب فضائل کی اہمیت کی طرف اجمالی اشارہ ملتا ہے لیکن اس میں اورتمام مراحل تہذیب نفس میں ایک خاص استاد کا انتخاب کرنے میں فرق ہے۔

اس مسئلہ پر لقمان اوران کے بیٹے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس الٰہی استاد نے اپنے بیٹے کے اخلاق کی سرپرستی کی اور منزل کمال تک پہنچنے کی راہ طے کرنے میں[۲] اس کی مدد کی۔

علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

هلك من ليس له حكيم يرشده

''جس کو کوئی ہدایت کرنے والا حکیم نہ ملے، وہ ہلاک ہو گیا۔'' (بحارالانوار، ۷۵:۱۵۹)

لیکن ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اخلاقی مباحث میں ہمیشہ مخصوص استاد کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر وہ نہ ہو تو اخلاق، تقویٰ، تربیت نفس اور سیر وسلوک درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو آیات واحادیث سے استفادہ کرتے ہوئے اور کتب اخلاق میں بزرگوں کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اس راہ کو طے کر کے اعلیٰ مقامات تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مخصوص استاد کا ہونا اور پاکیزہ ومقدس افراد کے انفاس قدسیہ سے مدد لینا، راہِ کمال کو کم از کم مدت میں طے کرنے اور اخلاقی مشکلات کو حل کرنے کا اچھا ذریعہ ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

---

[۱] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، سورۂ کہف کی آیات ۶۰ تا ۸۲ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیے۔

[۲] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۷ کی طرف رجوع فرمائیے۔

ایھا الناس استصبحوا من شعلۃ مصباح واعظ متعظ

''اے لوگو! اپنے دل کے چراغ کو کسی باعمل واعظ کی نصیحت کے شعلے سے روشن کرو۔'' (خطبہ، ۱۰۵)

لیکن بدقسمتی سے بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں استاد کے وجود سے الٹے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو مربی اور مرشد کے طور پر متعارف کروایا، حالانکہ وہ رہبر نہیں بلکہ رہزن تھے اور پاک دل افراد کو تصوف کی راہ یا کسی اور گمراہی کی طرف لے گئے یا شرمناک اخلاقی برائیوں کی طرف لے گئے۔ اسی لیے ہم اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرتے ہیں کہ اگر وہ اخلاقی مسائل میں استاد کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو بہت احتیاط سے کام لیں اور اپنے انتخاب میں سخت گیری اور باریک بینی سے کام لیں۔ کبھی بھی ظاہر کا دھوکا نہ کھائیں بلکہ افراد کی سابقہ کارکردگی کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اہل علم کے مشورے سے کسی استاد اور مربی کا انتخاب کریں تاکہ اپنے مقصد کو پا سکیں۔

واعظ درونی کا کردار

بیرونی واعظ کے بارے میں کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ اب واعظ درونی کے بارے میں گفتگو کی باری ہے۔ بعض احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کا بیدار ضمیر جسے واعظ درونی کا نام دیا گیا ہے، اخلاق وتقویٰ کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ اس کے بغیر اس راہ کو طے کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ابن آدم انك لا تزال بخير ما كان لك واعظ من نفسك، وما كانت المحاسبة من همك

''اے فرزند آدم! جب تک تمہارے پاس واعظ درونی موجود ہو اور جب تک خود احتسابی تمہارا سب سے اہم کام ہو، تم ہمیشہ خیر اور نیکی کی راہ پر رہو گے۔'' (بحار الانوار، ۷۵، ۱۳۷)

معمولی سے فرق کے ساتھ آپؑ سے ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہوئی ہے۔ (بحار الانوار، ۷۵: ۱۴۷)

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

واعلموا انه من لم يعن على نفسه حتى يكون له منها واعظ وزاجر، لم يكن له من غيرها لا زاجر ولا واعظ

''خوب جان لو کہ جب تک کوئی خود اپنی مدد نہ کرے اور اس کے اندر واعظ اور منع کرنے والا موجود نہ ہو، دوسروں کی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔'' (خطبہ: ۹۰)

واضح سی بات ہے کہ اس راہ میں انسان کو ایک ایسے واعظ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہو، اس کے اندر کے رازوں سے باخبر ہو اور ہر وقت اس کی نگرانی کرے۔ واعظ درونی یعنی بیدار ضمیر کے سوا یہ کام کون کرسکتا ہے! یہی وہ واعظ ہے جو ارتکاب گناہ و خطا کے بعد اولین فرصت میں انسان کو سرزنش کرتا ہے اور اخلاقی انحطاط کی پستی میں گرنے سے باز رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اجعل من نفسك على نفسك رقيبا

''اپنے اندر میں سے اپنے اوپر ایک نگران مقرر کرو۔'' (غرر الحکم)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے ہی مروی ہے:

ينبغى ان يكون الرجل مهيمنا على نفسه مراقبا قلبه، حافظا لسانه

''ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس پر مسلط ہو، اپنے قلب کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔'' (غرر الحکم)

گیارھواں باب

اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری

تہذیب اخلاق میں ترقی اور پیش رفت کے بارے میں اب تک جن چیزوں کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی کئی اور عوامل ہیں جو رذائل اخلاقی کے خلاف جہاد اور فضائل اخلاقی کی تقویت کے لیے بہت موثر ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ماحول کی پاکیزگی

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان کا معاشرتی ماحول اس کے باطن اور اس کے اعمال پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ انسان بہت سی صفات اپنے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ پاکیزہ ماحول میں عام طور پر پاکیزہ افراد پروان چڑھتے ہیں اور آلودہ ماحول میں آلودہ افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسان ناپاک ماحول میں پاکیزہ زندگی گزار سکتا ہے اور اس کے برعکس پاکیزہ ماحول میں انسان ناپاک زندگی بھی گزار سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ماحول افراد کی خوبی یا بدی کی علت تامہ نہیں ہے لیکن ایک اہم عامل کے طور پر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے بعض لوگ ماحول کے جبر کے قائل ہوں۔ ہم اگر چہ ماحول کے جبر کے قائل نہیں ہیں لیکن موثر عوامل کی قوی تاثیر کا انکار ہرگز نہیں کرتے۔

اس مختصر اشارہ کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں جو انسان کی شخصیت پر ماحول کے اثر کے بارے میں دلالت مطابقی یا دلالت التزامی کے انداز میں گفتگو کر رہی ہیں:

۱۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

''پاکیزہ زمین کے عمدہ نباتات اس کے رب کے حکم سے اگتے ہیں جبکہ ناپاک زمین سے ناکارہ پودے اگتے ہیں۔ ہم اپنے دلائل کو اسی طرح شکر گزار لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔'' (اعراف:۵۸)

۲۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾

''اور ہم بنی اسرائیل کو دریا کے پار لے گئے۔ پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کی عبادت کر رہی تھی تو وہ کہنے لگ کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک ایسا خدا بنا دو جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے کہا: تم جاہل لوگ ہو۔'' (اعراف:۱۳۸)

۳۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾

''نوحؑ نے کہا: اے میرے رب! روئے زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ، اس لیے کہ اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو فاجروں اور کافروں کو ہی جنم دیں گے۔'' (نوح:۲۷۔۲۸)

۴۔ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِنَّ أَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے، پس تم صرف میری عبادت کرو (اور دشمنوں کے دباؤ کے آگے نہ جھکو)۔'' (عنکبوت:۵۶)

۵۔ إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ (مسلمان ہونے کے باوجود کیوں کفار جیسے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کہیں ہجرت کر جاتے (ان کے پاس کوئی بہانہ نہ ہوگا) اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ان کا کیا ہی انجام ہے۔'' (نساء:۹۷)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں انسان کے اعمال و افعال پر ماحول کے اثر کو لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں علمائے تفسیر نے مختلف قسم کے مطالب بیان کیے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وحی کا صاف اور خوشگوار پانی بارش کے قطروں کی طرح دل کی سرزمین پر برستا ہے۔ پاکیزہ دل اسے قبول کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں معرفت کے حسین پھول اور تقویٰ کے لذیذ پھل اس میں اگنے لگتے ہیں جبکہ ناپاک دلوں پر اس کا مناسب اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگوں پر انبیاء کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کا ایک جیسا اثر

نہیں ہوتا تو اس کی وجہ فاعلیت کا نقص نہیں بلکہ قابلیت میں نقص ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس مثال کا مقصد یہ بات سمجھانا ہے کہ ہمیشہ نیکی اور برائی کی جستجو اس کی مناسب جگہ سے کرنی چاہیے، اس لیے کہ نامناسب جگہ پر جستجو کا نتیجہ توانائی کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس آیت کے بارے میں تیسرا احتمال بھی موجود ہے جو ہماری بحث میں مفید واقع ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو نباتات اوران کے ماحول کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برائی سے آلودہ ماحول میں پاکیزہ انسانوں کی پرورش مشکل ہے، خواہ تعلیمات کتنی ہی طاقتور اور موثر ہوں۔ جس طرح بارش کے قطروں کے بری زمین میں برسنے سے خوبصورت پودے نہیں اگتے، لہٰذا تہذیب نفس اور اخلاق صالح کی پختگی کے لیے ماحول کی اصلاح کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

البتہ مندرجہ بالا تینوں مطالب کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ تینوں باتیں اس تمثیل کے پیش نظر ہوں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ برائی سے آلودہ معاشرتی ماحول اخلاقی فضائل کا دشمن ہوتا ہے جبکہ پاکیزہ ماحول تہذیب وتزکیہ نفس کے لیے بہترین اور مناسب ترین حالات فراہم کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

ایاکم وخضراء الدمن، قیل یارسول الله و من خضراء الدمن قال: المرائة الحسناء فی منبت السوء

''کوڑے کے ڈھیر پر اگنے والے خوبصورت پودوں سے اجتناب کرو۔ صحابہ نے کہا: یارسولؐ اللہ! آپ کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ آپؐ نے فرمایا: برے ماحول میں پرورش پانے والی حسین عورت۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۴:۱۹، بحارالانوار، ۱۰۰:۲۳۲)

یہ تشبیہ انسان کی شخصیت پر اچھے یا برے ماحول کی تاثیر اور مسئلہ وراثت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔

دوسری آیت میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے جو مسلسل کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی اور معنوی تعلیمات اور توحید و دیگر اسلامی عقائد کے ماحول میں رہتے رہے۔ انہوں نے دریا کے پھٹ جانے، فرعون کے چنگل سے آزادی پانے اور اس قسم کے دیگر کئی معجزے بھی دیکھے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھا تو ان سے متاثر ہو گئے اور کہنے لگے:

''اے موسیٰ! ہمیں بھی ان کے خداؤں جیسا ایک خدا بنا دو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس بات سے سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی تم جاہل اور نادان قوم ہو۔ پھر انہوں نے بت پرستی کی برائیاں ان کے لیے بیان کیں۔

حیرت کی بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حقائق کی واضح تشریح کے باوجود اس ماحول کا منفی اور زہریلا اثر

ان کے اندر باقی رہ گیا اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طلائی بت بنا لیا اور ان جاہلوں کی اکثریت کو اپنے پیچھے لگا کر توحید سے گمراہ کر کے شرک کی راہ پر لے آیا۔

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بگڑا ہوا ماحول اخلاقی مسائل، حتی کہ اعتقادی مسائل پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے عرصہ دراز تک مصر کے بت پرستوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں اس قسم کے فکری رجحانات پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے بت پرستی کا منظر دیکھا تو ان کے ان رجحانات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ بہر حال یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماحول انسان کے افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔

تیسری آیت حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی بت پرست قوم کے خلاف بددعا کے ذکر پر مشتمل ہے جو اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ ماحول انسان کے اخلاق و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بددعا کے اختتام پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ:

''یا اللہ! اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو یہ فاجروں اور کافروں کے سوا کسی کو جنم نہیں دیں گے۔''

یعنی یہ لوگ خود تو کافر اور گمراہ ہیں ہی مگر ان کے بنائے ہوئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ نسلیں بھی فاجر اور کافر ہی بنیں گی۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں برائی سے آلودہ ماحول سے ہجرت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ میری زمین بہت وسیع ہے اور تم صرف میری ہی بندگی کرو (اور کفر و شرک سے آلودہ ماحول میں دشمنوں کے دباؤ کے سامنے نہ جھکو)۔

پانچویں آیت میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ انہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ آیت یہ کہہ رہی ہے:

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ (مسلمان ہوتے ہوئے تم کفار کی صف میں کیوں کھڑے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں سخت دباؤ میں تھے، فرشتے ان سے کہیں گے کہ اللہ کی زمین اتنی وسیع تھی تو تم نے ہجرت کیوں نہ کی؟ (ان کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا اور وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے)۔''

ہجرت کا مسئلہ اسلام کے بنیادی ترین مسائل میں سے ہے، یہاں تک کہ اسلام کی تاریخ کی بنیاد بھی ہجرت کو ہی قرار دیا گیا ہے۔ ہجرت میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان برائی سے آلودہ ماحول اور اس کے منفی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کے نادرست تصور کے خلاف ہجرت صرف ابتدائے اسلام کے دور سے مختص نہ تھی بلکہ جب بھی اور جہاں بھی مسلمان یہ محسوس کریں کہ کفر و شرک اور گناہ سے آلودہ ماحول میں رہنے سے ان کے عقائد و اخلاق کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو ان پر

واجب ہے کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ایک حدیث میں رسول اللہ کا ارشاد ہے:

من فر بدينه من ارض الى ارض و ان كان شبرا من الارض استوجب الجنة و كان رفيق محمد (ص) و ابراهيم

''اگر کوئی اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے، خواہ ایک بالشت کے فاصلہ پر، تو وہ جنت کا حقدار بن جاتا ہے اور وہ محمد و ابراہیم علیہما السلام کا ہم نشین ہوگا۔''

(نور الثقلین، ۱:۱ ۵۴)

ایک بالشت کی مقدار کا ذکر اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کوئی شخص ہجرت کرے گا، اس میں رسول اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شباہت پیدا ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ ہر دور میں، معاشرتی ماحول انسان کو بنانے اور بگاڑنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔اگر چہ اس میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔بنابریں اخلاق کی پاکیزگی اور ملکات فاضلہ کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی پر توجہ دینا اس سلسلہ کے اہم ترین امور میں سے ایک ہے۔

اگر ماحول اس قدر خراب ہو چکا ہو کہ اس کو ٹھیک کرنا ممکن نہ ہو تو ایسے ماحول سے ہجرت کرنا ضروری ہے۔جب کسی انسان کا دنیوی اور مادی مستقبل خطرے میں ہو تو وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے لیکن جب اس کا معنوی، مذہبی اور اخلاقی مستقبل خطرے میں ہو تو وہ ہجرت نہیں کرتا اور اس کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ اپنے وطن کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو ان برائیوں سے آلودہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

تمام علمائے اخلاق پر لازم ہے کہ اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی کے لیے منصوبہ بندی کریں کیونکہ اس کے بغیر کی جانے والی تمام کوششیں بے اثر نہیں تو کم اثر ضرور ہو جائیں گی۔

۲۔صحبت کا اثر

ایک اور عامل جس کی تاثیر تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور علمائے علم اخلاق و ماہرین تعلیم و تربیت بھی اس پر متفق ہیں، صحبت اور دوستی کا مسئلہ ہے۔عام طور پر دوست اور ساتھی پاکیزہ افراد کے آلودہ ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس پاکیزہ افراد بھی اپنے مضبوط ارادے کی بدولت ناپاک افراد کو پاکیزگی اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔اس مختصر اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝۳۶ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۷ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ

بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿٣٨﴾

''جو کوئی رحمٰن کے ذکر سے منہ موڑے گا، ہم شیطان کو اس کے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) ایسے لوگوں کو اللہ کی یاد سے روک دیتے ہیں جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔ جب قیامت کے دن وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو کہیں گے کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب جیسا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین تھا۔''

(زخرف:۳۶، ۳۷، ۳۸)

۲۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿٥١﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿٥٢﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٥٧﴾

''ان میں سے ایک کہے گا کہ میرا ایک دوست تھا جو یہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو بھی اس بات کو سچ سمجھتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں جزا دی جائے گی۔ کیا تم اس کی خبر لینا چاہتے ہو، یہاں سے جہاں تم دیکھ رہے ہو، پھر اچانک وہ اسے جہنم میں دیکھے گا تو کہے گا اللہ کی قسم! تو تو مجھے ہلاک کرنے والا تھا۔ اگر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی اس وقت جہنم میں ہوتا۔'' (صافات:۵۱ تا ۵۷)

۳۔ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

''جس دن ظالم حسرت کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ کاش میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے مجھے اللہ کی یاد سے روک دیا حالانکہ اللہ کی یاد میرے پاس آ چکی تھی۔ شیطان ہمیشہ ہی انسان کو ذلیل کرتا ہے۔''

(فرقان:۲۷، ۲۸، ۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت اگرچہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہونے کی وجہ سے شیطان کی ہم نشینی میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔لیکن یہ آیت انسان کے اخلاق اور انجام پر، بری صحبت کے اثرات کو واضح کرتی ہے۔

ابتداء میں یہ آیت کہتی ہے:

''جو کوئی اللہ کی یاد سے روگردانی کرے گا، ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیں گے جو ہمیشہ اس کے ساتھ اور اس کا ہم نشین بن کر رہے گا۔''

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝٣٦

اس کے بعد اس برے ہم نشین کے کردار کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ شیاطین اللہ کی طرف جانے کا راستہ ان پر بند کر دیتے ہیں اور انہیں اس مقدس مقصد کی طرف بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ان سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ گمراہ لوگ، گمراہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں:

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝٣٧

پھر اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتی ہے: ''قیامت کے دن جب سب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، پردے ہٹ جائیں گے اور حقائق آشکار ہوجائیں گے تو وہ کہے گا کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب جتنا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین ہے۔''

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝٣٨

ان بیانات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ برے ساتھی انسان کو مکمل طور پر اللہ کی راہ سے منحرف کرسکتے ہیں۔یہ اس کے اخلاق کی بنیادوں کو تباہ کرسکتے ہیں اور حقائق کو اس طرح ان کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ عین گمراہی میں ہوتے ہوئے خود کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کی یہ حالت ہوجائے تو صراطِ مستقیم کی طرف اس کی واپسی ناممکن ہوجاتی ہے اور وہ اس وقت بیدار ہوتا ہے جب سارے راستے اس پر بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برا ہم نشین آخرت میں بھی اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ جو شخص انسان کی ہلاکت کا سبب بنا ہو، وہ ہر وقت اس کے ساتھ موجود ہو اور اسے کہا جائے کہ اب تم اس سے جدا ہونے کی آرزو نہ کرو، تم سب کا انجام ایک ہے:

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝٣٩

''اور (ان سے کہا جائے گا کہ) جبکہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو آج یہ بات تمہارے کام نہ آئے

گی کہ (تم اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو۔'' (زخرف: ۳۹)

انہی آیات سے مشابہ سورۂ فصلت کی آیت ۲۵ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَٰسِرِينَ ﴿٢٥﴾

''ہم نے ان کے لیے برے ہم نشین مقرر کر دیئے جنہوں نے پیچھے سے اور آگے سے برائیوں کو آراستہ کر کے انہیں دکھایا۔ اللہ کا فرمان ان کے بارے میں وقوع پذیر ہوا اور اپنے سے پہلے جن وانس کے گمراہوں کے انجام سے دوچار ہو گئے، یقیناوہ خسارہ اٹھانے والے تھے۔''

دوسرے حصے کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے برے ہم نشین ہمیشہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اپنی کوشش کے نتیجہ میں ان کے دام سے بچ جاتے ہیں، حالانکہ وہ ہلاکت کی سرحدوں تک آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں بھی انسان کے عقائد واخلاق پر بری صحبت کے برے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ بری صحبت انسان کو برا بننے پر مجبور کر دے بلکہ ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش کے نتیجہ میں اپنے آپ کو بچا لے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ اہل بہشت اپنے ساتھیوں سے کہیں گے کہ دنیا میں میرا ایک دوست تھا جو مجھے یہ کہتا رہتا تھا کہ کیا تم بھی ان باتوں کو سچ جانتے ہو کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے؟ (لیکن اللہ کے فضل سے میں اس کی باتوں میں نہیں آیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا)۔ صافات، ۵۰ تا ۵۳

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ أَءِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ أَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَٰمًا أَءِنَّا لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾

اس موقع پر وہ اپنے اس پرانے اور نالائق دوست کی جستجو کرتا ہے اور جنت کی بلندی سے دوزخ کی طرف دیکھتا ہے تو اس کا وہ دوست جہنم میں غوطے کھاتا نظر آتا ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَءَاهُ فِي سَوَآءِ الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾

اسے دیکھ کر وہ اسے کہتا ہے کہ خدا کی قسم! تو مجھے ہلاک کر دینے والا تھا جس طرح تو خود ہلاک اور بدبخت ہو گیا ہے۔ اگر میرے رب کا فضل وکرم میرے شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی دوزخ میں ہوتا:

قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برا ساتھی انسان کو جہنم کے کنارے تک لے جاتا ہے۔ اگر انسان کا ایمان

پختہ نہ ہو، اس میں تقویٰ نہ ہو اور اللہ کا فضل وکرم اس کے شامل حال نہ ہو تو وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

آیات کے تیسرے گروہ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ظالم برے اور نالائق دوستوں کے انتخاب پر سخت افسوس کریں گے، اس لیے کہ ان پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ان کی بدبختی کی اصل وجہ ان کی یہی دوستی تھی۔ اس دن ظالم حسرت اور پشیمانی کی شدت سے اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کہ کاش! میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے اللہ کا ذکر میرے پاس آ جانے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو ذلیل کرنے والا ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ۭ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

اس طرح قیامت کے دن ظالم سب سے پہلے اس بات پر شدید پچھتاوے کا شکار ہوں گے کہ انہوں نے رسولؐ کا راستہ کیوں ترک کیا! اس کے بعد وہ برے لوگوں سے تعلق قائم کرنے کا اعتراف کرتا ہے اور اسی تعلق کو اپنی گمراہی کا اصل سبب قرار دیتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تاثیر کو، انبیاء کی تاثیر سے زیادہ قوی قرار دیتا ہے (البتہ یہ بیمار دلوں کا معاملہ ہے)۔

آخری جملے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ برے دوست شیطان کا لشکر ہوتے ہیں جنہیں شیاطین انس کہا جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان آیات میں ظالم کی پشیمانی کے بیان کے لیے:

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

''ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا۔''

کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ افسوس اور پچھتاوے کی آخری منزل کا بیان کرتے ہیں۔

عام طور پر انسان افسوس وندامت کے اظہار کے لیے اپنی انگلی دانتوں میں دبا لیتا ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ پر اپنے ہاتھ کی پشت پر کاٹتا ہے اور افسوس وندامت کے آخری مرحلہ پر یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔ درحقیقت اس طرح وہ اپنے آپ سے انتقام لیتا ہے کہ اس نے کیوں کوتاہی کی اور کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنی ہلاکت اور بدبختی کے اسباب فراہم کیے۔

ان آیات میں اور بعض دیگر آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے دوست اور ہم نشین اس کی سعادت اور ہلاکت میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے اخلاق اور کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ اس کے عقائد کی تشکیل میں بھی موثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ایک معلم اخلاق اپنے زیر تربیت افراد پر اس پہلو سے خصوصی توجہ دے۔ خاص طور پر دور حاضر میں، جبکہ نالائق دوستوں کے ذریعے برائی پھیلانے کے اسباب وحشت ناک صورت اختیار

کر چکے ہیں اور مختلف قسم کی اخلاقی برائیوں کا اصل سبب بن چکے ہیں۔

دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بہت واضح احادیث موجود ہیں۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث میں اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں:

المرء علی دین خلیله و قرینه

''انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (اصول کافی، ۲:۳۷۵)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ بات ایک اور انداز میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

لا تصحبوا اهل البدع ولا تجالسوهم فتصير واعند الناس کواحد منهم قال رسول الله (ص) المرء علی دین خلیله و قرینه

''اہل بدعت سے دوستی نہ کرو اور ان کے ہم نشین نہ بنو، اس لیے کہ تم لوگوں کے ہاں انہی میں شمار کیے جاؤ گے، رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (مذکورہ حوالہ)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دوستوں کے ایک دوسرے پر اثر کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

مجالسة الاخیار تلحق الاشرار بالاخیار و مجالسة الفجار تلحق الابرار بالفجار

''نیک لوگوں کی صحبت، برے لوگوں کو نیکوں سے ملا دیتی ہے اور برے لوگوں کی صحبت نیک لوگوں کو برے لوگوں سے ملحق کر دیتی ہے۔'' (صفات الشیعه از شیخ صدوق بمطابق نقل از بحارالانوار، ۷۱:۱۹۷)

اسی حدیث کے ذیل میں ایک نہایت پر معنی جملے میں کہا گیا ہے:

فمن اشتبه علیکم امره ولم تعرفوا دینه فانظروا الی خلطائه

''اگر کسی شخص کا حال تم پر واضح نہ ہو اور تم اس کی دینداری کی کیفیت کو نہ جانتے ہو تو اس کے دوستوں کو دیکھو'' (یعنی اگر اس کے دوست اللہ سے محبت کرنے والے ہوں تو سمجھ لو کہ وہ مومن ہے اور اگر اس کی ہم نشینی حق کے دشمنوں سے ہے تو سمجھ لو کہ وہ بھی برا شخص ہے)۔

بعض روایات میں اس حقیقت کو اس تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے:

صحبة الاشرار تکسب الشر کالریح اذا مرت بالنتن حملت نتنا

’’برے لوگوں کی صحبت سے برائی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہوا گندگی کے پاس سے گزرتی ہے تو بدبودار ہوجاتی ہے۔‘‘ (غرر الحکم)

ان بیانات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح برے لوگوں کی صحبت برائی کا راستہ ہموار کرتی ہے، اسی طرح اچھے لوگوں کی صحبت، ہدایت اور اخلاقی فضائل کی روشنی کو انسان کے دل میں زیادہ کردیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

عمارة القلوب فی معاشرة ذوی العقول

’’اہل عقل کی صحبت دلوں کو آباد کرتی ہے۔‘‘ (غرر الحکم)

نیز آپؑ سے ہی مروی ایک اور حدیث میں ہے:

معاشرة ذوی الفضائل حیاة القلوب

’’اہل فضائل کی ہم نشینی دلوں کو زندہ کرتی ہے۔‘‘ (غرر الحکم)

دوستوں اور ہم نشینوں کا انسان کی باطنی خصوصیات پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کہتے تھے:

لا تحکموا علی رجل بشیء حتی تنظروا الی من یصاحب فانما یعرف الرجل باشکاله و اقرانه، وینسب الی اصحابه و اخدانه

’’کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک اس کے دوستوں کے بارے میں معلوم نہ کرلو۔ اس لیے کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا اور انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔‘‘ (بحار الانوار، ۷۱:۱۸۸)

حضرت لقمان ایک خوبصورت حدیث میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں:

یابنی صاحب العلماء، واقرب منهم، وجالسهم وزرهم فی بیوتهم، فلعلك تشبههم فتکون معهم

’’اے بیٹا! اہل علم سے دوستی کرو اور ان کے نزدیک رہو۔ ان کے گھر آمدورفت رکھو تاکہ ان جیسے ہوجاؤ اور (دنیا اور آخرت میں) ان کے ساتھ رہو۔‘‘ (غرر الحکم)

مختصر یہ کہ احادیث میں دوستوں کے ایک دوسرے کے اخلاق پر اثر کے بارے میں بہت زیادہ اور پر معنی ارشادات موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک وسیع مضمون تیار ہوسکتا ہے۔

اس بحث کا اختتام حضرت علی علیہ السلام کی اس مختصر مگر پر معنی حدیث پر کرتے ہیں، اس حدیث میں آپؑ اپنے فرزندِ عزیز حضرت امام حسن علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قارن اهل الخیر، تکن منهم، وباین اهل الشر تبن عنهم

''اہل خیر کے قریب رہو، ان میں شامل ہوجاؤ گے۔ اہل شر سے دور رہو تا کہ ان کی برائی سے دور رہو۔''

(نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں

کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کے امکان کی بہترین دلیل اس کا وقوع ہے۔ جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس کے صحیح ہونے کی بہترین دلیل وہ عملی نمونے ہیں جنہیں ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ برے لوگوں کی صحبت انسان کو برا بنا دیتی ہے اور اچھے لوگوں کی صحبت انسان کی روح کی پاکیزگی اور نورانیت کا سبب بنتی ہے۔

پرانی کہاوت ہے کہ بری اخلاقی خصوصیات متعدی بیماریوں کی مانند ہوتی ہیں جو تیزی سے دوستوں اور ہم نشینوں میں منتقل ہوجاتی ہے، خاص طور پر اگر انسان کم عمر ہو، اس کی معلومات کم ہوں، ایمان وعقائد کمزور ہوں تو دوسروں کی اخلاقی خصوصیات زیادہ تیزی سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایسے افراد سے میل جول انسان کے لیے زہر قاتل ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اچھے یا برے افراد کا انجام دوستوں اور ہم نشینوں کے بدل جانے سے مکمل طور پر بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی کے تمام اطوار و انداز بدل جاتے ہیں۔ اس بات کی متعدد نفسیاتی وجوہات ہیں:

۱۔ ماہرین نفسیات اپنی تحقیقات میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے اندر نقالی یا بالفاظ دیگر تقلید کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یعنی لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دوستوں اور اقرباء کے افعال کی نقالی یا تقلید کرتے ہیں۔ ہنس مکھ لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں ہنسی بکھیرتے ہیں جبکہ افسردہ افراد انجمن کو افسردہ کر دیتے ہیں۔

جو لوگ مایوس ہوتے ہیں، وہ اپنے دوستوں کو بھی مایوس کرتے ہیں۔ منفی سوچ رکھنے والے اپنے دوستوں کی سوچ کو بھی منفی بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوستوں کی خصوصیات ایک دوسرے پر تیزی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔

۲۔ برائی کا مشاہدہ اور اس کا تکرار اس کی برائی کو کم کر دیتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ایک عام چیز بنا دیتا ہے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ گناہوں کو ترک کرنے کا ایک موثر سبب ان کے برا ہونے کا احساس ہے۔

۳۔ انسانوں پر تلقین کے اثر کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ برے دوست عام طور پر اپنے دوستوں پر تلقین کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدترین اعمال ان کی نظر میں اچھے نظر آنے لگتے ہیں اور ان میں اچھائی اور برائی کی تمیز کے معیار بالکل گر جاتے ہیں۔

۴۔ برے لوگوں کی صحبت انسان کے اندر منفی سوچ کو مضبوط کرتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کے بارے میں بدگمان ہو جاتا ہے۔ یہ بدگمانی اخلاقی فساد کی دلدل میں گر جانے کا ایک اہم سبب بنتی ہے۔ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار

''برے لوگوں کی صحبت انسان کو اچھے لوگوں کے بارے میں بدگمان کر دیتی ہے۔''(بحار،۷۱:۱۹۷)

ایک اور حدیث میں برے لوگوں کی ہم نشینی کو دل کی موت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔اس حدیث میں ہے:

اربع یمتن القلب .... ومجالسة الموتی، فقیل له یارسول الله و ما الموتی؟ قال (ص) کل غنی مسرف

''چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں جن میں سے ایک مردوں کی ہم نشینی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! مردے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہر دولت مند اسراف کار''۔(بحار الانوار،۷۱:۱۹۵)

دوستوں کی اچھی یا بری صفات کے ایک دوسرے میں منتقل ہونے کے بارے میں شعراء و ادباء نے بھی دادِ سخن دی ہے:

کم نشیں بابدان کہ صحبت بد
گرچہ پاکی ترا پلید کند

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو کیونکہ وہ تمہیں پلید کر دیں گے،خواہ تم پاک ہو)

آفتاب ارچہ روشن است آنرا
پارہ ای ابر ناپدید کند

(سورج اگر چہ روشن ہے مگر بادل کا ایک ٹکڑا اسے چھپا دیتا ہے)

بابدان کم نشین کہ بدمانی
خو پذیراست نفس انسانی

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو، کیونکہ نفس انسانی دوسروں کی عادات کو قبول کرتا ہے)

صحبت نیک راز دست مدہ
کہ ومہ بہہ شود ز صحبت بہ

(اچھے لوگوں کی صحبت کو ترک نہ کرو کیونکہ اچھے لوگوں کی صحبت سے لوگ اچھے ہو جاتے ہیں)

اس سلسلہ میں اشعار تو بہت زیادہ ہیں، ہم اس بحث کو شیخ سعدی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:

گلی خوشبوی درحمام روزی
رسید از دست محبوبی بدستم
(ایک روز حمام میں خوشبودار مٹی کسی محبوب کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی)
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تو مستم
(میں نے اس سے کہا تم مشک ہو یا عبیر کیونکہ میں تمہاری خوشبو سے مدہوش ہو گیا ہوں)
بگفتا من گلی ناچیز بودم
ولیکن مدتی باگل نشستم
(اس نے کہا کہ میں ناچیز مٹی تھی لیکن کچھ عرصہ پھول کی صحبت میں رہی)
کمال ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم
(میرے ہم نشین کے کمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو نظر آ رہی ہوں)

۳۔اخلاق پر خاندانی تربیت و وراثت کا اثر

ہم سب جانتے ہیں کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ بہت سی اخلاقی خصوصیات خاندان میں ہی نشوونما پاتی ہیں۔ خاندان کا اچھا یا برا ماحول اخلاقی فضائل کی پرورش میں بہت موثر واقع ہوتا ہے بلکہ اسے انسان کے اخلاق کی عمارت کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ بہت جلدی اثر قبول کرتا ہے اور بچپن میں جو چیزیں اس کی روح پر اثر انداز ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

اس بات کو حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

العلم (فی) الصغر کالنقش فی الحجر

''بچپن کی تعلیم پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔'' (بحارالانوار، ۱:۲۲۴)

بچہ اپنے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں سے بہت سی اخلاقی خصوصیات سیکھتا ہے۔ شجاعت، سخاوت، صداقت، امانت اور ان جیسی دیگر صفات بچے بڑی آسانی سے اپنے بڑوں سے سیکھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جھوٹ، خیانت، بے راہ روی اور ایسے ہی اخلاقی رذائل بھی بچوں کے اندر بڑوں سے ہی آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ماں باپ کی اخلاقی خصوصیات، وراثت کے ذریعے بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ جینز کے ذریعے والدین کی

جسمانی خصوصیات کے ساتھ ان کی اخلاقی خصوصیات بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کی تاثیر سو فیصد نہیں ہوتی اور بچہ ان کی وجہ سے مجبور نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں ماں باپ دو طرح سے اپنے بچوں کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں جنہیں تکوین اور تشریع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تکوین سے مراد وہ اخلاقی خصوصیات ہیں جو نطفہ میں پوشیدہ ہیں اور غیر شعوری طور پر بچوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ تشریع سے مراد وہ تعلیم و تربیت ہے جو شعوری طور پر انجام پاتی ہے اور اچھی یا بری اخلاقی صفات کی بنیاد بنتی ہے۔

اگرچہ ان دونوں میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انسان کی صفات اور باطنی کیفیات کی زمین ضرور ہموار کرتی ہیں۔ اس بات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ پاک، صالح، شجاع اور مہربان افراد کے بچے بھی انہی کی مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ آلودہ افراد کے بچے بھی آلودہ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں اقسام کی مثالوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وراثت و تربیت کا اثر جبری نہیں ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی ان آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

''اس لیے کہ اگر تو نے انہیں باقی رکھا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف فاجر اور کافر نسل کو جنم دیں گے۔'' (نوح)

۲۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

''اللہ نے اسے (مریم کو) عمدہ انداز میں قبول فرمایا اور اس کی اچھی پرورش کی اور اس کی کفالت کی ذمہ داری ذکریا کو سونپی۔'' (آل عمران: ۳۷)

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر برتری عطا فرمائی۔ وہ ایسی نسل کے لوگ تھے جو (تقویٰ اور پاکیزگی میں) ایک دوسرے سے تھے اور اللہ سننے، جاننے والا ہے۔''

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

''اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' (تحریم: ٦)

۵۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بدچلن آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکردار تھی۔'' (مریم:۲۸)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ نے ان کی تباہی کے لیے عذاب کی دعا کرتے ہوئے یہ دلیل بھی بیان کی کہ اگر یہ قوم باقی رہی تو دوسروں کو بھی گمراہ کرے گی اور ان سے صرف فاجر اور کافر نسل ہی جنم لے گی:

إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فاسد اور مفسد افراد جن کی نسلیں بھی فاسد اور مفسد ہوتی ہیں، انہیں جینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ انہیں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوکر نیست و نابود ہوجانا چاہیے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی ماحول، خاندانی تربیت اور وراثت بھی اخلاق وعقائد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام دوٹوک الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ان کی ساری نسل فاسد اور کافر ہوگی، اس لیے کہ ان کے معاشرے میں برائی کی موج اس قدر طاقتور تھی کہ اس کے اثر سے نجات حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا جبری اثر سو فیصد اور یقینی ہوتا ہے اور انسان بے اختیار اس کی طرف مائل ہوجائے۔

بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس حقیقت کو وحی الٰہی کی روشنی میں جانتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا تھا کہ:

أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ

''ان میں سے جو اب تک ایمان لا چکے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔'' (ہود:۳۶)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت آئندہ نسلوں کے بارے میں بھی ہو۔ لہٰذا بعید از قیاس نہیں ہے کہ انہوں نے آنے والی نسل کے بارے میں یہ فیصلہ مندرجہ بالا تینوں عوامل (ماحول، تربیت اور وراثت) کی بنیاد پر کیا ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم نوحؑ کے گمراہ لوگوں کے بچے جب حد بلوغ کو پہنچتے تو وہ انہیں لے کر حضرت نوحؑ کے پاس آتے اور اسے کہتے کہ اس بوڑھے کو دیکھ رہے ہو، یہ ایک جھوٹا شخص ہے، اس سے بچ کر رہنا، میرے باپ نے بھی مجھے یہی نصیحت کی تھی (تم بھی اپنے بچوں کو اسی طرح نصیحت کرنا)۔

اس طرح فاسد نسلیں ایک دوسرے کے بعد آتی تھیں اور چلی جاتی تھیں۔ (فخر رازی اور تفسیر مراغی)

قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام، جو کہ دنیا کی معزز ترین اور عظیم ترین خواتین میں سے تھیں، ان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت، خاندانی تربیت اور ماحول انسان کی روحانی کیفیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، لہٰذا پاکدامن اور پاکیزہ بچوں کی پرورش کے لیے ان عوامل کی تاثیر پر ضرور توجہ دی جانی چاہیے۔

ان عوامل میں سے ایک زمانہ حمل میں ماں کی ذہنی اور روحانی کیفیت ہے جس کی بنیاد پر وہ ہر وقت بچے کو شیطان کے وسوسوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اللہ کی پناہ میں دیتی ہے اور یہ آرزو رکھتی ہے کہ وہ بچہ اللہ کے گھر کے خدمت گزاروں میں سے ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس کی منت بھی مان لیتی ہے۔

مندرجہ بالا آیت یہ کہہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے احسن انداز میں قبول فرمایا اور اس کی عمدہ پودے کے انداز میں پرورش فرمائی۔

پاکیزہ انسان کو ایک پاکیزہ اور عمدہ پودے سے تشبیہ دینا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح خوبصورت پھول یا اچھے پھل کا پودا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے بیج کا استعمال کیا جائے، اس کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے اور باغبان مسلسل اس کی دیکھ بھال کرتا رہے، اچھے انسان کی پرورش کے لیے بھی یہ سب کچھ ضروری ہے اور وراثت، ماحول اور خاندانی تربیت کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا

یعنی ”اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی کفالت کی ذمہ داری حضرت ذکریاؑ کو سونپی۔“

ظاہری بات ہے کہ جو حضرت زکریا علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کی گود میں پلی ہو، اس کی شخصیت پر اس تربیت کا کیسا اثر ہوا ہوگا۔

لٰہذا یہ بات ہرگز قابل تعجب نہیں ہونی چاہیے کہ اس عمدہ تربیت کے نتیجہ میں حضرت مریم ایمان، اخلاق اور تقویٰ میں ایسے مقام پر فائز ہوگئیں جس کی طرف آیت کا یہ حصہ اشارہ کرتا ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

”جب بھی ذکریاؑ ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوتے، ان کے پاس کھانا دیکھتے اور پوچھتے کہ اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔“

جی ہاں! جنتی تربیت کا نتیجہ بھی جنتی اخلاق اور جنتی خوراک ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں، جو درحقیقت اس آیت کی تمہید ہے جس میں حضرت مریم اور حضرت ذکریا علیہما السلام کے ذریعے ان کی تربیت کا ذکر کیا گیا ہے، پاکیزگی، تقویٰ اور فضیلت کے حصول میں وراثت اور تربیت کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آل عمران کو اہل عالم پر چن لیا اور برتری دی۔ وہ ایک ایسی نسل کے لوگ تھے (جو پاکیزگی اور فضیلت میں ایک دوسرے سے تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ان کا ایک دوسرے سے ہونا، وراثت کے عنصر کی طرف اشارہ ہے یا خاندانی تربیت کی طرف یا دونوں کی طرف۔ اس آیت کے ذیل میں جو روایات [1] نقل ہوئی ہیں، ان میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ آیات ناقابل انکار طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا تربیتی ماحول اور اس کی وراثت، ضروری قابلیت اور لیاقت پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو افراد ایسی تربیت اور وراثت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، ان کا ایسے لوگوں سے موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا جو آلودہ وراثت اور غلط تربیت یافتہ ہوں۔

چوتھی آیت اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہہ رہی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

یہ آیت سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات کے بعد ہے جس میں ازواجِ رسولؐ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے اعمال پر خصوصی طور پر نظر رکھیں۔ اس کے بعد اس آیت میں یہی بات عمومی انداز میں سب مسلمانوں سے کہی گئی ہے۔

واضح سی بات ہے کہ یہاں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ اس سے دور رکھنا اور بچانا صرف خاندانی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو گناہوں کو ترک کرنے، نیکیوں کی طرف مائل ہونے اور تقویٰ کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح یہ آیت جہاں خاندان کے بارے میں سرپرست کے فرض کی نشاندہی کر رہی ہے، وہاں تقویٰ اور فضائل اخلاق کے حصول میں تعلیم و تربیت کی تاثیر کو بھی واضح کر رہی ہے۔

تعلیم و تربیت کا لائحہ عمل خاندان کی تشکیل کے سنگ بنیاد یعنی شادی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش سے لے کر دیگر تمام مراحل میں اسے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب مندرجہ بالا آیات نازل ہوئی تو ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا:

---

[1] نورالثقلین، ۱: ۳۳۱ کی طرف رجوع فرمایئے۔

''یا رسولؐ اللہ! میں کس طرح اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤں؟''

آپؐ نے فرمایا:

تامرهم بما امر الله و تنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك

''انہیں امر بالمعروف و نہی از منکر کرو۔ اگر وہ قبول کر لیں تو تم نے انہیں آتش جہنم سے بچا لیا اور اگر قبول نہ کریں تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔'' (نور الثقلین، ۵:۳۷۲)

یہ نکتہ بھی نہایت واضح ہے کہ امر بالمعروف خاندان کو جہنم سے بچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا چاہیے اور تمام نفسیاتی، قولی اور عملی پہلوؤں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ آیت وراثت کے مسئلہ پر بھی نظر رکھتی ہو کہ انسان انعقادِ نطفہ کے وقت رزقِ حلال کھائے ہوئے ہو اور یادِ خدا میں مصروف ہوتا کہ پیدا ہونے والا بچہ مثبت وراثت کے ساتھ دنیا میں آئے، اس لیے کہ آتش جہنم سے دور رکھنے میں یہ باتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں اور آخری آیت حضرت مریم اور بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس آیت میں ہے کہ جب حضرت مریم اپنے نومولود بچے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ تو نے عجیب برا کام کیا ہے:

''اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکار نہ تھی (پھر تو کیسے شوہر کے بغیر ماں بن گئی؟'')

یہ الفاظ (خاص طور پر اس لیے کہ قرآن مجید نے انہیں نقل کیا ہے اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہے) اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ماں باپ کی طرف سے وراثت کا عنصر اور اسی طرح خاندانی تربیت، انسان کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جسے سب لوگ تجربہ کی بنیاد پر جانتے تھے اور اگر اس کے خلاف کوئی چیز رونما ہوتی تو اس پر حیرت کا اظہار کرتے۔

مندرجہ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے کہ اخلاقی مسائل میں وراثت اور خاندانی تربیت کے عنصر کا کردار بہت اہم ہے، خواہ یہ کردار مثبت پہلو میں ہو یا منفی میں۔

اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان کی پہلی درسگاہ دامنِ مادر اور باپ کی آغوش ہوتی ہے۔ اسی درسگاہ میں بچہ فضائل و رذائل کا پہلا سبق سیکھتا ہے۔ اگر تربیت کے مفہوم کا دائرہ تکوینی اور تشریعی تک بڑھا دیا جائے تو پہلا مدرسہ رحم مادر اور صلب پدر ہوتا ہے جو بچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی فضیلت اور رذیلت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

احادیث میں انتہائی لطیف عبارات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔نمونے کے طور پر ذیل میں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الاخلاق برهان كرم الاعراق

''حسن اخلاق انسان کی اچھی وراثت کی دلیل ہے۔'' (غررالحکم)

یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور صاحب فضیلت خاندانوں میں زیادہ تر بافضیلت بچے پروان چڑھتے ہیں جبکہ برے افراد عام طور پر برے خاندانوں میں پرورش پاتے ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عليكم فى طلب الحوائج بشراف النفوس و ذوى الاصول الطيبة فانها عندهم اقضى وهى لديهم ازكى

''اپنی حاجات کی طلب میں ایسے افراد کی طرف رجوع کرو جو شریف النفس ہوں اور انہوں نے پاکیزہ خاندانوں میں پرورش پائی ہو۔ایسے لوگ حاجات کو بہتر اور پاکیزہ طور پر پورا کرتے ہیں۔''

۳۔ حضرت علی علیہ السلام مالک اشتر کے نام عہد نامہ میں قابل افسروں کے انتخاب کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم الصق بذوى المروءات والاحساب و اهل البيوتات الصالحة والسوابق الحسنة ثم اهل النجدة و الشجاعة و السخاء و السماحة فانهم جماع من الكرم و شعب من العرف

''پھر ان لوگوں سے تعلق قائم کرو جو اچھے خاندانوں سے اور اچھے ماضی کے حامل ہوں۔اس کے بعد شجاع، سخی اور بزرگ منش افراد سے تعلق پیدا کرو، اس لیے کہ وہ نیکی اور فضیلت کا مرکز ہیں۔''

۴۔ برے والدین کا اثر بچوں کے اخلاق پر اس حد تک ہوتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ايما امراة اطاعت زوجها وهو شارب الخمر، كان لها من الخطا يابعدد نجوم السماء، وكل مولود يلد منه فهو نجس

''جو عورت شراب خور شوہر کی اطاعت کرے (یعنی اسے ہم بستری کرنے دے) تو وہ آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے اور اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ نجس ہوگا۔'' (لئالی

الاخبار)

متعدد احادیث میں شراب خور اور بد اخلاق شخص کو رشتہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔(وسائل الشیعہ، ۱۴، ۵۴، ۵۵)

۵۔ ماں باپ کی تربیت کا بچوں کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ مشہور حدیث نبوی میں ہے کہ:

کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی یکون ابواہ ھما اللذان یھودانہ و ینصرانہ

''ہر نومولود توحید اور اسلام کی پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔'' (مجمع البیان، سورۂ روم: ۳۰)

جب خاندانی تربیت ایمان اور عقیدہ کو بدل سکتی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اخلاق پر اثر انداز نہ ہو؟

۶۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت کو ماں باپ پر بچے کا بنیادی ترین حق قرار دیا گیا ہے۔ حدیث نبویؐ میں ہے:

حق الولد علی الوالدان یحسن اسمہ و یحسن ادبہ

''باپ پر بچے کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھے آداب سکھائے۔'' (کنز العمال، حدیث ۴۵۱۹۲)

واضح سی بات ہے کہ نام کا بچوں کی شخصیت پر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ عظیم شخصیات اور صاحبان تقویٰ و فضیلت افراد کے ناموں پر بچوں کے نام رکھنا، بچوں کو ذہنی طور پر ان کے قریب کر دیتا ہے۔ اسی طرح اہل فسق و فجور کے نام انسان کو ان کے نزدیک کر دیتے ہیں۔

اسلام نے اس لطیف نفسیاتی مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور کتب احادیث میں اچھے اور برے ناموں کے بارے میں مفصل ابواب مرتب کیے گئے ہیں۔(وسائل الشیعہ، ۱۵: ۱۲۲ تا ۱۳۲)

۷۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

مانحل والد ولدہ افضل من ادب حسن (کنز العمال، حدیث ۴۵۴۱۱)

''بہترین دولت جو ایک باپ اپنے بچے کو دے سکتا ہے، وہ حسن ادب ہے۔''

۸۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانک مسول عما ولیتہ بہ من حسن الادب والدلالۃ علی ربہ عزوجل والمعونۃ لہ علی طاعتہ

''تمہیں جن کا سرپرست بنایا گیا ہے، تم ان کے حسن ادب، اللہ کی طرف ان کی ہدایت اور اللہ کی اطاعت میں ان سے تعاون کرنے کے ذمہ دار ہو۔'' (بحار الانوار، ۷۱: ۴)

۹۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ حسن اخلاق بہترین ورثہ ہے جو باپ سے اولاد کو ملتا ہے:

خیر ما ورث الآباء الابناء الادب

''اچھے آداب و تربیت بہترین ورثہ ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملتا ہے۔'' (غرر الحکم)

اس بحث کو نہج البلاغہ میں سے حضرت علی علیہ السلام کے ایک فرمان پر ختم کرتے ہیں۔ جب کچھ جہلاء نے امیر المومنینؑ کی شخصیت کا دوسروں سے موازنہ کیا تو آپؑ نے اپنا مقام اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وقد علمتم موضعی من رسول الله بالقرابة القريبة والمنزلة الخصيصة وضعنی فی حجره و انا وليد يضمنی الی صدره......... يرفع لی كل يوم علما من اخلاقه ويامرنی بالاقتداء

''رسولؐ اللہ سے جو خصوصی قرابت اور منزلت مجھے حاصل تھی، تم اسے خوب جانتے ہو۔ آنحضرتؐ بچپن میں مجھے اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور اپنے سینے سے لگاتے تھے اور ہر روز فضائل اخلاق کا ایک پرچم میرے لیے بلند فرماتے تھے اور مجھے حکم دیتے تھے کہ میں ان کی پیروی کروں (میری موجودہ اخلاقی حالت رسولؐ اللہ کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس خطبہ میں رسولؐ اللہ کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ولقد قرن الله به (ص) من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملائكته يسلك به طريق المكارم و محاسن اخلاق العالم ليله ونهاره

''رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کے ایام ختم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں میں سے سب سے بڑے فرشتے کو ان کے ساتھ لگا دیا جو انہیں شب و روز اچھی صفات اور اخلاق حسنہ کی راہ پر چلاتا تھا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ)

بنا برایں رسولؐ اللہ فرشتے کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان کی اچھی یا بری اخلاقی صفات اس کے اندر سے ہی اور اس کے ارادے سے وجود میں آتی ہیں۔ لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اچھے اور برے اخلاق کے تشکیل پانے میں متعدد عوامل کارفرما ہیں جن میں سے ایک والدین کی طرف سے ملنے والی وراثت اور خاندانی تربیت بھی ہے۔ علمی اور منطقی تجزیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بہت سے عملی اور تجرباتی دلائل موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اسی وجہ سے کسی فرد یا معاشرے کو حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی وراثت اور تربیت پر توجہ دی جائے اور انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اس دور کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۴۔ علم و آگہی کا اثر

اخلاقی تربیت کے لیے ایک اور اہم عنصر افراد کے علم و آگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے، اس لیے کہ منطق اور تجربہ کی رو سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ انسان کے علم و معرفت کی سطح جس قدر بلند ہوتی ہے، اس میں اخلاقی فضائل کی نشو ونما بھی اسی قدر بہتر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جہالت اور معارف الٰہیہ سے ناواقفیت سے فضائل اخلاقی کو بہت نقصان پہنچتا ہے اور اخلاقی سطح انتہائی پست ہو جاتی ہے۔

کتاب کے آغاز میں ہم علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں مختصر بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ علم مساوی ہے اخلاق کے۔

بالفاظِ دیگر علم و حکمت اخلاق کا سرچشمہ ہیں (اور جیسا کہ سقراط سے منقول ہے):

''رذائل اخلاقی جہل و نادانی کا نتیجہ ہیں، مثلاً متکبر اور حاسد انسان اس لیے تکبر اور حسد میں گرفتار ہوتے ہیں کہ وہ ان کے برے اثرات سے لاعلم ہوتے ہیں۔''

بنابرایں اگر معاشرے میں علم و معرفت کی سطح بلند ہو جائے تو اس سے لوگوں کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اس بات میں کسی حد تک مبالغہ پایا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم اخلاقی تربیت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اہل علم ہیں، ان کی اخلاقی آلودگی جاہل افراد کی اخلاقی آلودگی کی نسبت کم ہوتی ہے۔ اگرچہ ان دونوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں رسولؐ اللہ کی دعوت کے بارے میں ہے کہ وہ اس لیے مبعوث ہوئے تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائیں اور انہیں اخلاقی آلودگی اور گناہوں سے پاک کریں:

هو الذی بعث فی الامین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویز کیهم و یعلمهم الکتب والحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضلل مبین

''اس طرح، ضلال مبین اور کھلی گمراہی سے نجات اور رذائل اخلاقی اور گناہوں سے پاک ہونا قرآن مجید کی آیات کی تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جو یقینی طور پر ان دونوں کے باہمی ربط و تعلق کی دلیل ہے۔''

پیام قرآن کے دورۂ اول کی پہلی جلد میں، معرفت و شناخت کی بحث کے ذیل میں ہم نے قرآنی آیات کی رو سے علم و معرفت اور اخلاقی فضائل کے باہمی ربط اور جہل و نادانی اور رذائل اخلاقی کے باہمی ربط پر بہت سارے شواہد پیش کیے۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر اختصار کے ساتھ ان نمونوں کا ذکر کریں گے:

۱۔ جہالت ہر فساد اور گمراہی کی جڑ ہے۔ سورۂ نمل کی آیت ۵۵ میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی گمراہ قوم سے کہتے ہیں:

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

''تم اپنی شہوت کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو۔تم ایک جاہل قوم ہو۔''

یہاں جہالت اور نادانی کو جنسی انحراف کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ جہالت جنسی بے راہ روی کا سبب ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۳۳ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ جنسی بے راہ روی اور جہالت کے باہمی رابطہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

''(یوسفؑ نے) کہا: اے میرے رب! زندان مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔اگر تو ان کی چالوں سے مجھے نہ بچائے تو میں ان کی طرف مائل ہوسکتا ہوں اور جاہلوں میں سے ہوجاؤں گا۔''

۳۔ جہالت حسد کی وجوہات میں سے ایک ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۸۹ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے (جب وہ مصر کے حاکم بن گئے تھے تو غلہ لینے کے لیے آنے والے اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں):

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم جاہل تھے۔''

یعنی تمہاری جہالت اس حسد کا سبب بنی جس کی وجہ سے تم نے یوسفؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے کنویں میں پھینکا۔

۴۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا سبب ہے۔سورۂ فتح کی آیت ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے خلاف مشرکین کے تعصب اور ان کی ضد کی اصل وجہ ان کی جہالت تھی:

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ

''یاد کرو جب کافروں نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھر لیے۔''

۵۔ جہالت اور بہانہ جوئی کا باہمی تعلق ہے تاریخ انبیاء ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ان کی جاہل قومیں جہالت کی وجہ سے کیسے کیسے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔قرآن مجید نے ان کی بہانہ جوئی اور جہالت کے باہمی تعلق کو بار بار بیان فرمایا ہے۔سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۸ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ

قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ

''جولوگ علم نہیں رکھتے تھے، انہوں نے کہا کہ اللہ ہم سے کیوں بات نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان کے دل ایک جیسے ہیں۔''

یہاں جہل اور لاعلمی کو بہانہ جوئی کا بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اخلاقی بے راہ روی اور جہالت کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ جہالت اور بدگمانی کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں جنگ احد میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغۡشٰى طَآئِفَةً مِّنۡكُمۡ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِيَّةِ ؕ

''پھر (شکست کے) غم کے بعد اس نے ہلکی نیند کی شکل میں تم پر امن نازل کیا جس نے تم میں سے کچھ لوگوں کو ڈھانپ لیا جبکہ بعض دوسرے جنہیں اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی، اللہ کے بارے میں جاہلیت کی ناحق بدگمانی میں مبتلا تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بدگمانی ایک اخلاقی برائی ہے جو دوسری بہت سی فردی اور معاشرتی برائیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس آیت میں جہل اور بدگمانی کا تعلق واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ بے ادبی جہالت سے جنم لیتی ہے۔ سورۂ حجرات کی آیت ۴ میں رسولؐ اللہ کے شایانِ شان احترام نہ کرنے والوں کو جاہل قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝۴

''اے رسولؐ! جولوگ آپؐ کے حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔''

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو وقت بے وقت آنحضرتؐ کے گھر کے باہر آ کر آوازیں لگاتے کہ:

یا محمد ﷺ! یا محمد! اخرج الینا

''اے محمدؐ! باہر آؤ۔''

ان کی یہ حرکت آنحضرتؐ کو بہت ناگوار اور شاق گزرتی تھی مگر آپؐ شرافت اور لحاظ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ حجرات کی آیت ۴ نازل ہوئی۔

"اکثرھم لا یعقلون" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی یہ بے ادبی ان کے عقل و شعور کی سطح نیچی ہونے کی وجہ سے تھی۔

۸۔ اہل جہنم جاہل ہوں گے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل جہنم اپنے برے اعمال اور برے اخلاق کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ قرآن شریف جہنم میں جانے والوں کو جاہل اور نادان قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٧٩﴾

''ہم نے جنوں اور انسانوں کی اکثریت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں، یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔'' (اعراف:۱۷۹)

اس میں اور قرآن مجید کی کئی دیگر آیات میں جہالت اور بری اخلاقی صفات کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

۹۔ صبر اور علم کا آپس میں تعلق ہے۔ سورۂ انفال کی آیت ۶۵ میں مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ اپنی تعداد کم ہونے کے باوجود ایمان اور صبر کے ذریعے، جو کہ علم و آگہی کا نتیجہ ہے، اپنی اس کمزوری کی تلافی کر سکتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

''اے نبی! مومنین کو جنگ کے لیے جوش دلایئے۔ اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں ایک سو ہوں تو وہ ایک ہزار پر غالب آ جائیں گے، اس لیے کہ وہ (کافر) ناسمجھ لوگ ہیں۔''

جی ہاں! یہ کافروں کی جہالت اور ناسمجھی ہی ہے جس کی وجہ سے وہ سست اور بے صبر ہو جاتے ہیں اور یہ اہل ایمان کے علم و آگہی کا نتیجہ ہے کہ وہ صابر اور ثابت قدم رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا ایک سپاہی دس کافروں پر بھاری ہوتا ہے۔

۱۰۔ منافقت اور انتشار کا سبب جہالت ہے۔ سورۂ حشر کی آیت ۱۴ میں یہودیوں کے ایک قبیلہ بنونضیر کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے پرفریب ظاہر کے باوجود مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے:

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ

تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

''وہ کبھی ایک ہوکر تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ صرف قلعوں کے اندر بند ہوکر یا دیواروں کے پیچھے سے ہی تم سے جنگ کریں گے۔ان کی آپس کی جنگ بہت شدید ہے،تم انہیں ایک سمجھتے ہومگر انکے دل پراگندہ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بےعقل ہیں۔''

اس طرح ان کے نفاق اور پراگندگی کو، جوکہ رذائل اخلاق میں سے ہے، جہالت اور نادانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

نتیجہ

جوکچھ مندرجہ بالا دس عناوین کے تحت بیان ہوا ہے، وہ قرآن مجید کی ان آیات کا ایک حصہ ہے جو علم اور فضائل اخلاق اور دوسری طرف جہل اور رذائل اخلاق کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہیں۔

یہ بات بکثرت روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہے کہ جاہل اور بےعلم افراد برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان میں صفات رذیلہ پائی جاتی ہیں۔لیکن جب برے اعمال کی قباحت اور صفات رذیلہ کے نقصانات کے بارے میں ان کے علم ومعرفت کی سطح بلند ہوتی ہے اور مبداء ومعاد (اللہ اور آخرت) کے بارے میں ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ ان برے اعمال وصفات کو یا تو مکمل طور پر ترک کردیتے ہیں یا بہت حد تک کم کردیتے ہیں۔

اس مسئلہ کی منطقی دلیل بھی واضح ہے۔اعلیٰ صفات اور اعمال صالحہ کی طرف حرکت کرنے کے لیے محرک کی ضرورت ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اچھے اعمال وصفات کے فوائد اور برے اعمال وصفات کے مفاسد سے آگاہی بہترین محرک ہے۔ اسی طرح مبداء ومعاد سے آگاہی اور انبیاء واولیاء کے مکتب سے آگاہی انسان کو ان کے قریب کرتی ہے جس سے اخلاقی مفاسد کی وسیع سطح پر اصلاح ہوجاتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ یہاں علم وآگہی سے مراد مادی فنون اور صنائع سے آگہی نہیں ہے، اس لیے کہ بہت سے لوگ ان چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آلودہ ہوتے ہیں، بلکہ یہاں علم وآگہی سے مراد اعلیٰ انسانی اقدار، تعلیمات الٰہی، معنوی مصالح ومفاسد اور معارف الٰہیہ کا علم ہے۔

علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ایسی عبارت بکثرت پائی جاتی ہیں جن سے علم ومعرفت وآگاہی اور فضائل اخلاق کے قریبی تعلق اور جہل و ناآگاہی اور رذائل اخلاق کے باہمی تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

ا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة المعرفة العزوف عن الدنیا

''معرفت کے درخت کا پھل دنیا میں زہد ہے۔'' (غرر الحکم)

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ زہد اہم ترین اخلاقی فضائل میں سے ہے

۲۔ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

یسیر المعرفة یوجب الزھد فی الدنیا

''مختصر سی معرفت بھی اس بات کا سبب ہو جاتی ہے کہ انسان دنیا میں زاہد ہو جائے۔'' (غرر الحکم)

ممکن ہے کہ یہاں معرفت سے مراد اللہ تعالی کی معرفت ہو جس کی ذات پاک کے سامنے ہر چیز چھوٹی اور حقیر ہے۔ یہ معرفت بذات خود دنیا اور دنیوی زرق و برق سے بے نیاز اور بے توجہ ہو جانے کا سبب ہے یا پھر ممکن ہے کہ اس سے مراد دنیا کی بے ثباتی اور گزشتہ اقوام کے انجام کی معرفت ہو جو کہ زہد کی روح انسان کے اندر پیدا کر دیتی ہے، یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد آخرت اور وہاں کی عظیم نعمتوں کی معرفت مراد ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ تمام معرفتیں مراد ہوں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں جو کہ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ہے، بے نیازی اور ترک کے علم و معرفت کے ساتھ تعلق کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

من سکن قلبه العلم بالله سبحانه سکنه الغنی عن الخلق

''جس کے دل میں اللہ کی معرفت جگہ بنا لے، وہ لوگوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔'' (غرر الحکم)

ظاہر سی بات ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کی معرفت رکھتا ہو اور کائنات کو اس کی ذات کا ایک حقیر سا جلوہ سمجھتا ہو، وہ صرف اسی پر توکل کرے گا اور اپنے آپ کو اس کے سوا ہر کسی سے بے نیاز پائے گا۔

۴۔ رسول اللہؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من عرف الله و عظمه منع فاه من الکلام، و بطنه من الطعام

''جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اس کی عظمت کو جان لے، وہ اپنے منہ کو ناشائستہ باتوں اور اپنے شکم کو حرام خوراک سے محفوظ رکھتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲:۷ ۲۳)

یہ حدیث اللہ کی معرفت اور حفظِ زبان اور حفظ شکم کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من عرف الله خاف الله و من خاف الله سخت نفسه عن الدنیا

''جو اللہ کی معرفت حاصل کر لے وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ دنیا کی چکاچوند سے بے

نیاز ہو جاتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۲۳۷)

اس حدیث میں بھی معرفت خدا اور خوف خدا کے بہت سے اخلاقی فضائل کے ساتھ تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

۶۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں عفو و درگزر اور معرفت خدا کے باہمی تعلق کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں:

اعرف الناس باللہ اعذرھم للناس و ان لم یجد لھم عذرا

''جو شخص سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہے، وہ سب سے بڑھ کر لوگوں کو معاف کرتا ہے، خواہ معاف کرنے کی کوئی وجہ بھی موجود نہ ہو۔'' (غرر الحکم)

(ظاہری بات ہے کہ یہ حدیث ذاتی امور سے متعلق ہے نہ کہ قومی اور معاشرتی امور سے متعلق)۔

۷۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ہی سے اللہ کی معرفت اور ترک تکبر کے باہمی ربط کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وانہ لا ینبغی لمن عرف عظمۃ اللہ ان یتعظم

''جو اللہ کی عظمت کو جان لے، اسے اظہارِ عظمت زیب نہیں دیتا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۴۷)

۸۔ پاکیزگی عمل اور علم کے باہمی تعلق کے بارے میں ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لن یزکی العمل حتی یقارنہ العلم

''کوئی عمل اس وقت تک پاکیزہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا علم کے ساتھ تعلق نہ ہو۔'' (غرر الحکم)

ظاہری بات ہے کہ عمل کی پاکیزگی عام طور پر اخلاق کی پاکیزگی ہوتی ہے اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

۹۔ اسی سلسلہ میں رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں ہے:

بالعلم یطاع اللہ و یعبد و بالعلم یعرف اللہ و یوحد و بہ توصل الارحام و یعرف الحلال و الحرام، والعلم امام العمل

''علم و معرفت کے ذریعے ہی اللہ کی اطاعت ممکن ہے، علم کے ذریعے ہی اللہ کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کی واحدانیت کو سمجھا جا سکتا ہے، اسی کے ذریعے صلہ رحمی کی جا سکتی ہے، اسی کے ذریعے حلال و حرام کی پہچان ہو سکتی ہے، علم ہی عمل کا رہنما ہے۔'' (تحف العقول: ۲۱)

اس حدیث میں بھی بہت سے اخلاقی فضائل کو شجر علم کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ یہی بات مزید صراحت کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

ثمرۃ العقل مداراۃ الناس

''عقل کا پھل یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے۔'' (غرر الحکم)

ان احادیث کے مقابلہ میں ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو جہل اور رذائل اخلاق کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجھل اصل کل شر

''جہالت ہر برائی کی جڑ ہے۔'' (غرر الحکم)

۲۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحرص والشرہ والبخل نتیجۃ الجھل

''حرص، طمع اور بخل جہالت کا نتیجہ ہیں۔'' (غرر الحکم

اس کی وجہ یہ ہے کہ حریص اور طماع انسان ان چیزوں کی طلب میں تگ ودو کرتا ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی سے زائد ہیں۔ مال ودولت کے ساتھ اس کی محبت ایک غیر منطقی اور غیر معقول لگاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح بخیل اپنے بخل کے ذریعے ان چیزوں کو اپنے پاس رکھتا ہے جنہیں وہ اپنی زندگی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام جہل اور رذائل اخلاق کے باہمی تعلق کو جامع تر انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

الجاھل صخرۃ لا ینفجر ماءھا! وشجرۃ لا یخضر عودھا! وارض لا یظھر عشبھا

''جاہل ایک ایسا پتھر ہوتا ہے جس سے پانی نہیں نکلتا، ایک ایسا درخت ہوتا ہے جس کی شاخیں سبز نہیں ہوتیں اور ایک ایسی زمین ہوتا ہے جس میں سے کوئی پودا نہیں اگتا۔'' (غرر الحکم)

۴۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا تری الجاھل لا مفرطا او مفرطا

''جاہل حالت افراط میں ہوتا ہے یا حالت تفریط میں۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۷۰)

اس بات کے مدنظر کہ علمائے اخلاق کے مطابق فضائل اخلاق افراط یعنی زیادہ روی اور تفریط یعنی کوتاہی کے درمیان نقطہ اعتدال پر واقع ہوتے ہیں، اس حدیث سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ جہالت اور رذائل اخلاق کے درمیان قریبی تعلق ہوتا ہے۔

۵۔ علمائے اخلاق کی بڑی تعداد اصلاحِ اخلاق، تہذیب نفس اور خودسازی کے لیے اصلاحِ زبان کو ابتدائی قدم قرار دیتے ہیں۔ احادیث میں جہل ونادانی اور بدزبانی کے درمیان گہرے تعلق کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجاھل اسیر لسانہ

''جاہل اپنی زبان کا قیدی ہوتا ہے۔''(بحار الانوار،۷۵:۳۶۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علم اور اخلاق حسنہ اور جہل اور اخلاق رذیلہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بکثرت آیات واحادیث پائی جاتی ہیں۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تہذیب نفس کا ایک مؤثر ذریعہ علم و آگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے۔مبداء ومعاد کی معرفت اور فضائل اخلاق ورذائل اخلاق کے اچھے اور برے اثرات سے آگہی، تہذیب اخلاق میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

علم میں اضافے کی دو شاخیں ہیں:

۱۔ ان میں سے ایک کا تعلق فرد اور معاشرے پر رذائل اخلاق کے منفی اثرات سے ہے۔جیسا کہ اگر انسان کو علم ہو کہ شراب اور منشیات انسانی صحت اور معاشرے کو کس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں تو ان سے دور رہنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔اس طرح سے فضائل اخلاق کی پرورش اور رذائل اخلاق کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو فضائل اخلاق کے فوائد اور رذائل اخلاق کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔لیکن اس نکتہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ علم و آگہی کی سطح میں اضافہ اصلاح اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حصولِ فضائل اخلاق کا راستہ ضرور ہموار کرتی ہیں۔

۲۔ علم و آگہی میں اضافے کی دوسری شاخ کا تعلق اس بات سے ہے کہ مجموعی طور پر معاشرے کی علمی سطح کو بلند کیا جائے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب مبداء ومعاد،انبیاء واولیاء کے حالات اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے بارے میں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو انسان کے اندر فضائل اخلاق کی محبت اور رذائل اخلاق سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر معرفت و آگہی کی سطح کم ہونے سے اور معارف وعقائد سے جہالت کی وجہ سے انسان کے اندر صفات رذیلہ کا خارزار پیدا کرنے کے لیے مناسب حالات فراہم ہو جاتے ہیں جبکہ علم ومعرفت میں اضافے سے فضائل اخلاق کا گلستان پیدا ہونے کے حالات فراہم ہو جاتے ہیں۔

۵۔معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر

ثقافت ان امور کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو انسان کی روح اور فکر کی تشکیل کرتے ہیں اور مختلف مسائل میں اس کے رجحانات کو معین کرتے ہیں۔

کسی معاشرے کے عقائد،تاریخ،آداب ورسوم،فن وادب کے مجموعہ کو اس معاشرے کی ثقافت کہا جاتا ہے۔تربیت اخلاق کے سلسلہ میں ان میں سے بعض مثلاً ''معاشرتی ماحول'' پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔اب ہم کسی معاشرے میں فضائل اخلاق کی بنیادوں کے استحکام یا رذائل اخلاق کو گہرا کرنے میں ثقافت کے دیگر عناصر کے کردار کا جائزہ لیں گے۔

ان عناصر میں سے ایک تو کسی معاشرے کی تاریخ اور آداب ورسوم ہیں۔اگر ان کا محور اخلاقی فضائل ہوں تو معاشرے میں

اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش اور تہذیب نفس کے لیے مناسب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی بنیاد رذائل اخلاق ہوں تو معاشرہ برائیوں کی لپیٹ میں آنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی آیات میں اس بارے میں واضح اشارات ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام صرف اس لیے رذائل اخلاق کے ہولناک گڑھے میں گر گئیں کہ ان کے معاشرے پر غلط آداب ورسوم اور جاہلانہ ثقافت کی حاکمیت قائم تھی، مثلاً:

۱۔ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

''جب یہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ برے کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟'' (اعراف: ۲۸)

۲۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا تھا۔ اگر ان کے آباء واجداد عقل نہ رکھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ ان کی پیروی کریں گے؟'' (بقرہ: ۱۷۰)

۳۔ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿٥٣﴾

''جب انہوں نے اپنے باپ (آذر) اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' (انبیاء: ۵۲، ۵۳)

۴۔ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ ﴿٢٣﴾

''آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو اس بستی کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم انہی کی راہ پر چلیں گے۔''

(زخرف:۲۳)

۵۔ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝۸۲

''لیکن اس کی قوم کے پاس صرف یہی جواب تھا کہ انہیں اپنی بستی سے باہر نکال دو کیونکہ یہ طہارت پسند ہیں۔'' (اعراف:۸۲)

۶۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝۵۸ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝۵۹

''جب ان میں سے کسی کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو شدت غم سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور سخت غصے میں آ جاتا ہے اور اس بری خبر کے سننے کے بعد اپنی قوم سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ اس بچی کو رکھ لے یا اسے مٹی میں دفن کر دے۔ یہ کتنا برا فیصلہ کرتے ہیں۔'' (نحل:۵۸،۵۹)

۷۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ

''محمد اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے خلاف سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں حالت رکوع و سجود میں پاؤ گے۔ وہ اپنے رب سے اس کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے آثار ان کی پہچان ہے۔'' (فتح:۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ ہر قوم کی ثقافت اخلاقی صفات کو پروان چڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اعلیٰ اور عمدہ ثقافت میں اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد کی تربیت ہوتی ہے۔ بری اور روبہ انحطاط ثقافت رذائل اخلاقی کو پروان چڑھانے کا کام کرتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات ان دونوں نکات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلی آیت میں ان شیطان صفت گمراہ لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے برے کاموں کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم نے یہ طریقہ اپنے بزرگوں سے سیکھا ہے:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اور ہم یہ کام اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو اپنے عمل کے اچھا ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے اور نہ صرف یہ کہ ان پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

دوسری آیت میں بھی یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ آؤ، جو کچھ اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ غرور و تکبر سے کہتے تھے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ ہم تو وہی کریں گے جو کچھ ہم نے اپنے آباء واجداد کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے جاہلانہ طور طریقے اور اخلاقی رذائل ان کی نظر میں اللہ کی آیات سے زیادہ قابل قدر تھے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ؕ

قرآن شریف مزید کہتا ہے کہ کیا ان کے آباء واجداد گمراہ نہ تھے؟ (پھر کیوں وہ ان جاہلوں کی روش کو قرآن کی حیات بخش تعلیمات پر مقدم قرار دیتے ہیں................؟):

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

تیسری آیت میں بھی ہم خلاف اخلاق اعمال پر غلط ثقافت کے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس آیت میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کو دیکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم کیوں ان بے جان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ایسا ہی کریں گے:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۲﴾ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿۵۳﴾

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی اس اندھی تقلید پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہو۔''

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۵۴﴾

لیکن بدقسمتی سے یہ کھلی گمراہی نسل در نسل منتقل ہوتی گئی اور ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گئی۔ نہ صرف یہ کہ لوگ اسے برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔

چوتھی آیت میں بھی یہی بات ایک اور شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب بت پرستوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم

باشعور انسان ہوتے ہوئے بے شعور بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک مذہب پر دیکھا ہے اوران کی تقلید کرتے ہوئے ہم ہدایت پر ہیں:

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

وہ اپنے اس احمقانہ کام کو نہ صرف یہ کہ گمراہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے آباء واجداد سے ملنے والی ہدایت سمجھتے تھے۔ اگلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ طرز تفکر سب مترفین (مغرور دولت مندوں) میں پایا جاتا ہے:

وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۳﴾

ظاہری بات ہے کہ یہ اندھی تقلید جس کی وجہ سے برائی، اچھائی نظر آتی تھی، بہت سی وجوہات رکھتی تھی لیکن اس کی ایک وجہ یقیناً یہ تھی کہ برائی ایک دیرپا ثقافت کی شکل اختیار کرگئی تھی۔

سورہٴ مائدہ کی آیات ۱۰۳ اور ۱۰۴ میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے حلال وحرام کے سلسلہ میں کچھ احمقانہ بدعتیں اپنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے حلال خوراک کو اپنے اوپر حرام کررکھا تھا۔ وہ اپنی اس روش پر اس قدر سختی سے کاربند تھے کہ اس کے مقابلہ میں آیاتِ الٰہی کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے اوران کے جواب میں یہ کہتے تھے کہ:

حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ

''جو کچھ ہمیں اپنے آباءواجداد سے ملا ہے، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔''

ان آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آداب ورسوم بدکس حد تک غیر اخلاقی صفات کی راہ ہموار کردیتے ہیں۔ رذائل کو فضائل میں بدل دیتے ہیں اور گمراہانہ عقائد کو عین ہدایت سمجھتے ہیں۔

پانچویں آیت میں اخلاقی اقدار پر معاشرتی آداب وسنن کی تاثیر کے بارے میں ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ قوم لوط جن کے اخلاقی انحراف نے تاریخ کے صفحات کو سیاہ کردیا ہے (اور بدقسمتی سے یہ برائی ہمارے جدید دور جاہلیت میں مغربی تمدن کے مراکز میں ماضی کی نسبت زیادہ کریہہ اور قانونی شکل میں رونما ہوچکی ہے) جب حضرت لوط اوران کے ساتھیوں نے انہیں تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرنے کی دعوت دی تو وہ بہت برہم ہوئے اور چلانے لگے کہ ان لوگوں کو اپنے شہر میں سے باہر نکال دو جو یہ چاہتے ہیں کہ پاکیزگی یا تقویٰ کو رواج دیں (یا پاکیزگی وتقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں):

وَ مَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ قَرۡیَتِکُمۡ ۚ اِنَّہُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَہَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

آلودہ ماحول اور غلط ثقافت نے ان پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ وہ تقویٰ اور پاکیزگی کو گناہ سمجھنے لگے تھے اور ناپاکی اور آلودگی

پر فخر کرتے تھے۔ظاہری بات ہے کہ ایسے معاشرے میں رذائل اخلاقی تیزی سے پھیلتے ہیں اور فضائل اخلاقی کمزور ہو جاتے ہیں۔

چھٹی آیت میں زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی وحشت ناک رسم کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایک غلط رسم سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب بیٹی کی پیدائش کو اپنے لیے ذلت کا سبب سمجھتے تھے۔جب بھی ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو غم و غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا تھا اور کئی کئی دن ہفتے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا تھا کہ اس ذلت کو قبول کر کے بیٹی کو اپنے پاس زندہ رہنے دے یا اسے دفن کر کے اس ذلت سے نجات حاصل کر لے:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾

ظاہری بات ہے کہ نومولود بچے کا قتل قبیح ترین اور انتہائی قابل نفرت کام ہے لیکن غلط آداب و رسوم کی وجہ سے اس کے برا ہونے کا احساس ختم ہو چکا تھا اور لوگ اسے ایک فضیلت اور افتخار سمجھنے لگے تھے۔

بعض تفاسیر میں اس وحشت ناک مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ زندہ دفن کرنا لڑکیوں کو ہلاک کرنے کا ایک طریقہ تھا جبکہ اس کے کئی اور طریقے بھی رائج تھے۔بعض اوقات وہ لڑکی کو ہلاک کرنے کے لیے اسے پانی میں ڈبو دیتے تھے۔کبھی پہاڑ کے اوپر سے نیچے پھینک دیتے تھے اور بعض اوقات انہیں ذبح کر دیتے تھے۔اس بری رسم کے آغاز اور اس کے اسباب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ تفسیر نمونہ، سورۂ نحل کی آیت ۵۸ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

جو بات ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایسی رسوم بدترین رذائل اخلاقی کے لیے زمین ہموار کر دیتی ہیں اور بدترین رذائل کو بہترین فضائل میں بدل دیتی ہیں۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی قوم کی ثقافت، فضائل یا رذائل کی طرف مائل کرنے کا ایک اہم محرک ہوتی ہے۔جو لوگ رذائل اخلاقی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ ثقافت کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کریں۔

اس کی مثالیں ہم اپنے موجودہ دور میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ عرب کے دور جاہلیت کی طرح آج بھی جاہلیت کی ثقافت مختلف قسم کے اخلاقی رذائل کا اصل سبب بنی ہے۔مثال کے طور پر چند سال قبل چین میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں شریک ممالک کی اکثریت کا اصرار تھا کہ ان تین باتوں کی حمایت کی جائے:

۱۔ عورتوں کے جنسی تعلقات کی آزادی۔

۲۔ ان میں ہم جنسیت کو جائز قرار دیا جائے۔

۳۔ اسقاطِ حمل کی آزادی۔

بعض اسلامی ممالک نے، جن میں ہمارا ملک بھی شامل ہے، اس کی شدت سے مخالفت کی۔

ظاہری بات ہے کہ جب اقوام کے تعلیم یافتہ نمائندے ان برے اور گھناؤنے کاموں کو عورتوں کے حقوق کی آڑ میں جائز

قرار دینے لگیں اور اس کی بنیاد پر جب ثقافت تشکیل پا جائے تو لوگوں کے درمیان کیسے کیسے اخلاقی رذائل کی ترویج ہوگی۔ ان اخلاقی رذائل کا نہ صرف تہذیب اخلاق بلکہ معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔

اس سلسلہ کی ساتویں اور آخری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس تاریک معاشرے میں جس ثقافت کی بنیاد رکھی، اس میں انہوں نے کس قدر سرعت کے ساتھ فضائل اخلاقی کے مراحل طے کیے۔ آیت کہتی ہے:

''محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (ان میں یہ نمایاں صفات پائی جاتی ہیں کہ) وہ کفار کے ساتھ سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں ہمیشہ حالت رکوع و سجود (یعنی عبادت میں مشغول) پاؤ گے، وہ اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کے خواہش مند ہیں اور ان کی نشانی یہ ہے کہ سجدے کا نشان ان کے چہرے پر نمایاں ہے۔''

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

ظاہری بات ہے کہ "والذین معه" (جو لوگ ان کے ساتھ ہیں) سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو کسی زمان و مکان میں ان کے ساتھ رہے ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے عقائد کو تسلیم کرنے میں اور الٰہی آداب وسنن پر مبنی ثقافت کو قبول کرنے میں رسولؐ اللہ کا ساتھ دیا۔

معاشرتی آداب ورسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

اسلام نے اچھے آداب ورسوم کی پیدائش اور برے آداب ورسوم کے ساتھ مقابلہ کرنے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں اچھے آداب و رسوم کی داغ بیل ڈال کر اخلاقی اعمال کی انجام دہی کی راہ ہموار کی جا سکے اور رذائل اخلاقی کی روک تھام کی جا سکے۔

مندرجہ ذیل احادیث میں سے ہر ایک اس سلسلہ میں ایک خاص نکتہ کو بیان کر رہی ہے:

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"خمس لا ادعهن حتی الممات الاکل علی الحضیض مع العبید...... وحلب العنز بیدی ولبس الصوف والتسلیم علی الصبیان، لتکون سنة من بعدی

(بحارالانوار، ۷۳:۶۶)

''میں پانچ کاموں کو زندگی بھر ترک نہیں کروں گا: غلاموں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہنا، کھردرا لباس پہننا اور بچوں کو سلام کرنا تاکہ یہ میرے بعد سنت بن جائے۔''

ان کاموں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے اندر تواضع وفروتنی کو پیدا کیا جائے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے مروی ہے:

من سن سنة حسنة عمل بها من بعده كان له اجره و مثل اجورهم من غير ان ينقص من اجورهم شيئا، ومن سن سنة سيئة فعمل بها بعده كان عليه وزره ومثل اوزارهم من غير ان ينقص من اوزارهم شيئا

''جو کوئی کسی اچھے عمل کی بنیاد ڈال دے اور لوگ اس پر عمل کرتے رہیں تو اسے اپنے نیک کام کا اجر بھی ملے گا اور ان سب لوگوں کے اجر کے برابر بھی اجر ملے گا جو اس کام کو انجام دیں گے اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جو کوئی کسی برے کام کی بنیاد ڈالے اور بعد میں لوگ اس پر عمل کریں تو اسے اپنے برے کام کے گناہ کی وجہ سے ان سب کے برے کام کا گناہ بھی ہوگا اور ان کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔''(کنزالعمال:۱۵:۸۷۰)

اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں نقل کی ہے۔

یہ حدیث جو مختلف الفاظ میں رسولؐ اکرم، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے نقل ہوئی ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اخلاقی اعمال کا راستہ ہموار کرنا اس قدر اہم ہے کہ اس کام کو انجام دینے والا اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح سے گمراہی وبدکاری کی راہ ہموار کرکے رذائل اخلاقی کی بنیاد ہموار کرنے والا بھی اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کو تاکید کے ساتھ نصیحت کی کہ ''اچھے آداب ورسوم کی حفاظت کرنا اور ان کو ختم کرنے سے پرہیز کرنا۔''

لا تنقض سنة صالحة عمل بها صدور هذه الامة و اجتمعت بها الالفة وصلحت عليها الرعية، ولا تحدثن سنة تضر بشيء من ماضي تلك السنن فيكون الاجر لمن سنها والوزر عليك بما نقضت منها

''کسی ایسی اچھی سنت کو جسے اس امت کے گزشتگان نے قائم کیا اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے ہوں

اوراس سے امت کے امور کی اصلاح ہوتی ہو، نہ توڑنا اور کسی ایسی سنت کو ایجاد نہ کرنا جو گزشتگان کی اچھی سنتوں کو نقصان پہنچائے، اس لیے کہ جنھوں نے ان سنتوں کو قائم کیا، ان کا اجرانہیں ملے گا اور ان کو ختم کرنے کا گناہ تم پر ہوگا۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۵۳)

درحقیقت اچھے طور طریقوں کو ایجاد کرنے سے کارہائے خیر اور پرورش فضائل اخلاقی میں مدد ملتی ہے اور یہ درحقیقت نیکی اور خیر میں تعاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح برے طور طریقے ایجاد کرنا گناہ اور بدکاری میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ ان اچھے یا برے اعمال میں ان کے قائم کرنے والے بھی شریک ہوتے ہیں جبکہ ان اعمال کے انجام دینے والوں کے اجر وثواب یا عذاب وگناہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

سنت حسنہ کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اسلام سے قبل پانچ سنتیں قائم کی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تائید کرتے ہوئے انہیں احکام اسلام میں شامل کر دیا۔ وہ پانچ سنتیں یہ ہیں کہ:

''انہوں نے باپ کی بیوی کو بیٹے پر حرام قرار دیا،

قتل کا خون بہا ایک سو اونٹ مقرر کیا،

بیت اللہ کے گرد سات چکروں کا طواف مقرر کیا،

انہیں ایک خزانہ ملا تو انہوں نے اس کا خمس ادا کیا اور زمزم کو نئے سرے سے کھود کر اسے سقایۃ الحجاج کا نام دیا۔''

كانت لعبد المطلب خمسا من السنن اجريها الله عزوجل فى الاسلام حرم نساء الاباء على الابناء، و سن الدية فى القتل ماة من الابل و كان يطوف بالبيت سبعة اشواط، ووجد كنزا فاخرج منه الخمس، وسمى زمزم حين حفرها سقاية الحاج

مندرجہ بالا احادیث اور دیگر بہت سی احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کے آداب و رسوم اور ثقافت اس قوم کے اعمال اور اخلاق پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ اسلام اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے اچھے آداب و رسوم کی حفاظت کو ضروری قرار دیتا ہے اور برے آداب و رسوم کو قائم کرنے یا ان کی حفاظت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔

۶۔ عمل اور اخلاق کا تعلق

یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق سے جنم لیتے ہیں اور انسان کے باطنی اخلاق کا اظہار اس کے اعمال سے ہوتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بات بھی صحیح ہے کہ انسان کے اعمال بھی اس کے اخلاق کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک اچھے یا برے عمل کو مسلسل انجام دیا جائے تو وہ انسان کی پختہ عادت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کا ایک راستہ تہذیب اعمال ہے۔انسان کو اس بات پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی براعمل بار بار تکرار کے نتیجہ میں اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں قائم کرلے اور انسان کی روح کو اپنے رنگ میں رنگ لے۔

اسی لیے آیات واحادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ گناہ اور برائی کے سرزد ہونے کے بعد فوراً توبہ کی جائے۔یعنی توبہ کے پانی سے دل کو گناہ کے اثرات سے پاک کرلیا جائے تاکہ تکرارِ عمل کے ذریعے براعمل اخلاق رذیلہ میں تبدیل نہ ہوجائے۔

اس کے برعکس اسلام میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ انسان اچھے اعمال کو اس قدر تکرار کے ساتھ انجام دے کہ وہ ایک پختہ عادت بن جائے۔

اس اشارہ کے بعد ہم چند آیات نقل کرتے ہیں جن میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾

”جو وہ سمجھ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو لگ گئے ہیں۔“ (مطففین: ۱۴)

۲۔ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ

”اسی طرح اسراف کرنے والوں کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے۔“ (یونس: ۱۲)

۳۔ أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ

”کیا وہ جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہوں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہو، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حقیقت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ہے۔“ (فاطر: ۸)

۴۔ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ

”میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے ہیں۔“ (نمل: ۲۴)

۵۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴿۱۰۴﴾

''اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خبر دوں جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں کھو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے عمل کر رہے ہیں۔'' (کہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

۶۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴿۱۷﴾

''توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو از روئے جہالت برا کام کر گزرتے ہیں اور پھر جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔'' (نساء: ۱۷)

۷۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ۔ ۱۰۳)

''اے رسولؐ! ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) لو تاکہ اس طرح تم ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

تفسیر اور ترجمہ

پہلی آیت میں گناہ اور برے اعمال کے ان آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کے قلب اور روح پر مرتب ہوتے ہیں جن سے دل کی پاکیزگی اور نورانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ تاریکی اور ظلمت لے لیتی ہے۔ آیت کہہ رہی ہے:

''یہ کم بیجنے والے جو سوچ رہے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال زنگ کی طرح ان کے دلوں پر لگ گئے ہیں۔''

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۱۴﴾

آیت کا یہ حصہ ''مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'' فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے ان کے روح اور دل پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس طرح زنگ آئینے کی چمک کا خاتمہ کر کے اسے تاریک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کے بارے میں بے توجہی، انسان کے دل پر ظلمت اور شقاوت کا زنگ چڑھا دیتی ہے۔

''ران'' اس زنگ کو کہتے ہیں جو قیمتی چیزوں کی چمک کو ختم کر دیتا ہے۔ زنگ درحقیقت اس سرخ رنگ کی تہہ کو کہتے ہیں جو ہوا میں موجود نمی کی وجہ سے لوہے کو لگ جاتا ہے جس سے عام طور پر لوہا اور دھاتیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

انسان کے دل پر گناہوں کے تباہ کن اثرات کو بیان کرنے کے لیے یہ بہت مناسب الفاظ ہیں جو آیات و احادیث میں بار

بار استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث کی بحث میں ہم ان الفاظ پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

دوسری آیت میں دل پر زنگ لگ جانے کے مرحلہ سے بھی اگلے مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مرحلہ تزئین اعمال کا مرحلہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برے اعمال اگر تکرار کے ساتھ انجام دیئے جائیں تو آہستہ آہستہ انسان ان سے مانوس ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ برے اعمال اس کو خوش نما اور دلکش معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ ان پر فخر کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے:

''اس طرح مسرفین کے اعمال ان کی نظروں میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں۔''

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

''**ما كانوا يعملون**'' اور ''**مسرفين**'' کے الفاظ گناہ کے تکرار اور اس کے بار بار انجام دینے پر دلالت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے نہ صرف وہ انسان کی نظر میں برے نہیں رہتے بلکہ بتدریج وہ اچھے اعمال نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بذات خود ایک صفت رذیلہ ہے جو تکرار گناہ کے نتیجہ میں گناہگار انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کون ان برے اعمال کو ایسے افراد کے لیے خوش نما بناتا ہے!

بعض آیات میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ ان لوگوں کے گناہوں کی ایک سزا ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملتی ہے، اس لیے کہ جب وہ برے اعمال کو خوبصورت سمجھتے ہیں تو ان کو اور بھی زیادہ ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں اپنی رسوائی اور بدبختی کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیتے ہیں۔'' (نمل: ۴)

لیکن سورۂ انعام کی آیت ۴۳ میں اس کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے جس میں کفر و گمراہی پر اصرار کرنے والے کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان نے انہیں ان کے لیے خوش نما بنا دیئے۔''

بعض اوقات اس کی نسبت بتوں کی طرف دی گئی ہے:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

''اسی طرح اکثر مشرکین کے شرکاء (بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کے لیے خوش نما بنا دیا۔''

بعض اوقات اس حقیقت کا ذکر فعل مجہول کی صورت میں کیا گیا ہے جیسا کہ ہمارے زیر بحث آیت میں یہی اسلوب اختیار

کیا گیا ہے۔

اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبارات کے اس اختلاف کے باوجود معنی میں کوئی تضاد یا فرق نہیں پایا جاتا بلکہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ بعض اوقات تکرارِ عمل باعث زینت ہوتا ہے، اس لیے کہ عمل کے تکرار سے اس کے قبیح ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کے بارے میں غیر جانبدار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی اس عمل کو انجام دیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اچھا اور خوش نما نظر آنے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی طرح اس عمل کے انجام دینے والے کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے جس سے نکلنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو جرائم پیشہ افراد کے حالات کا مطالعہ کرنے والا ہر انسان بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

بعض اوقات اندر سے نفس امارہ کے وسوسے اور باہر سے شیطان کے وسوسے انسان کے برے اعمال کو اس کے لیے خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں، خواہ اس نے اس عمل کو مکرر انجام نہ دیا ہو، ایسی صورت میں بعض اوقات نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان کسی گناہ کبیرہ کو اپنا انسانی یا دینی فرض سمجھ کر انجام دے رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص کسی کی غیبت کو واجب قرار دے کر اس کی غیبت کرنے لگتا ہے، حالانکہ اس بیچارے کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ یہ غیبت کرنے والے شخص کا حسد ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی غیبت کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے جنھوں نے ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا۔ چونکہ ان کے یہ جرائم ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے مطابق تھے، لہٰذا وہ نہ صرف یہ کہ ان اعمال کو برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی بدکاریوں کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیتا ہے تاکہ وہ اور زیادہ رسوا ہوں اور ان کو زیادہ سنگین سزا ملے۔

یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ توحید افعالی کی رو سے اس کائنات میں ہونے والے کام کو اللہ کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس کی ذات پاک علت العلل ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ لوگ اپنے اعمال کے جوابدہ نہ ہوں۔ تمام حمد و ثناء اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے جس نے طاقت اور قدرت عطا کی اور لعنت ہو ان لوگوں پر جو اس طاقت اور قدرت کو گناہ میں صرف کرتے ہیں۔

بعض اوقات فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو خوش نما دکھائی دیں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

یعنی ''مادی چیزوں مثلاً بیوی، بچے اور سونا چاندی وغیرہ لوگوں کی نظر میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں (تاکہ اس طرح ان کی آزمائش ہو سکے)۔''

برے کاموں کے خوبصورت نظر آنے کی ایک وجہ ان کاموں کا تکرار ہے جس سے وہ عمل انسان کی روح اور دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی کیفیت کو بدل دیتا ہے جبکہ اچھے اعمال کی تکرار سے انسان کے اندر اخلاق فاضلہ کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس اور فضائل اخلاق کے حصول کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں، وہ اچھے اعمال کے تکرار سے مدد حاصل کریں اور برے کاموں کے تکرار سے بچیں کیونکہ اچھے کاموں کا تکرار انسان کا معین و مددگار رہوتا ہے جبکہ برے اعمال کا تکرار دشمن اور غدار ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں پھر برے اعمال کی تزئین کا ذکر ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''کیا وہ شخص جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھے اعمال کی صورت میں دیکھ رہا ہے (وہ اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حقیقت بین ہے اور حقیقت کو اس کی اصل صورت میں دیکھتا ہے؟'')

اَفَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ط

اس آیت میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس شخص کا ذکر کرتا ہے جس کی نظر میں اس کے برے اعمال خوش نما بنا کر دکھائے جاتے ہیں تو اس کے مقابل کا صاف الفاظ میں ذکر نہیں کیا گیا۔گویا آیت سامعین کو ایک وسیع منظر پیش کررہی ہے کہ ایسے شخص کے برعکس جو کچھ انہیں نظر آ سکتا ہے، اسے دیکھیں اور اس کا تصور کریں۔آیت درحقیقت یہ بیان کرنا چاہتی ہے کہ آیا ایسا شخص اس حقیقت پسند اور حقیقت بین شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل کے طور پر دیکھتا ہے؟ آیا ایسا شخص ان پاک دل افراد کی مانند ہوسکتا ہے جو ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتے ہیں تاکہ برے اعمال کے عادی بننے سے محفوظ رہ سکیں۔یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ ایسے لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہوں اور اپنی جان کو ہلاکت کے خطرے میں نہ ڈالیں۔اللہ جسے چاہتا ہے، اسے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، اسے ہدایت دیتا ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ط
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ۝٨

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا ہے، ان لوگوں کے لیے جو بڑی جرأت مندی کے ساتھ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

تفسیر فی ظلال میں ہے کہ جس شخص کی اچھی نیت اور اچھے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے دل میں برے اعمال کے بارے میں ایک خاص قسم کی حساسیت پیدا کردیتا ہے۔ایسا شخص اپنے آپ کو اللہ کی سزا سے محفوظ نہیں سمجھتا۔لہٰذا نقصان اور ہلاکت سے بچنے کے لیے ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتا ہے، ہمیشہ شیطان کی چالوں سے محتاط رہتا

ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد کا منتظر رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہدایت اور گمراہی کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ (فی ظلال، ٦:٦٧٥)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (یا امام رضاؑ) کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام سے سوال کیا کہ خود پسندی جو انسان کے عمل کو باطل کر دیتی ہے، وہ کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

العجب درجات منها ان یزین للعبد سوء عمله فیراه حسنا فیعجبه و یحسب انه یحسن صنعا

یعنی عجب اور خود پسندی کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے اور ان پر خوش ہونے لگے اور اس حیرت میں ڈوب جائے کہ اس نے کتنا عمدہ کام انجام دیا ہے۔

چوتھی آیت میں ملکہ سباء اور ان حالات کا ذکر ہے جن کی خبر ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو دی تھی۔ ہدہد نے اپنی اطلاع میں کہا کہ میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیا ہے:

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سورج اور اس کی روشنی بہت باعظمت ہیں اور زندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں لیکن اس کا طلوع وغروب، بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے کے پیچھے اس کا پوشیدہ ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود طبیعی قوانین کا پابند ہے اور خود اس کی ذات میں کسی قسم کا کوئی ارادہ نہیں پایا جاتا۔ یہی دلیل اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ لیکن آباؤ اجداد کی غلط تعلیم وتربیت اور تکرارِ عمل کے نتیجہ میں اس عمل کا قبح (برائی) ان کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور یہ عمل انہیں ایک اچھے عمل کی صورت میں نظر آتا تھا۔

دنیا کے بعض ممالک میں گائیں پائی جاتی ہیں جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے ایسے اعمال انجام دیتے ہیں اور ان کے لیے ایسے مقام ومرتبہ کے قائل ہیں جنہیں دیکھ کر ہر خالی الذہن انسان ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ ان کے پجاری بڑی سنجیدگی سے ان کی پوجا میں مصروف ہوتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ہی عمل پر دوسرے ہنستے ہیں اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں، کیوں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بار بار اس عمل کو انجام دینے کی وجہ سے اس عمل کا قبح اور اس کی برائی کا تصور ان کے ہاں سے رخصت ہو گیا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں تزئین عمل کو شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے لیکن ظاہری بات ہے کہ شیطان کے بھی کچھ وسائل وذرائع ہیں جن میں سے ایک برے اعمال کا بار بار انجام دینا اوران کا عادی بن جانا ہے۔

پانچویں آیت میں بھی یہی حقیقت اختلافِ الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔اس آیت میں خطاب رسولؐ اللہ سے ہے۔ آپؐ سے کہا جارہا ہے:

''لوگوں سے کہئے کہ آیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں باخبر کردوں جوسب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں بھٹک کررہ گئی مگران کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔''

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جوسب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔جنہوں نے اپنی عمر کا قیمتی ترین سرمایہ یعنی جوانی اورفکروعمل کی طاقتیں غلط راستوں میں صرف کر کے برباد کردیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اچھے کام کیے ہیں اوران پر خوش ہوتے اورفخر کرتے ہیں۔

یہ لوگ اس بدبختی میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ برائی، بدکاری، ہوس پرستی اورخود پسندی کے نتیجہ میں ان کے عقل پر سیاہ پردہ پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکے ہیں اورحقائق ان کو اس طرح دکھائی ہی نہیں دیتے جس طرح حقیقت میں وہ ہوتے ہیں۔

اس بدبختی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اگلی آیت میں بیان ہورہا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کر چکے ہیں اور ان کے اعمال تباو برباد ہو چکے ہیں۔''

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ

اس آیت کی تفسیر میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں، ان میں ایسی عبارات نظر آتی ہیں جو اس آیت کے مصادیق میں سے کسی واضح مصداق کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ سب کے سب اس آیت کے اندرجمع ہیں۔بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد منکرین ولایت علیؑ ہیں۔بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ ان سے مراد مسیحی راہب ہیں جنہوں نے دنیا اور دنیوی لذتوں کو ترک کردیا ہے، حالانکہ ایسا کر کے وہ گمراہ ہوئے ہیں۔

بعض احادیث میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں بدعتیں ایجاد کیں۔بعض

میں خوارج نہروان اور بعض میں یہود ونصاریٰ کے بدعت گزار مراد لیے گئے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے اعمال گناہ اور جرائم پر مشتمل تھے جبکہ وہ خود اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے "حبطت اعمالھم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں "حبط" کے معروف معنی یہ ہیں کہ اونٹ یا کوئی اور جانور زیادہ یا زہریلی گھاس کھالے جس کے نتیجہ میں اس کا پیٹ پھول جائے اور وہ ہلاک ہوجائے۔ ظاہری بات ہے کہ ایسے اونٹ کا موٹا پا اس کی صحت کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسی بیماری کی علامت ہوتا ہے جو موت کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ بعض نادان لوگ اسے صحت اور طاقت کی علامت سمجھتے ہوں۔

بعض انسانوں کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر توانائی اور کوشش کو اپنی ہلاکت اور بدبختی کی راہ میں بروئے کار لاتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ سعادت اور خوش نصیبی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

چھٹی آیت میں توبہ کامل کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ توبہ ان لوگوں کو نصیب ہوگی جو اولاً تو جہالت اور نادانی کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں، وہ گناہ کے برے انجام اور اس کی سزا سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ثانیاً جلد ہی وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوجاتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے:

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓـئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝١٧

ظاہری بات ہے کہ یہاں جہالت سے مراد وہ جہالت نہیں ہے کہ انسان کو سرے سے اچھے اور برے کا علم ہی نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں برے عمل کو انجام دینے والا معذور ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد نسبی جہالت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہ کو تو جانتا ہے لیکن اس کے برے انجام سے پوری طرح آ گاہ نہیں ہوتا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "یتوبون من قریب" سے مراد موت سے پہلے توبہ کر لینا ہے۔ حالانکہ لفظ ''قریب'' کا اس سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ ممکن ہے موت سے پہلے توبہ کرنے والا گناہ سے پچاس سال بعد توبہ کررہا ہو۔ جو روایات ان مفسرین نے اپنے اس مؤقف کے حق میں بیان کی ہیں، وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان موت سے قبل بھی توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔

لیکن بعض دیگر مفسرین نے اس سے نزدیک کا زمانہ مراد لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جلد ہی اپنے برے کام سے پشیمان ہوکر اللہ کی طرف لوٹ آئے، اس لیے کہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے اثرات کو مکمل طور پر انسان کی روح اور جان سے دھوڈالے اور ان کا ذرا سا اثر بھی دل میں باقی نہ رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان جلد ہی (اس سے پہلے کہ گناہ کی جڑیں انسان کے وجود میں مضبوط ہوجائیں اور اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں) اس سے پشیمان ہوجائے۔ بصورتِ دیگر گناہ کے اثرات انسان کے قلب وجان

میں باقی رہ جانے کے غالب امکانات موجود رہتے ہیں۔پس کامل تو یہ وہی ہے جوجلد از جلد کی جائے۔لغت اورعرف کے لحاظ سے یہی معنی لفظ''قریب'' کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

ساتویں اور آخری آیت میں زکوٰۃ کا حکم اوراس کے آثارونتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

یعنی''مومنین سے زکوٰۃ وصول کرو۔''

آگے چل کرزکوٰۃ کے معنوی اوراخلاقی آثار کا ذکر کیا گیا ہے:

''آپ اس عمل سے ان کو پاک کریں گے اوران کونشوونما دیں گے۔''

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

واضح سی بات ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی انہیں دنیا پرستی اور بخل سے پاک کرتی ہے اوران میں انسان دوستی،سخاوت اوردوسروں کے حقوق کی حفاظت جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات ان کے اندر پیدا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ معاشرے میں فقر وتنگدستی کے نتیجہ میں جوخرابیاں پیدا ہوتی ہیں،وہ فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے برطرف ہو جاتی ہیں اورمعاشرہ ان کے منفی اثرات سے پاک ہوجاتا ہے۔پس زکوٰۃ نہ صرف رذائل اخلاق کے خاتمہ کا سبب بنتی ہے بلکہ زکوٰۃ دینے والے کوفضائل اخلاق سے آراستہ بھی کرتی ہے۔یہ وہی حقیقت ہے جس پر ہم یہاں بحث کررہے ہیں،یعنی اعمال نیک وبد کا فضائل ورذائل اخلاق کی پرورش میں کردار!

یہی بات حجاب سے متعلق آیت میں ایک اورپیرائے میں بیان ہوئی ہے:

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ

''جب تم ان سے کوئی استعمال کی چیز مانگوتو پردے کے پیچھے سے مانگو۔تمہارا یہ عمل تمہارے اوران کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے۔''(احزاب:۵۳)

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عمل میں عفت کا لحاظ رکھنے سے پاکیزگی قلب حاصل ہوتی ہے اوراس کے برعکس ترک عفت انسان کے قلب وروح کی آلودگی کی وجہ بنتی ہے اورذائل اخلاق کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر وتشریح کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق کی تشکیل میں اہم

کردار ادا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خودسازی اور تزکیہ نفس کے لیے ہمیں اپنے اعمال پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ برے اعمال کو مکرر انجام دینے سے ایک تو ان کے برا ہونے کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کی روح ان کی عادی ہوجاتی ہے اور بات یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان ان اعمال کے ارتکاب سے نہ صرف یہ کہ رنجیدہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر بھی کرنے لگتا ہے۔

اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں

مندرجہ بالا آیات میں اخلاق پر اعمال کے اثر کے حوالہ سے جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، احادیث میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ان کا ذکر ہوا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مامن عبدالا وفی قلبه نكته بيضاء فاذا اذنب ذنبا خرج فی النكتة نكتة سوداء فان تاب ذهب ذلك السواد، وان تمادى فی الذنوب زاد ذلك السواد حتى يغطى البياض، فاذا غطى البياض لم يرجع صاحبه الى خير ابدا، وهو قول الله عزوجل: كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون

"ہر انسان کے دل میں ایک روشن نکتہ ہوتا ہے۔ جب وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس روشن نکتہ پر ایک سیاہ نکتہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلے تو وہ سیاہ نکتہ مٹ جاتا ہے۔ اگر وہ گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرتا رہے تو یہ سیاہ نکتہ بھی پھیلتا جاتا ہے، یہاں تک کہ روشن نکتہ کو پوری طرح سے ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر وہ شخص کبھی نیکی کی طرف واپس نہیں جاسکتا۔ یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس طرح وہ سوچتے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو لگ گئے ہیں۔" (اصولِ کافی، ۲: ۲۷۳)

یہ حدیث اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ جب انسان پے در پے گناہ کرتا رہے تو اس کا دل تاریک ہوجاتا ہے اور یہ تاریکی رذائل اخلاق کا سبب بنتی ہے اور انسان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ نیکی کی طرف واپسی کے راستے اس پر بند ہوجاتے ہیں۔

۲۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

ان الخير عادة

"نیکی ایک عادت ہے۔" (بحار الانوار، ۷۴: ۲۳۲)

اسی مضمون پر مشتمل ایک حدیث نبویؐ میں ہے:

الخیر عادۃ والشر لجاجۃ

''نیکی عادت ہے اور شر لجاجت ہے۔'' (کنز العمال، حدیث: ۲۸۷۲۲)

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

احب لمن عود منکم نفسہ عادۃ من الخیر ان یدوم علیھا

''میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے کسی اچھی بات کو اپنایا ہے تو اس پر قائم رہے۔''

(بحار الانوار، ۹۹:۶۴)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ کسی اچھے یا برے عمل کو مکرر انجام دینے کے نتیجہ میں انسان کے نفس میں اس عمل کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اچھے یا برے اعمال اچھے یا برے اخلاق کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں جبکہ اچھے یا برے اخلاق، اچھے یا برے اعمال کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے مشہور وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

وعود نفسك التصبر علی المکروہ، ونعم الخلق التصبر فی الحق

''مشکلات کے مقابلہ میں اپنے اندر صبر کی عادت پیدا کرو، اس لیے کہ راہ حق میں صبر ایک عمدہ صفت ہے۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۳۱)

یہاں بھی ہم تکرارِ عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی عادت اور صبر کے درمیان باہمی تعلق کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

۴۔ گناہ سے توبہ کے بارے میں بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ توبہ کرنے میں جلدی کرنی چاہیے اور توبہ میں تاخیر سے اجتناب کرنا چاہیے (ورنہ گناہ کے اثرات دل میں باقی رہ جائیں گے جو وقت گزرنے کے ساتھ ایک پختہ عادت کا موجب بن جاتے ہیں)۔

ایک حدیث میں امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

تاخیر التوبۃ اغترار، وطول التسویف حیرۃ .... والاصرار علی الذنب امن لمکر اللہ

''توبہ میں تاخیر دھوکہ اور غفلت کا سبب بنتی ہے، ..... تاخیر کا طولانی ہو جانا حیرت و سرگردانی کا سبب بنتا ہے اور گناہ پر اصرار اللہ کی پکڑ سے غفلت کا باعث بنتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۳۰:۶)

ایک اور حدیث نبویؐ میں توبہ کے بارے میں یہ خوبصورت تعبیر نظر آتی ہے:

من تاب، تاب الله عليه و امرت جوارحه ان تستر عليه، و بقاع الارض ان تكتم عليه و انسيت الحفظة ما كانت تكتب عليه

''جو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے، اللہ بھی اس کی طرف لوٹتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہوں کو پوشیدہ رکھیں، زمین کے ان حصوں کو جن پر اس نے گناہ کیے تھے اور نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی یہی حکم دیا جاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اسے فراموش کر دیں۔'' (کنز العمال: ۷۹)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ توبہ گناہ کے اثرات کو محو کر کے قلب کی پاکیزگی اور تقدس کو بحال کر دیتی ہے۔

یہی بات مزید واضح طور پر حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

التوبة تطهر القلوب و تغسل الذنوب

''توبہ قلب کو پاک کر دیتی ہے اور گناہوں کو دھو دیتی ہے۔'' (غرر الحکم: ۷۸۳۴)

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گناہ دل پر برے اثرات چھوڑ جاتا ہے جو بتدریج ایک باطنی کیفیت اور اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ توبہ ان اثرات کو مٹا دیتی ہے اور ان کو ایک مستقل اخلاقی کیفیت میں تبدیل ہونے سے روک دیتی ہے۔

کئی اور احادیث میں بھی توبہ کو طہور قرار دیا گیا ہے جو کہ گناہ اور بری باطنی خصوصیات کی تشکیل کے باہمی ربط کی نشاندہی کرتا ہے۔ (بحار الانوار، ۶۹: ۱۲۱ اور ۹۱: ۱۴۳)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی معروف پندرہ مناجات میں سے ایک تائبین کی مناجات ہے، اس مناجات میں ہے:

و امات قلبي عظيم جنايتي فاحيه بتوبة منك يا املي و بغيتي

''اے میرے رب! میرے بڑے بڑے گناہوں نے میرے دل کو مردہ کر دیا ہے، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو توبہ کے ذریعے اسے زندہ کر دے، اے میری امید اور اے میری آرزو!''

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ گناہ انسان کی روح اور قلب کو آلودہ کر دیتا ہے اور تکرارِ گناہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب مردہ ہو جاتا ہے۔ توبہ دل کی زندگی اور روح کی نشاط کو بحال کرتی ہے۔

لہٰذا رہروانِ راہِ فضیلت اور سالکانِ الٰہی پر لازم ہے کہ فضائل اخلاقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے اچھے اور برے اعمال کے مثبت اور منفی اثرات پر کڑی نظر رکھیں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح اور اس کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اعمال اچھے اور پاکیزہ ہوں تو روح پر اچھے اور پاکیزہ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر اعمال برے اور ناپاک ہوں تو روح پر برے اور ناپاک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق

ممکن ہے کہ پہلی نظر میں بعض لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ خوراک کس طرح اخلاق اور نفسی کیفیات پر اثر انداز ہوسکتی ہے؟ اس لیے کہ خوراک کا تعلق تو براہِ راست جسم سے ہے جبکہ اخلاق کا تعلق روح سے ہے۔لیکن اگر جسم اور روح کے باہمی تعلق پر غور کیا جائے تو یہ تعجب اور حیرت برطرف ہو جاتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نفسیاتی بحران یا شدید رنج وغم کی وجہ سے قلیل سی مدت میں انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے، انسان کے بال سفید ہو جاتے ہیں، نظر کمزور ہو جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔اس کے برعکس اچھی جسمانی کیفیت انسان کی روح پر مثبت اثرات مرتب کر کے اس کو شاداب اور بانشاط بنا دیتی ہے۔

زمانۂ قدیم سے اہل علم ودانش انسان کے اخلاق پر اس کی خوراک کے اثرات کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے ہیں اور یہ باتیں لوگوں کی ثقافت کا حصہ بھی بن چکی تھیں کہ مثال کے طور پر خون پینے کو سنگدلی کا سبب سمجھا جاتا تھا اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ صحت مند عقل ایک صحت مند جسم میں ہی ہوسکتی ہے۔

قرآن آیات اور احادیث میں بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ میں یہودیوں کی ایک جماعت کے بارے میں، جو اسلام کے خلاف جاسوسی اور کتاب خدا میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔''

اس کے فوراً بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ

''وہ آپ کی باتوں کو بہت زیادہ سنتے ہیں تاکہ انہیں جھٹلائیں اور بہت حرام خواری کرتے ہیں۔''

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی یہ قلبی کیفیت آیات الٰہی کی تکذیب اور مسلسل حرام خوری کا نتیجہ تھی، اس لیے کہ اگر ان اوصاف کا ''لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم'' سے کوئی تعلق نہ ہو تو یہ فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے انتہائی غیر معیاری گفتگو قرار پائے گی۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حرام خوری آئینہ دل کے تاریک ہو جانے، دل پر اخلاق رذیلہ کے اثر اور فضائل اخلاقی سے دوری کا سبب ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۹۱ میں اللہ تعالیٰ شراب اور جوئے کے بارے میں فرماتا ہے:

''شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے۔''

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

اس میں کوئی شک نہیں کہ بغض وعداوت دو باطنی اور اخلاقی خصوصیات ہیں جن کا اس آیت میں شراب خواری کے ساتھ گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حرام خوراک کھانا اور شراب خواری دشمنی اور لڑائی، جھگڑے کی ایجاد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سورۂ مومنون، آیت ۵۱ میں ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ط

یعنی ''اے رسولو! پاکیزہ خوراک کھاؤ اور اعمالِ صالح انجام دیتے رہو۔''

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پاکیزہ خوراک کھانے اور عمل صالح کے درمیان ایک تعلق ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کی خوراکیں کھانے کے مختلف اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حلال اور پاکیزہ خوراک روح کو پاک کرتی ہے اور اعمالِ صالحہ کا سبب بنتی ہے جبکہ ناپاک اور حرام خوراک روح کی تاریکی اور برے اعمال کا سبب بنتی ہے۔

تفسیر روح البیان میں عمل صالح اور پاکیزہ خوراک کے باہمی تعلق کا ذکر کرنے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار سے استدلال کیا گیا ہے: (ترجمہ اشعار از مترجم)

علم و حکمت زاید از لقمہ حلال
عشق و رقت آید از لقمہ حلال

(علم وحکمت کا سبب رزق حلال، عشق ورقت کا سبب رزق حلال)

لقمہ تخم ہا است و برش اندیشہ ہا
لقمہ بحرا گوہرش اندیشہ ہا

(رزق بیج، اس کا ثمر فکر وخیال، رزق بحر، اس کا گہر فکر وخیال)

ایک اور شعر میں کہا گیا ہے: (تفسیر روح البیان ۶:۸۸)

قطرہ باران توچون صاف نیست
گوہر دریائے تو شفاف نیست

(تیری بارش کے قطرے صاف نہیں ہیں، اس لیے تیرے سمندر کے موتی شفاف نہیں ہیں)

تفسیر اثناعشری میں بھی اس آیت کے ذیل میں قلبی پاکیزگی اور اعمالِ صالحہ کے رزق حلال کے ساتھ تعلق کی طرف اشارہ کیا

گیا ہے۔

خوراک اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں

قرآن شریف میں اگرچہ اس تعلق کے بارے میں صرف چند اشارات پائے جاتے ہیں مگر احادیث میں یہ بات بہت تفصیل کے ساتھ نظر آتی ہے۔نمونے کے طور پر ہم ذیل میں چند احادیث بیان کرتے ہیں:

ا۔ متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ رزقِ حرام سے اجتناب کیا جائے۔ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''یا رسولؐ اللہ! میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو۔''

آپؐ نے فرمایا:

طهر ما كلك ولا تدخل بطنك الحرام

''اپنی خوراک پاکیزہ رکھو اور اپنے پیٹ میں حرام داخل نہ کرو۔''(بحارالانوار،۹۰:۳۷۳)

ایک اور حدیث میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

من احب ان يستجاب دعائة فليطيب مطعمه و مكسبه

''جو شخص یہ چاہتا ہوں کہ اس کی دعا قبول ہو، وہ اپنی خوراک اور پیشہ پاکیزہ رکھے۔''(بحارالانوار، ۹۰:۳۷۲)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله لا يستجيب دعاء بظهر قلب قاس

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا جو قساوت قلبی کا شکار ہو۔''(بحارالانوار ۹۰:۳۰۵)

ان سب احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ناپاک اور حرام خوراک قساوت قلب کا سبب ہوتی ہے،اسی وجہ سے حرام خوار کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔یہاں سے روح و دل کی ناپاکی اور رزق حرام کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن کوفہ کی سنگدل فوجوں کے سامنے خطبہ دینے کا ارادہ فرمایا مگر جب آپ نے خطبہ شروع کیا تو وہ خطبہ سننے پر آمادہ نہ ہوئے اور شور و غل کرنے لگے۔اس پر آپؑ نے فرمایا:

ملئت بطونكم من الحرام فطبع الله على قلوبكم

''چونکہ تمہارے پیٹ حرام سے بھرے ہوئے ہیں،لہٰذا اللہ نے تمہارے دلوں پر مہر لگا دی ہے(اور تم

حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہو)۔" (سخنان حسین علیہ السلام ابن علی علیہ السلام از مدینہ تا کربلا: ۲۳۲)

۲۔ متعدد احادیث میں رزق حرام اور عبادات کی عدم قبولیت کے درمیان باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من اکل لقمۃ حرام لن تقبل لہ صلوۃ اربعین لیلۃ، ولم تستجب لہ دعوۃ اربعین صباحاو کل لحم ینبتہ الحرام فالنار اولی بہ و ان اللقمۃ الواحدۃ تنبت اللحم

"جو شخص حرام کا ایک لقمہ کھائے گا، چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی، چالیس روز تک اس کی دعا مستجاب نہ ہوگی، رزق حرام سے جو گوشت اس کے جسم پر پیدا ہو، وہ جہنم کے لیے زیادہ موزوں ہے اور ایک لقمہ بھی گوشت کی پیدائش میں موثر ہوتا ہے۔" (سفینۃ البحار، ا، مادہ اکل)

ظاہری بات ہے کہ قبولیت نماز کی کئی شرائط ہیں جن میں حضورِ قلب اور پاکیزگی دل بھی شامل ہیں۔ لیکن رزقِ حرام قلب کی پاکیزگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

۳۔ رسولؐ اللہ سے مروی متعدد احادیث میں ہے:

من ترك اللحم اربعين صباحا ساء خلقه

"جو شخص چالیس روز گوشت نہ کھائے، وہ بداخلاق ہو جائے گا۔" (وسائل الشیعہ، ۱۷:۲۵)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گوشت میں ایسے مواد موجود ہیں کہ اگر چالیس دن تک انسان ان سے دور رہے تو اس کا انسان کے اخلاق اور باطنی کیفیات پر یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان بداخلاق ہو جاتا ہے۔

البتہ بعض احادیث میں گوشت کے زیادہ استعمال کی مذمت بھی کی گئی ہے لیکن زیادہ عرصہ تک گوشت کے ترک کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

۴۔ بہت سی احادیث میں جو "کتاب الاطعمہ والاشربہ" میں بیان ہوئی ہیں، بعض غذاؤں اور اچھے یا برے اخلاق کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

عليكم بالزيت فانه يكشف المرة...... ويحسن الخلق

"روغن (یعنی زیتون کا تیل یا کوئی اور تیل) استعمال کیا کرو۔۔۔۔۔۔ یہ صفراء کو ختم کرتا ہے اور اخلاق کو بہتر کرتا ہے۔" (وسائل الشیعہ، ۱۷:۲۵)

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من سرہ ان یقل غیظه فلیاکل الحم الدراج

''جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کا غصہ کم ہو جائے تو وہ تیتر کا گوشت کھائے۔'' (فروع کافی،۶: ۳۱۲)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک، غصے اور حلم کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ تفسیر عیاشی میں ایک مفصل روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خون کو کیوں حرام قرار دیا ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

واما الدم فانه یورث الکلب و قسوۃ القلب و قلة الرافة والراحمة لا یومن ان یقتل ولدہ ووالدیه.........

''اللہ تعالیٰ نے خون اس لیے حرام کیا ہے کہ یہ دیوانگی، سنگدلی اور رحمت کی کمی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان اپنے بیٹے یا والدین کو قتل کر ڈالے۔'' (تفسیر برہان ۱: ۴۳۴ مستدرک الوسائل ۱۴: ۱۶۳)

اسی حدیث کے ایک اور حصے میں آیا ہے،

و اما الخمر فانه حرمها لفعلها و فسادها وقال ان مدمن الخمر کعابد الوثن ویورث ارتعاشا ویذھب بنورہ ویھدم مروته

''اور اللہ نے شراب کو اس کے منفی اثرات کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔ عادی شراب خوار انسان بت پرست کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرے کی نورانیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مروت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔''

۷۔ متعدد احادیث میں انگور کھانے اور غم واندوہ کے برطرف ہونے کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

شکی نبی من الانبیاء الی اللہ عزوجل الغم فامرہ اللہ عزوجل بالکال العنب (کافی،۶: ۳۵۱)

''ایک نبی نے اللہ تعالیٰ سے غم واندوہ کی شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں انگور کھانے کا حکم دیا۔''

اس حدیث میں خوراک اور اخلاقیات کے باہمی تعلق پر مزید تاکید نظر آتی ہے۔

۸۔ کئی احادیث میں انار کھانے اور شیطانی وسوسوں کے خاتمے اور نورانیت قلب کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک

حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من اکل رمانہ علی الریق انارت قلبہ اربعین یوما

''جو شخص نہار منہ ایک انار کھائے، چالیس دن تک اس کا دل نورانی رہے گا۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۹۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر ابن ابی طالبؑ سے فرمایا:

یاجعفر کل السفرجل فانہ یقوی القلب و یشجع الجبان

''اے جعفر! ''بہی'' کھایا کرو، یہ دل کو قوت دیتی ہے اور بزدلی کا خاتمہ کرتی ہے۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۱۰۔ بعض احادیث میں ضرورت سے زیادہ کھانے اور سنگدلی، قساوت اور نصیحت کا اثر نہ ہونے کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب ''اعلام الدین'' میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

ایاکم وفضول المطعم فانہ یسم القلب بالقسوۃ ویبطیء بالجوارح عن الطاعۃ ویصم الھمم عن سماع الموعظۃ

''ضرورت سے زائد کھانا کھانے سے اجتناب کرو کیونکہ یہ قساوت قلب، عبادت میں سستی و کاہلی کا سبب ہوتا ہے اور نصیحت سننے کے معاملہ میں کانوں کو بہرہ کر دیتا ہے۔''

بحار الانوار اور اہل سنت کی بعض روایات میں بھی یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہے۔

(بحار الانوار، ۷۴:۱۸۲)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ضرورت سے زائد غذا کے تین منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے دل میں قساوت پیدا ہوتی ہے، انسان عبادات و فرائض کی انجام دہی میں سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے اور نصیحت کو سننے اور سمجھنے والی سماعت سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے کہ جب انسان نے زیادہ اور ثقیل کھانا کھایا ہوتا ہے تو وہ عبادات کو بمشکل انجام دیتا ہے اور اس کی عبادت میں کوئی نشاط و سرور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر انسان نے کم اور سادہ کھانا کھایا ہو تو صبح کی اذان سے پہلے بیدار ہو جاتا ہے اور عبادت و مطالعہ کے لیے اس کی حالت بہت اچھی ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ جب انسان روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور نصیحت کو قبول کرنے کے لیے بہتر آمادگی اس میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو اس وقت اس کا ذہن اور سوچ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتے اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے دور محسوس کرتا ہے۔

۱۱۔ احادیث میں شہد کھانے اور دل کی پاکیزگی کے باہمی ربط کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(بحارالانوار، ۶۳: ۲۹۴)

العسل شفاء من کل داء ولا داء فیه یقل البلغم و یجلی القلب

''شہد تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور خود اس میں کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ بلغم کو کم اور دل کو روشن کرتا ہے۔''

نتیجہ

مذکورہ بالا احادیث اور اس مضمون کی دیگر احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ غذا اور باطنی کیفیات اور اخلاقیات کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خوراک اچھے یا برے اخلاق کی علت تامہ ہےلیکن اتنا ضرور ہے کہ مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خوراک اخلاق کی پاکیزگی کی راہ ہموار کرنے میں موثر کردارادا کرتی ہے،حرام وحلال کے لحاظ سے بھی اور کمیت وکیفیت کے اعتبار سے بھی۔

موجودہ دور کے سائنسدانوں اور محققین کا کہنا بھی ہے کہ بہت سی اخلاقی کیفیات کا تعلق ان ہارمونز سے ہے جو مختلف حالات میں ہمارے بدن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اوران کا ہماری خوراک سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ہر جانور کے گوشت میں اس جانور کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جولوگ یہ گوشت کھاتے ہیں، ان کے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ درندوں کا گوشت انسان میں درندگی پیدا کرتا ہے،سور کا گوشت جنسی بے راہ روی کا باعث ہوتا ہے۔

اس طرح معنوی تعلق کے علاوہ خوراک اور اخلاقیات کے درمیان مادی اور طبیعی تعلق بھی پایا جاتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔حرام غذائیں دل کو تاریک کر دیتی ہیں اور اخلاقی خوبیوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔

ہم اس بحث کو اس واقعہ کا ذکر کر کے ختم کرتے ہیں جسے مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے:

مسعودی، فضل بن ربیع سے روایت کرتا ہے کہ ایک دن شریک بن عبداللہ، عباسی خلیفہ مہدی کے پاس گیا۔ مہدی نے اسے کہا کہ ان تین کاموں میں سے ایک کام تمہیں ہر حال میں کرنا پڑے گا: قاضی کا عہدہ قبول کر دیا میرے بیٹے کے استاد بن جاؤ یا ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔شریک نے ذرا سوچا اور کہا کہ تیسرا کام سب سے آسان ہے۔ مہدی نے اسے روکا اور باورچی کو انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار کرنے کو کہا۔ جب شریک اس لذیذ (اور حرام) کھانے سے فارغ ہوا تو باورچی نے مہدی کی طرف منہ کر کے کہا:

''یہ کھانا کھانے کے بعد یہ شخص کبھی فلاح وسعادت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔اس کے بعد شریک نے قاضی کا عہدہ بھی قبول کر لیا اور اس کے بیٹے کو تعلیم دینے پر بھی آمادہ ہو گیا۔(مروج الذہب، ۳: ۳۱۰،سفینۃ البحار، مادہ شرک)

اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کے اعمال اس کی اندرونی صفات کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اندرونی صفات کی حیثیت جڑ کی سی ہوتی ہے جبکہ اعمال کی حیثیت شاخ اور پھل کی سی ہوتی ہے۔

اسی لیے اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، مثلاً نفاق جو صفاتِ رذیلہ میں سے ہے، انسان کے اندر اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ یہ صفت انسان کے اندر خلافِ توحید، دوہری شخصیت کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے اور یہی خصوصیت منافقانہ اور ریاکارانہ اعمال کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔

حسد ایک باطنی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان کسی شخص سے اس لیے جلتا ہے کہ اللہ نے اسے کوئی نعمت عطا کر رکھی ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے ان اعمال سے کرتا ہے جو وہ اس کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکانے اور مشکلات پیدا کرنے کے لیے انجام دیتا ہے۔

تکبر اور غرور بھی وہ اندرونی صفات ہیں جو اس لیے انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے مقام اور قدر و منزلت سے آشنا نہیں ہوتا یا پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے معاملہ میں کم ظرف ثابت ہوتا ہے۔ جب انسان دوسروں کی تحقیر اور تذلیل کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی اسی صفت رذیلہ کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق نے کتب اخلاق میں عام طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے بلکہ کبھی وہ اسباب و وجوہات کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی نتائج کا۔ اول الذکر کو اخلاقی صفات اور ثانی الذکر کو اخلاقی اعمال کا نام دیا جاتا ہے۔

البتہ اخلاقی اعمال علم فقہ کا موضوع ہیں اور فقہاء فقہی نقطہ نظر سے ان پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے باوجود علمائے اخلاق ان کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ البتہ علم اخلاق کے عالم اور فقیہ کے زاویۂ نگاہ میں فرق ہوتا ہے۔ فقیہ ان اعمال کے بارے میں وجوب، استحباب، کراہت اور اباحت کے حوالہ سے بات کرتا ہے اور کبھی ثواب وعقاب کے حوالہ سے ان افعال کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن علم اخلاق کا عالم ان افعال کا اس لحاظ سے مطالعہ کرتا ہے کہ یہ انسان کے روحانی کمال یا انحطاط کا مظہر ہیں۔

بارھواں باب

تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم

اس فصل میں ہم ان امور کو زیر بحث لائیں گے جو فضائل اخلاق کی پرورش کیلئے زمین کو ہموار کرتے ہیں اور قدم بقدم انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔ علم اخلاق میں اس بحث کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اس میں بہت سے امور کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

پہلا قدم توبہ

بہت سے علمائے اخلاق نے توبہ کو تہذیب اخلاق اور سیر الی اللہ کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ ایسی توبہ جو صفحۂ قلب کو آلائشات سے پاک کردے، تاریکیوں کو روشنی سے بدل دے، انسان کی پشت سے گناہوں کا بوجھ اتار کر اسے ہلکا کردے تاکہ وہ آسانی سے قرب الٰہی کا راستہ طے کرسکے۔

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضا کی ساتویں جلد کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''گناہ سے توبہ اور ستار العیوب اور علام الغیوب کی بارگاہ کی طرف واپس آنا سالکین کے سفر کا نقطۂ آغاز، فلاح پانے والوں کا سرمایہ، مریدانِ حق کا پہلا قدم، اہل محبت کی کلید، برگزیدگانِ الٰہی کیلئے صبح روشن کا طلوع اور مقربانِ الٰہی کا پسندیدہ عمل ہے۔''

اس کے بعد وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان لغزشوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے اور حضرت آدمؑ کی لغزش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس میں کیا مشکل ہے، سب فرزندانِ آدمؑ ارتکابِ خطا کے بعد حضرت آدمؑ کی پیروی کریں، اس لئے کہ صرف اعمالِ خیر کا صدور تو فرشتوں سے ہوسکتا ہے جبکہ برائی کی تلافی نہ کرنا شیاطین کی خصوصیت ہے اور شر کے بعد خیر کی طرف پلٹنا انسان کی طبیعت ہے۔ جو شخص ارتکاب گناہ کے بعد خیر کی طرف واپس پلٹ آتے ہیں، وہی انسان ہیں۔

درحقیقت توبہ دین کی بنیاد ہے، اس لئے کہ دین انسان کو برائیوں سے دوری اور اعمالِ خیر کے قریب ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر توبہ کو نجات بخش صفات واعمال کے ذکر میں مقام اول دیا جائے۔'' (محجۃ البیضا، ۷:۶ تا ۷)

بالفاظِ دیگر اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان، خاص طور پر سیر وسلوک الی اللہ کے آغاز میں، خطاؤں اور لغزشوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر توبہ کے دروازے اس پر بند کردیئے جائیں تو وہ مایوس ہوکر قرب الٰہی کے سفر کو ہمیشہ کیلئے ترک کردے۔ اسی لئے اسلام کے تربیتی نظام میں توبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور تمام گناہگاروں کو دعوت دی گئی ہے کہ اپنی اصلاح کیلئے اور ماضی کی تلافی کیلئے رحمتِ

الٰہی کے اس دروازے سے قربِ الٰہی کی طرف سفر کا آغاز کریں۔

اس حقیقت کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے مناجاتِ تائبین میں خوبصورت ترین پیرائے میں بیان کیا ہے:

الهی انت الذی فتحت لعبدك بابا الی عفوك سميته التوبة فقلت توبوا الی الله توبة نصوحا، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحه

اے میرے معبود! تو نے اپنے بندوں کیلئے اپنے عفو و درگزر کی طرف ایک دروازہ کھولا ہے جسے تو نے توبہ کا نام دیا ہے اور تو نے حکم دیا کہ اللہ کی طرف خالص توبہ کرو۔ اب جبکہ دروازہ کھلا ہے، کوئی اس دروازے سے نہ گزرے تو اس کے پاس کیا عذر باقی ہے!" (بحارالانوار، ۹۴: ۱۴۲، مفاتیح الجنان، مناجات التائبین)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ کو بہت پسند کرتا ہے، اس لئے کہ انسان کی ہر سعادت کا پہلا قدم توبہ ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله تعالی اشد فرحا بتوبة عبده من رجل اضل راحلته وزاده فی لیلة ظلماء فوجدها

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی شخص دورانِ سفر، تاریک رات میں، بیابان میں اپنی سواری اور زادِ راہ کے گم ہو جانے کے بعد اس کے دوبارہ مل جانے پر خوش ہوتا ہے۔" (اصولِ کافی، ۲: ۴۳۵)

یہ بیان جو کہ بہت سے لطیف کنایات پر مشتمل ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ توبہ سواری بھی ہے اور زادِ راہ بھی، تا کہ انسان اس کے ذریعے گناہ کی تاریک وادی سے آگے گزر جائے اور نور و رحمت کی منزل اور اعلیٰ انسانی صفات تک پہنچ جائے۔

توبہ کی بحث کے ذیل میں بہت سے امور آتے ہیں جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:

۱۔ حقیقتِ توبہ
۲۔ وجوبِ توبہ
۳۔ توبہ کی عمومیت
۴۔ ارکانِ توبہ
۵۔ توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی
۶۔ جزئی توبہ
۷۔ توبہ کا دوام
۸۔ توبہ کے درجات
۹۔ توبہ کے نتائج و برکات

ا۔ حقیقت توبہ

اصل میں توبہ کے معنی ہیں گناہ سے واپس پلٹنا۔ یہ اس صورت میں ہے جب اس کی نسبت گنہگار شخص کی طرف دی گئی ہو۔ جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے شراب نوشی سے توبہ کر لی۔لیکن قرآن شریف اور احادیث میں متعدد مقامات پر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی گئی ہے۔اس صورت میں اس کے معنی رحمت کی طرف واپسی کے ہیں۔وہ رحمت جو گناہ کی وجہ سے سلب کر لی جاتی ہے، جب بندہ عبادت کی راہ پر واپس آتا ہے تو اللہ کی رحمت بھی اس کی طرف واپس ہو جاتی ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''تواب'' ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ رحمت واپس بھیجنے والا یا بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا۔

درحقیقت توبہ کا لفظ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان مشترک معنوی یا مشترک لفظی ہے۔لیکن جب اسے بندوں کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''الیٰ'' استعمال ہوتا ہے اور جب اسے اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''علیٰ'' استعمال ہوتا ہے۔

محجۃ البیضاء میں توبہ کی حقیقت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ توبہ کے تین ارکان ہیں: علم، حال اور فعل۔ان تینوں میں سے ہر ایک دوسرے کی علت ہے۔

علم سے مراد گناہوں کے نقصانات کا علم ہے اور یہ کہ بندے کو اس بات کا علم ہو کہ گناہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے تو اس کا دل اس بات پر غمگین ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے دور ہو گیا ہے۔چونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کے عمل کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے تو وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے۔یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اس کے اندر ایک عزم اور ارادہ پیدا کرتی ہے۔

حال میں وہ اس عمل کو ترک کر دیتا ہے۔مستقبل کے بارے میں وہ عزم کرتا ہے کہ پھر اس عمل کو انجام نہ دے گا جو محبوب سے دوری کا سبب بنتا ہے اور ماضی کے حوالے سے وہ تلافی کی کوشش کرتا ہے۔

درحقیقت علم اور یقین کا نور انسان کے اندر وہ حالت پیدا کر دیتا ہے جو ندامت اور پشیمانی کا سرچشمہ بنتی ہے۔یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے لحاظ سے مذکورہ بالا تین اقدامات کا سبب بنتی ہے (محجۃ البیضاء)

یہ وہی حقیقت ہے جسے بعض اہل معرفت روحی انقلاب کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توبہ انسان کی روح اور جان کے اندر پیدا ہونے والا انقلاب ہے جو انسان کو اپنی زندگی کے تمام معمولات میں نظر ثانی کی دعوت دیتا ہے۔

۲۔ وجوب توبہ

تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ توبہ واجب ہے۔قرآن مجید میں بار بار توبہ کا حکم دیا گیا ہے، سورۂ تحریم، آیت ۸

میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، خالص توبہ، امید ہے کہ اس طرح تمہارا رب تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمہیں جنت کے باغات میں داخل کرے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔''

جب بھی اللہ تعالی نے گمراہ اقوام کی ہدایت کے لیے کوئی نبی بھیجا تو ان کی تبلیغ کا پہلا قدم یہ تھا کہ انہوں نے توبہ کی طرف دعوت دی۔ اس لیے کہ توبہ اور دلوں کو گناہوں کے اثرات سے پاک کئے بغیر ممکن ہی نہیں کہ دل میں توحید اور اخلاقی فضائل کیلئے کوئی جگہ پیدا ہو سکے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے پہلی بات یہ کہی:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ

''اے میری قوم! اللہ سے مغفرت طلب کرو پھر اس کی بارگاہ میں توبہ کرو۔'' (ہود: ۵۲)

یہی بات حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اس طرح کہی:

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ

''پس تم اس سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو۔'' (ہود: ٦١)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم کو دعوت کا آغاز اس دعوت سے کیا:

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

''پس تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو کیونکہ میرا رب بہت مہربان ہے اور (توبہ کرنے والوں) سے محبت کرتا ہے۔'' (ہود: ۹۰)

احادیث میں بھی گناہ کے بعد فوراً توبہ کرنے پر بہت تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام حضرت امام حسن علیہ السلام کے نام اپنی وصیت میں فرماتے ہیں:

وان قارفت سيئة فعجل محوها بالتوبة (بحار الانوار ۲۰۸:۷۴، نہج البلاغہ)

''اگر تم گناہ کے مرتکب ہو جاؤ تو جس قدر جلدی ممکن ہو اسے توبہ کے ذریعے مٹا دو۔''

اس حقیقت کے پیش نظر کہ امام سے گناہ سرزد نہیں ہوتا، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس جملے کا مقصد عام لوگوں کو

نصیحت کرنا ہے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ عبداللہ ابن مسعود سے فرماتے ہیں:

یا بن مسعود لا تقدم الذنب ولا توخر التوبة، ولکن قدم التوبة واخر الذنب

''گناہ کو مقدم اور توبہ کو موخر نہ سمجھو بلکہ توبہ کو مقدم اور گناہ کو موخر رکھو۔''

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مسوف نفسه بالتوبة من هجوم الاجل علی اعظم الخطر

''موت کے خطرہ کی موجودگی میں جو شخص توبہ میں تاخیر کرتا ہے، وہ سب سے بڑے خطرے سے دوچار ہے (کہ اس کی عمر تمام ہوجائے اور اس نے توبہ نہ کی ہو)۔'' (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام علی رضاؑ رسولؐ اللہ سے نقل فرماتے ہیں، (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

لیس شیء احب الی الله من مومن تائب او مومنة تائبة

''توبہ کرنے والے مومن یا مومنہ سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کو محبوب نہیں ہے۔''

یہ عبارت توبہ کے وجوب کی دلیل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اس میں توبہ کو اللہ کی محبوب ترین چیز کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ توبہ کے وجوب پر بڑی واضح عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ عذاب الٰہی سے بچنے کی راہ ضرور تلاش کرنی چاہئے، خواہ اللہ کا عذاب یقینی ہو یا احتمالی۔ چونکہ توبہ بہترین وسیلہ نجات ہے، عقل اسے واجب قرار دیتی ہے۔ اگر گناہگار افراد توبہ نہ کریں تو وہ دنیا اور آخرت میں کس طرح اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں!

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ازروئے قرآن و حدیث و عقل توبہ واجب ہے اور توبہ کے واجب ہونے پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں۔ بنابرایں ازروئے ادلہ اربعہ توبہ واجب ہے اور اس کا وجوب بھی فوری ہے، جیسا کہ ان چاروں دلائل سے واضح ہے۔

علم اصولِ فقہ میں بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ تمام اوامر و نواہی پر فوری عمل کرنا واجب ہے مگر یہ کہ دلیل سے ثابت ہو کہ فوریت ضروری نہیں ہے۔

۳۔ توبہ کی عمومیت

توبہ کسی خاص گناہ، خاص فرد یا افراد، کسی خاص زمانے یا خاص عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر گناہ سے توبہ کرنا، ہر فرد پر اور ہر زمان و مکان میں واجب ہے۔ اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں صرف ان لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جو عالم برزخ کی دہلیز پر پہنچ کر یا عذابِ خدا کو دیکھ کر توبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ (جیسے فرعون، جس نے دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہوتے وقت کہا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)۔

اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔اس وقت کی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے، اختیاری نہیں۔قرآن شریف میں ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

''ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ انہیں سے کسی کی موت آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی، اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قابل قبول نہیں ہے جو حالت کفر پر مر جاتے ہیں۔ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (نساء:۱۸)

فرعون کے واقعہ میں ہے کہ جب وہ دریائے نیل میں بننے والے خشک راستے میں داخل ہوا اور اچانک پانی کی لہروں نے اسے گھیر لیا تو اس نے کہا:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

''میں ایمان لایا کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمین میں سے ہوں۔'' (یونس:۹۰)

لیکن فوراً اس نے یہ جواب بھی سن لیا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

''اب ایمان لا رہے ہو؟ حالانکہ اس سے پہلے تم نے نافرمانی کی اور تم فساد کرنے والوں میں سے تھے (اب تیری توبہ قابل قبول نہیں ہے)۔'' (یونس:۹۱)

بعض گزشتہ اقوام کے بارے میں قرآن شریف میں ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾

''اب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کا انکار کرتے ہیں۔'' (مومن:۸۴)

قرآن شریف ان کے جواب میں کہہ رہا ہے:

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ (مومن:۸۵)

''جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں

دیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی ہے، یہی وہ موقع تھا جہاں کافروں نے خسارہ اٹھایا۔‘‘

اسی اصول کی بنیاد پر اسلام کے عدالتی نظام میں یہ ایک قانون ہے کہ اگر کوئی مجرم گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے جو انسان کے اندر کوئی مثبت تبدیلی نہیں لاتی۔

بنابرایں صرف ایک صورت میں توبہ قابل قبول نہیں ہوتی، وہ حالت جس میں انسان کے پاس کوئی اختیار باقی نہ رہے اور وہ توبہ کرنے پر مجبور ہو۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ تین اور حالات میں بھی توبہ قبول نہیں ہے:

پہلی صورت شرک اور بت پرستی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

’’اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرے گا، اس کے نچلے درجہ کے گناہوں کو، جس کیلئے چاہے معاف کردے گا۔‘‘ (نساء:۴۸)

لیکن یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں توبہ کی نہیں بلکہ توبہ کے بغیر بخشش کی نفی ہو رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صدرِ اسلام میں جن مشرکین نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی توبہ قبول ہوئی تھی، اسی طرح اگر آج سارے مشرک توبہ کرلیں اور مسلمان ہو جائیں تو تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے گی لیکن اگر مشرک توبہ نہ کرے اور حالت شرک میں مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال نہ ہوگی۔ لیکن اگر ایمان لے آئے اور پھر اس دنیا سے چلا جائے اور اس نے کچھ گناہ بھی کئے ہوں تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے۔

یہی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ کی مغفرت اور بخشش مشرکوں کو نصیب نہیں ہوگی لیکن اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے۔ لیکن توبہ تمام گناہوں حتیٰ کہ شرک کی بھی بخشش کا سبب ہو جاتی ہے۔

دوسری اور تیسری صورت یہ ہے کہ توبہ گناہ کے تھوڑے عرصہ بعد کرلی جائے اور توبہ ان گناہوں سے ہو جو ازروئے جہالت کئے گئے ہوں، نہ کہ سرکشی و بغاوت کی وجہ سے، اس لئے کہ سورۂ نساء، آیت ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷﴾

’’توبہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو ازروئے نادانی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔‘‘

لیکن یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں توبہ سے مراد کامل توبہ ہے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص سرکشی وعناد کی وجہ سے گناہ کرے اور پھر سرکشی وعناد سے باز آ جائے اور توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے افراد کا تذکرہ ملتا ہے جو ابتداء میں اسلام کے سخت دشمن تھے مگر بعد میں توبہ کر کے مخلص مسلمان بن گئے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سالہا سال تک گناہ کرتا رہے اور بعد میں پشیمان ہو جائے اور حقیقی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی موت سے ایک سال قبل توبہ کرلے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک سال زیادہ ہے، اگر موت سے ایک ماہ قبل بھی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ماہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک جمعہ (یعنی ایک ہفتہ قبل) توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک جمعہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک روز قبل توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک دن بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک ساعت قبل توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ساعت بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص اس وقت توبہ کرلے جب اس کی جان اس کے گلے تک پہنچ جائے (یعنی حیات واختیار کے آخری لمحوں میں) تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

البتہ اس کے معنی یہ ہیں کہ توبہ انہی تمام شرائط کے ساتھ انجام پائے، مثلاً اگر اس نے کسی کا حق ضائع کیا ہو تو وہ مرنے سے قبل اس کے حق کی ادائیگی کی وصیت کر کے توبہ کرے۔

قرآن شریف میں بہت سی آیات ہیں جو توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہیں جس کے معنی ہیں کہ تمام گناہوں میں توبہ کی گنجائش ہے:

۱۔ قُلۡ يٰعِبَادِيَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۳﴾

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (زمر: ۵۳)

۲۔ فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۹﴾

''جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کرلے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۹)

۳۔ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ

رَّحِيۡمٌ﴿۵۴﴾

''تم میں سے جو کوئی از روئے نادانی گناہ کا مرتکب ہو، پھر توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (انعام: ۵۴)

اس آیت کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ سارے گناہ اس کے اندر آ جاتے ہیں اور آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تمام گناہ قابل عفو ہیں۔

۴۔ وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۖ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۖ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴿۱۳۵﴾

''اور جب وہ گناہ کرتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرتا ہے اور پھر وہ دانستہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔'' (آل عمران: ۱۳۵)

اس آیت میں بھی گناہ اور ظلم سے مراد تمام گناہ ہیں، اس لئے کہ بعض گناہ دوسروں پر ظلم کے زمرے میں آتے ہیں اور بعض گناہ اپنے اوپر ظلم محسوب ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان دونوں قسم کے گناہوں کی مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت بھی توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہے۔

۵۔ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴿۳۱﴾

''اے اہل ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔'' (نور: ۳۱)

اس آیت میں ''جَمِيۡعًا'' کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیت میں ہر گناہ گار مسلمان کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر توبہ میں عمومیت نہ پائی جاتی تو اس طرح ہر گنہگار مسلمان کو توبہ کا حکم دینا صحیح نہ ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے بعض میں اسراف، بعض میں ظلم اور بعض میں سوء کے الفاظ استعمال ہوئے اور توبہ کی صورت میں ان سب کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ و سنی کی کتب حدیث میں بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کا دروازہ زندگی کے آخری لمحات کھلا رہتا ہے۔ ان احادیث کے مطالعہ کیلئے بحارالانوار، اصول کافی، درالمنثور، کنزالعمال، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی اور دیگر کتب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے اس حدیث کے متواتر ہونے کا دعویٰ بے جا نہ ہو۔

۴۔ ارکانِ توبہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ توبہ درحقیقت پشیمانی اور ندامت کی وجہ سے، اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی اطاعت کی طرف واپس پلٹنے کا نام ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اس پشیمانی کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم حاصل ہو جائے کہ گناہ کی وجہ سے وہ اپنے محبوب حقیقی سے دور ہو گیا ہے، لہٰذا وہ اپنے گزشتہ برے عمل کو ترک کرنے کا پختہ عزم کرلے اور گناہوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اسی لئے قرآن مجید میں توبہ کے ساتھ اصلاح کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس حقیقت کی بہترین دلیل ہیں:

۱۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کرنے اور سخت سزا کی وعید سنانے کے بعد جو آیات الٰہی کو چھپانے کے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے، کہا جاتا ہے کہ:

”مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں اور جو کچھ انہوں نے چھپایا تھا، اسے بیان کریں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہوجاتا ہوں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“ (بقرہ:۱۶۰)

۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۸۹ میں مرتد ہوجانے والوں اور ان کی سخت سزا کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۪ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

”مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ کرلیں، اصلاح کریں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

۳۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۴۶ میں منافقوں اور ان کے برے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ

”سوائے ان لوگوں کے جو توبہ اور اصلاح کرلیں اور اللہ سے مضبوط تعلق قائم کریں اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کریں۔“

اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵ میں پاکدامن عورتوں پر بدچلنی کا الزام لگانے والوں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

”سوائے ان کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

۵۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں اللہ تعالیٰ ایک عمومی قانون کی حیثیت سے فرماتا ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے بخشنے والا رحم کرنے والا ہے جو از روئے جہالت گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد توبہ و اصلاح کرتے ہیں۔''

۶۔ یہی بات سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۵ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

''بے شک میں ان لوگوں کے لیے بہت بخشنے والا ہوں جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، پھر ہدایت پا گئے۔''

اس آیت میں توبہ اور عمل صالح (یعنی ماضی کی خرابیوں کی اصلاح) کے علاوہ، جو کہ توبہ کے دو اساسی رکن ہیں، ایمان اور ہدایت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

درحقیقت گناہ ایمان کے نور کو کم کر دیتا ہے اور انسان کو ہدایت کی راہ سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے بعد گناہگار کو چاہیے کہ تجدید ایمان کرے اور راہِ ہدایت کی طرف واپس آ جائے۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں توبہ کے بارے میں قرآن مجید کی منطق مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے حقیقی توبہ کے لیے صرف استغفراللہ کہنا، حتیٰ کہ ندامت اور گناہ کو مکمل طور پر ترک کر دینے کا عزم مصمم بھی کافی نہیں ہے بلکہ گناہ کی وجہ سے انسان کے اپنے قلب و جان اور معاشرے پر جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں اصلاح کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور ہر قسم کی خرابی اور فساد کی اصلاح پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی رو سے:

۱۔ توبہ کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ اس نے جس جس کا حق پامال یا ضائع کیا ہے، وہ انہیں واپس کرے۔ اگر صاحب حق فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارث کو ادا کرے۔

۲۔ اگر اس نے غیبت یا کسی اور طریقہ سے کسی کی عزت کو داغدار کیا ہو تو اس سے معافی مانگے اور اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو اس کے لیے کارِ خیر انجام دے تاکہ اس کی روح اس سے راضی ہو جائے۔

۳۔ اگر اس کی عبادات فوت ہو گئی ہوں تو ان کی قضا انجام دے۔ اگر کسی عبادت کے ترک کرنے کا شریعت نے کوئی کفارہ مقرر کیا ہے تو وہ کفارہ بھی ادا کرے۔

۴۔ چونکہ گناہ دل کو تاریک کر دیتا ہے، لہٰذا اس خرابی کی اصلاح کے لیے اس قدر عبادت کرے کہ نورانیت تاریکی پر غالب آ جائے۔

اصلاح کے بارے میں جامع ترین تعبیر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد میں نظر آتی ہے جو نہج البلاغہ میں کلمات قصار میں ہے۔ کسی شخص نے امیر المومنین علیہ السلام کی موجودگی میں کہا: "استغفر اللہ"۔ گویا امام علیہ السلام اس کے گزشتہ کردار واعمال سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کی توبہ صرف لفظی توبہ ہے، نہ کہ حقیقی، لہٰذا آپؑ اس کی اس استغفار پر برہم ہوئے اور فرمایا:

"تیری ماں تجھے روئے! تجھے معلوم ہے استغفار کیا ہے؟ استغفار بلند مرتبہ لوگوں کا مقام ہے۔"

پھر آپؑ نے فرمایا:

"یہ ایک ایسا اسم ہے جو چھ معانی پر صادق آتا ہے:

اولها الندم على مامضى

"اول یہ کہ گزرے ہوئے برے اعمال پر انسان نادم اور پشیمان ہو۔"

والثانى العزم على ترك العود اليه ابدا

"دوم یہ کہ اس کام کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینے کا عزم کرے۔"

والثالث ان توء دى الى المخلوقين حقوقهم حتى تلقى الله املس ليس عليك تبعة

"سوم یہ کہ لوگوں کے ضائع شدہ حقوق ان کو ادا کرے تاکہ قیامت کے دن کسی کا حق تمہارے ذمہ نہ ہو۔"

و الرابع ان يعمد الى كل فريضة عليك ضيعتها فتودى حقها

"چہارم یہ کہ جن فرائض کو تو نے ترک کیا ہے، انہیں انجام دے (ان کی قضا یا کفارہ انجام دے)۔"

والخامس ان يعمد الى اللحم الذى نبت على السحت فتذيبه با الاحزان حتى تلصق الجلد بالعظم وينشا بينهما لحم جديد

"پنجم یہ کہ حرام خواری کے نتیجہ میں جو گوشت تمہارے بدن پر بنا ہے، گناہ پر پشیمانی اور غم کے ذریعے اسے پگھلا دو، یہاں تک کہ تمہاری کھال ہڈیوں سے چپک جائے، پھر اس پر نیا گوشت پیدا ہو۔"

والسادس ان تذيق الجسم الم الطاعة كما ازقته حلاوة المعصية فعند ذلك

تقول استغفر الله

''ششم یہ کہ جس قدر تم نے گناہ کی لذت اور شیرینی کا لطف اٹھایا ہے، اب اسی قدر عبادت کی سختی کی تلخی کو برداشت کرو۔ جب یہ سب کچھ کرلو تو پھر کہو ''استغفر اللہ''۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۴۱۷)

یہی بات ایک اور روایت میں کمیل بن زیاد نے امیر المومنین علیہ السلام سے اس طرح نقل کی ہے کہ میں نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا:

یا امیر المومنین العبد یصیب الذنب فیستغفر الله منه فما حد الاستغفار؟

''یا امیر المومنینؑ! انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، پھر استغفار کرتا ہے، استغفار کی حد کیا ہے؟''

امامؑ: ''التوبہ'' یعنی استغفار کی حد توبہ ہے۔

کمیل: ''کیا اتنا ہی کافی ہے؟''

امامؑ: ''نہیں۔''

کمیل: قلت فکیف؟ ''میں نے کہا، کیسے؟''

قال ان العبد اذا اصاب ذنبا یقول استغفر الله بالتحریك

''آپؑ نے فرمایا جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو زبان کی حرکت سے استغفار کرتا ہے۔''

قلت و ما لتحریك

''میں نے کہا تحریک سے کیا مراد ہے؟''

قال: الشفتان و اللسان یرید ان یتبع ذلك بالحقیقة

''آپؑ نے فرمایا: زبان اور لب گردش میں آتے ہیں اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ سکے۔''

قلت وما الحقیقة؟

''میں نے عرض کیا: حقیقت کیا ہے؟''

قال تصدیق فی القلب و اضمار ان لا یعود الی لذنب الذی استغفر منه

''آپ نے فرمایا: اس سے مراد سچائی کا وہ ادراک ہے جو گناہ کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ عزم کر لیتا ہے کہ جس گناہ سے اس نے استغفار کر لی ہے، اسے پھر کبھی انجام نہ دے گا۔''

فاذا فعل ذلك فانه من المستغفرين

''کیا جب وہ ایسا کرلے تو وہ مستغفرین میں شامل ہو جاتا ہے؟''

قال لا

''آپؑ نے فرمایا: نہیں!''

فکیف ذاك؟

''پس توبہ کی حقیقت کیا ہے؟''

لانك لم يبلغ الى الاصل بعده

''اس لیے کہ ابھی تک تم توبہ کی اساس تک نہیں پہنچ پائے ہو۔''

فاصل الاستغفار ماهو؟

''پھر استغفار کی اصل اور اساس کیا ہے؟''

الرجوع الى التوبة من الذنب الذى استغفرت منه وهى اول درجة العابدين

''جس گناہ سے استغفار کی ہے، اس سے توبہ کی طرف واپس آنا، یہ عابدین کا پہلا درجہ ہے۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

وترك الذنب والاستغفار اسم واقع لمعان ست

''ترک گناہ اور استغفار ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے چھ معنی و مراحل ہیں۔''

پھر آپؑ نے مختصر فرق کے ساتھ انہی چھ مراحل کا ذکر فرمایا جو نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

(بحارالانوار، ٦:٢٧)

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ اگر یہی توبہ ہے تو پھر شاید ہی کوئی شخص توبہ کر سکتا ہو!

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا چھ مراحل توبۂ کامل کی شرائط ہیں، جیسا کہ پانچویں اور چھٹی شرط۔ جبکہ دیگر چار شرائط واجب اور لازم ہیں۔ بعض محققین نے ان مراحل کے بارے میں کہا ہے کہ پہلے دو مراحل توبہ کے ارکان ہیں، تیسرا اور چوتھا مرحلہ توبہ کی شرائط لازم ہیں جبکہ پانچواں اور چھٹا مرحلہ شرائط کمالِ توبہ ہیں۔ (گفتارِ معنوی، تالیف: شہید آیت اللہ مطہری: ١٩٣)

ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اما علامة التائب فاربعة: النصيحة لله فى عمله، و ترك الباطل، ولزوم الحق، و

الحرص علی الخیر

''توبہ کرنے والے کی چار علامات ہیں:

۱۔اللہ کے بندوں کی خیرخواہی

۲۔ترک باطل

۳۔حق پر سختی سے کاربند رہنا

۴۔کارہائے خیر کو انجام دینے کی شدید خواہش (تحف العقول: ۳۲)

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر انسان کا گناہ ایسا ہو جس کی وجہ سے اس نے کسی کو گمراہ کیا ہو، جیسے باطل کے حق میں تبلیغی مہم اور بدعت گزاری وغیرہ، تو اس کی اصلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جن افراد کو اس نے گمراہ کیا ہے، حتی الامکان انہیں راہِ راست پر لے کر آئے، ورنہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

یہاں سے یہ بات واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ جو لوگ آیات الٰہی میں تحریف یا بدعت گزاری کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا راستہ ہموار کرتے ہیں، ان کی توبہ کتنی سخت اور دشوار ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص بھرے مجمع میں ایسی تقریر کرے جس سے لوگ گمراہ ہو جائیں یا کتب و رسائل کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کردے اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر توبہ کرے تو ایسی توبہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص سرعام کسی کی غیبت کرکے، اس پر تہمت لگا کر اس کی آبرو کو داغدار کردے اور پھر اپنے گھر میں خلوت میں بیٹھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی۔ ہاں! اگر وہ شخص، جس کی آبرو کو اس نے داغدار کیا ہے، اسے معاف کردے تو پھر اور بات ہے یا پھر اسی طرح مجمع عام میں اپنی بات کو جھٹلائے، جس طرح اس نے مجمع عام میں غیبت کی تھی یا تہمت لگائی تھی۔

ایک معتبر حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر کسی شخص پر حد جاری کی جائے، پھر وہ توبہ کرلے تو کیا اس کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

اذا تاب وتوبته ان یرجع مما قال ویکذب نفسه عند الامام وعند المسلمین،
فاذا فعل فان علی الامام ان یقبل شهادته بعد ذلك

''ہاں! اگر وہ توبہ کرلے اور اس کی توبہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا، اسے واپس لے اور حاکم اور مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلائے تو پھر حاکم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کی گواہی کو قبول کرے۔'' (وسائل الشیعہ ۱۸: ۲۸۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

اوحی اللہ عزوجل الی نبی من الانبیاء قل لفلان وعزتی لودعوتنی حتی تنقطع اوصالك، ما استجیب لك، حتی تردمن مات الی مادعوته الیه فیرجع عنه

''اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ فلاں شخص سے کہو کہ اگر تو مجھے اس قدر پکارے کہ تیرے جوڑ الگ الگ ہو جائیں تو میری عزت کی قسم! میں تیری دعا پھر بھی قبول نہیں کروں گا جب تک کہ تو ان لوگوں کو زندہ کر کے اس گمراہی سے واپس نہ لے آئے جس پر تو نے انہیں ڈالا تھا۔''

(بحارالانوار ۶۹: ۲۱۹)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اصلاح کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور اس کے بغیر توبہ صرف ظاہری توبہ ہوگی۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جو لوگ گناہوں کی کثرت کے باوجود زبانی استغفار پر قناعت کر لیتے ہیں اور اس کے ارکان و شرائط کو پورا نہیں کرتے، وہ اپنے آپ سے بھی اور توبہ و استغفار سے بھی مذاق کر رہے ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

التائب من الذنب کمن لاذنب له، و المقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء

''جو شخص گناہ سے (کامل اور جامع الشرائط) توبہ کر لے، وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا اور جو شخص گناہ پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرتا ہے کہ گویا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔''

(اصولِ کافی، ۲: ۴۳۵)

۵۔ قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی

تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر توبہ جامع الشرائط ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور قبول ہوتی ہے۔ آیات و روایات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی؟

بعض علماء کا نظریہ ہے کہ توبہ کے بعد عذاب و سزا کا ٹل جانا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو توبہ کے باوجود بندے کو معاف نہ کرے۔

اس کے برعکس بعض علماء قائل ہیں کہ توبہ کے بعد عذاب اور سزا کا ٹل جانا واجب ہے اور توبہ کے باوجود مجرم کو معاف نہ کرنا

ایک ایسا ناپسندیدہ عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے اس مقام پر ایک اور نظریئے کو قبول کر لیا جائے۔ وہ یہ کہ توبہ کی قبولیت ایک عقلی مسئلہ ہے۔ اگرچہ عقل، توبہ اور عذر خواہی کے قبول کرنے کو ضروری اور لازمی قرار نہیں دیتی مگر دنیا بھر کے عقلاء میں یہ طریقہ رائج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی برے کام کا مرتکب ہونے کے بعد معافی مانگے اور اپنے برے کام کے تمام اثرات کو بھی مٹا دے اور ایسی حالت پیدا کر دے کہ گویا اس نے کوئی برا کام یا نقصان کیا ہی نہیں ہے، تو دنیا بھر کے عقلاء کی روش یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں معاف کرنے پر تیار نہ ہو تو اسے کینہ پرور اور انسانی حقوق سے عاری سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ، جو کہ ہر کسی اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ توبہ کرنے والے اور معافی مانگنے والے بندوں کی توبہ قبول کرے اور انہیں معاف فرمائے بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہا جائے کہ قبولیت توبہ عقلی ہے اور اس سلسلہ میں "قائدہ قبیح نقض غرض" (یعنی مقصد شکنی فعل قبیح ہے) کو بنیاد بنایا جائے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادات اور اطاعات سے بے نیاز ہے۔ جتنی عبادات بھی اس نے بندوں پر فرض کی ہیں، ان کا مقصد بندوں کی بہتری اور انہیں درجۂ کمال تک پہنچانا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر تمام واجبات کا مقصد ہمارا روحانی ارتقاء اور ہمیں اللہ کے قریب کرنا ہے۔

قرآن مجید میں نماز کو برائی اور بدکاری سے روکنے کا ذریعہ (عنکبوت: ۴۵)، روزہ کو تقویٰ کا سبب (بقرہ: ۱۸۳) اور زکوٰۃ کو فرد اور معاشرے کی پاکیزگی اور برتری کا وسیلہ (توبہ: ۱۰۳) کہا گیا ہے۔

احادیث میں بھی ایمان کو شرک سے پاکیزگی، نماز کو تکبر سے پاکیزگی، حج کو مسلمانوں کی وحدت اور جہاد کو مسلمانوں کی عزت وشوکت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۲۵۲)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تمام فرائض انسان کی سعادت اور ارتقاء کے لیے مقرر کیے گئے ہیں تاکہ انسان ان کے ذریعے مقام عبودیت تک رسائی حاصل کر سکے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ (ذاریات: ۵۶)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ توبہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کمال اور ارتقاء کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔ چونکہ انسان معصوم نہیں ہے، اس سے گناہ اور خطا کا سرزد ہونا انہونی بات نہیں ہے، لہٰذا اگر واپسی کا کوئی راستہ اس کے لیے کھلا نہ ہو تو وہ کمال اور ارتقاء سے محروم رہ جائے گا۔ لیکن اگر اسے بتا دیا جائے کہ گناہ اور خطا کی صورت میں توبہ کرو اور گناہ کے ذریعے جو خرابی تم نے پیدا کی ہے، اس کی تلافی کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ ایسی صورت میں انسان سعادت کے قریب تر اور انحراف وخطا سے دور ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ توبہ کو قبول نہ کرنا حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ اور سبب نقض غرض ہوگا۔ اس لیے کہ تمام فرائض کا مقصد انسان کی

سعادت ہے اور توبہ کی عدم قبولیت اس مقصد کے حصول کو ناممکن بنادے گی۔ مختصر یہ کہ توبہ کا ایک فلسفہ ہے جو انسان کے کمال اور ارتقاء کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اگر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے تو کمال و ارتقاء کا جذبہ مرجاتا ہے بلکہ انسان پستی کی طرف جا گرتا ہے، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب جبکہ اس کے پاس نجات کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے تو پھر وہ گناہوں سے کیوں اجتناب کرے۔ اسی لیے تمام انسانی مربی، خواہ کسی آسمانی دین پر ایمان رکھتے ہوں یا نہیں، اپنے زیر تربیت افراد پر واپسی اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں تا کہ ان کے اندر کمال و ارتقاء کا جذبہ سرد نہ ہو۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط پائی جاتی ہوں تو نہ صرف از روئے قرآن واحادیث بلکہ از روئے عقل بھی اس کی قبولیت ضروری اور نا قابل انکار ہے۔

۶۔ جزئی توبہ

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بعض گناہوں سے توبہ کرلے اور بعض گناہوں کو انجام دیتا رہے؟ مثلاً ایک شخص جو شراب خواری بھی کرتا ہو اور غیبت بھی، یہ فیصلہ کرے کہ شراب خواری کو ہمیشہ کے لیے ترک کردے مگر غیبت کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ نہ کرے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ سارے گناہوں سے ہونی چاہیے، اس لیے کہ گناہ کوئی بھی ہو، اس کے معنی اللہ کے حکم کی نافرمانی اور اس کی بارگاہ کی بے حرمتی ہے۔ اگر کوئی شخص گناہ کے اس نتیجہ سے پشیمان ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہر گناہ کو ترک کردے، نہ یہ کہ بعض گناہوں کو ترک کردے اور بعض کو انجام دیتا رہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جزئی توبہ بھی ممکن ہے۔ علم اخلاق کے بعض بزرگ علماء جیسے مرحوم نراقی نے ''معراج السعادۃ'' میں اپنے والد بزرگوار سے اس نظریئے کو نقل کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے انسان بعض گناہوں کے نتیجہ اور برے اثرات کے بارے میں زیادہ علم و آگہی حاصل کرلے اور ان سے توبہ کرلے مگر جن گناہوں کے بارے میں ایسی آگہی نہ رکھتا ہو، ان کو انجام دیتا رہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثر توبہ کرنے والوں کی توبہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ اکثر لوگ کسی خاص گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی اور گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں۔ ہمیں کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ رسول اللہ، آئمہ معصومینؑ یا بزرگانِ دین میں سے کسی نے ایسی توبہ کو غیر معتبر قرار دیا ہو اور اس بات پر زور دیا ہو کہ توبہ اسی صورت میں توبہ ہوگی جب تمام گناہوں سے توبہ کی جائے۔

قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی جزئی توبہ کے صحیح ہونے کی تائید ہوتی ہے، مثلاً ربا خواروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

''اگر تم توبہ کرلو (تو تمہاری توبہ قبول ہوگی) اور تمہارا سرمایہ تمہارا۔'' (بقرہ: ۲۷۹)

مرتد ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۸۹﴾

''ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (آل عمران: ۸۷ تا ۸۹)

اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والوں اور معاشرے میں فساد برپا کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۳۴﴾

''اگر اس سے پہلے تم ان پر قابو پالو، وہ توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۴)

بدکاری کے مرتکب افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴿۱۶﴾

''مگر جو لوگ توبہ کرلیں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔'' (نساء: ۱۶)

اگرچہ ان میں سے بعض آیات دنیوی سزا کے بارے میں ہیں اور ان سے معافی بھی توبہ کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق موجود نہیں ہے کہ اگر دنیوی سزا میں توبہ قبول ہو جائے تو یقیناً اخروی سزا کے بارے میں بھی قبول ہو جائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ گناہوں کے بارے میں آگہی اور ان کے محرکات کے مختلف ہونے کی وجہ سے جزئی توبہ کے قابل قبول ہونے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مکمل توبہ وہی ہوتی ہے جو تمام گناہوں سے کی جائے، نہ کہ جزئی توبہ۔

۷۔ توبہ کی پائیداری

توبہ کو ہمیشہ پائیدار ہونا چاہیے۔ جب بھی انسان نفس امارہ کے وسوسوں کے زیر اثر کسی خطا کا مرتکب ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً توبہ کرے اور ''نفس لوامہ'' کے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔ اسے اس سلسلہ میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے، یہاں تک کہ وہ ''نفس مطمئنہ''

کے مقام پر فائز ہوجائے اور وسوسہ کی جڑیں کٹ جائیں۔

دوسری طرف انسان پر یہ بھی لازم ہے کہ جب وہ کسی گناہ سے توبہ کرے تو خوب احتیاط کرے کہ اپنی توبہ پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے ترکِ گناہ کے عہد پر ثابت قدم اور پائیدار رہے۔ لہٰذا اگر توبہ کے بعد اس گناہ کا رجحان اس کے اندر باقی رہ جائے تو اسے چاہیے کہ اس کے خلاف جہاد میں مشغول ہوجائے۔ یہی وہ جہاد ہے جسے جہاد بالنفس یا جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں وہ تائبین کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی صف میں بھی شامل ہوجائے گا۔

اس مقام پر بعض علمائے اخلاق نے یہ بے نتیجہ یا کم نتیجہ بحث بھی کی ہے کہ آیا وہ توبہ کرنے والا افضل ہے جو توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ گناہ کی خواہش کے خلاف جہاد بھی کرتا ہے یا وہ توبہ کرنے والا جس نے توبہ کے ساتھ گناہ کی خواہش کو ختم کر ڈالا ہو۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ان دو قسم کی توبہ کاروں میں سے کون افضل ہے! اہم بات یہ ہے کہ توبہ کرنے والا کیا طریقہ کار اپناتا ہے کہ وہ گناہ کی طرف واپس نہ جائے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ گناہ کے ماحول اور گناہ کی محافل سے دور رہنا، اس لیے کہ آغاز میں توبہ کمزور ہوتی ہے اور تائب کی حالت اس بیمار جیسی ہوتی ہے جو حال ہی میں کسی بیماری سے صحت یاب ہوا ہو اور اگر وہ دوبارہ ایسے ماحول میں جائے جہاں بیماری کے جراثیم پائے جاتے ہوں تو اس کے دوبارہ بیمار ہوجانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ تائب پر لازم ہے کہ اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کے معاملہ میں نظرثانی کرے۔ جو لوگ ماضی میں فعل گناہ پر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان سے دوری اختیار کرے۔

۳۔ جب کبھی گناہ کا وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہو، فوراً اللہ کے ذکر میں مشغول ہوجائے کیونکہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾

''اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۴۔ جن گناہوں کو اس نے ترک کیا ہے، ہر وقت ان کے خطرناک اثرات و نتائج کے بارے میں غور و فکر کرتا رہے اور ان آثار کو ہمیشہ مدنظر رکھے تاکہ ان سے غفلت کے نتیجہ میں دوبارہ گناہ کی خواہش اس کے اندر پیدا نہ ہوجائے اور اس کا دل وسوسوں کے حملے کا شکار نہ ہوجائے۔

۵۔ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو ہمیشہ یاد رکھے جو گناہوں کی وجہ سے دردناک انجام سے دوچار ہوئے، حتیٰ کہ معصوم انبیاء کے حالات کا بھی مطالعہ کرے جو ترک اولیٰ کے مرتکب ہوئے۔ مثلاً انسان کو ہمیشہ چاہیے کہ وہ اس بارے میں غور و فکر کرے کہ کس طرح حضرت آدم علیہ السلام اس عظیم مقام پر ہوتے ہوئے جنت سے نکال دیئے گئے، یا حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے شکم ماہی میں قید کر دیئے گئے، یا وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام سالہا سال تک اپنے بیٹوں کی جدائی کا عذاب برداشت کرتے رہے۔

ان چیزوں کے مطالعہ سے یقیناً وسوسے کمزور ہوجاتے ہیں اور توبہ پائیدار ہوجاتی ہے۔

۶۔ تائب پر لازم ہے کہ گناہوں کی ان سزاؤں کے بارے میں سوچا کرے جن کی خبر دی گئی اور اس بات کو ہرگز فراموش نہ کرے کہ ہوسکتا ہے کہ توبہ کے بعد گناہ کی صورت میں اس کی سزا اور بھی سخت ہو۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں اور عنایات پر بھی توجہ رکھے جو توبہ کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہیں اور جن میں وہ خود بھی شامل ہو چکا ہے اور اپنے آپ کو یہ تلقین کرتا رہے کہ اس نے ان رحمتوں اور عنایات کی حفاظت کرنی ہے اور جو مقام اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے، اسے کھونا نہیں ہے۔

۷۔ اپنے تمام اوقات کے لیے صحیح اور مثبت کاموں کا ایک نظام الاوقات (Time Table) بنائے اور اس کے مطابق ایک آبرومندانہ زندگی کے لیے ضروری کام، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور صحت مند تفریحی کاموں میں مشغول رہے، اس لیے کہ بیکاری ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو گناہ کی طرف واپس لے جانے والے وسوسوں کے لیے سازگار حالات پیدا کردیتی ہے۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں کہ "التائب حبیب اللہ" یعنی "تائب اللہ کا محبوب ہوتا۔" انہوں نے جواب دیا کہ تائب سے مراد وہ شخص ہے جو اس آیت کا مصداق ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، اللہ کی عبادت کے لیے سرگرم عمل رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، امر المعروف اور نہی از منکر کرنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، ایسے مومنین کو بشارت دے دو۔" (توبہ: ۱۱۲)

۸۔ توبہ کے درجات

علمائے اخلاق نے توبہ اور تائبین کے مختلف مراتب ومدارج بیان کیے ہیں۔

ایک لحاظ سے تائبین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا گروہ ان تائبین کا ہے جو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد اپنی توبہ توڑ کر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی افسوس بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نفس امارہ کے درجہ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان کا انجام مبہم اور خطرناک ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ توبہ پر ہو اور ان کی عاقبت اچھی ہوجائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی عمر کا خاتمہ توبہ شکنی پر ہو اور اس طرح ان کی عاقبت بہت بری اور دردناک ہو۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتے ہیں لیکن کبھی کبھار شہوات کے غلبہ کی وجہ سے توبہ شکنی کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن توبہ شکنی پر نادم اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی پہلے گروہ کی طرح نفس امارہ کے درجہ پر ہوتے ہیں لیکن ان کی نجات کی امید ان کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کرنے کے بعد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اور فرائض و واجبات کو پابندی سے ادا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار غیر ارادی طور پر، توبہ شکنی کے مقصد کے بغیر، کسی گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن فوراً نادم اور پشیمان ہو جاتے ہیں اور اپنے نفس کو سرزنش کرنے لگتے ہیں اور ایک بار پھر پختہ عزم کے ساتھ توبہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ گناہ کے محرکات و عوامل سے دور رہیں۔

یہ گروہ نفس لوامہ کے درجہ پر ہوتا ہے جو نفس امارہ کی نسبت بلند تر درجہ ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کے قریب ہوتے ہیں اور ان کی نجات کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کے بعد فولادی عزم کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور بندگی کی راہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ چونکہ یہ معصوم نہیں ہوتے، لہٰذا ممکن ہے کبھی گناہ کا رجحان ان کے اندر پیدا ہو جائے۔ لیکن عملی طور پر یہ اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایمان اور عقل کی طاقت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

یہ لوگ صاحبِ نفس مطمئنہ ہوتے ہیں۔ سورۃ والفجر کی آیات ۲۷ اور ۳۰ میں انہی لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝۲۹ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝۳۰

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

اس کے علاوہ توبہ کے مراحل و مراتب کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

مرحلہ اول: کفر سے ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ دوم: تقلیدی ایمان سے تحقیقی ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ سوم: خطرناک اور بڑے گناہوں سے توبہ۔

مرحلہ چہارم: گناہانِ صغیرہ سے توبہ۔

مرحلہ پنجم: گناہ کی خواہش سے توبہ۔ اگرچہ عملی طور پر گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔

اللہ کے بندوں میں سے ہر گروہ کی مخصوص توبہ ہوتی ہے۔ انبیاء کی توبہ اندرونی اضطرابات سے ہوتی ہے یعنی ان لحظات

سے ہوتی ہے جن میں ان کا باطن اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی توبہ ان سانسوں سے ہوتی ہے جن میں وہ ذکر خدا کی حالت میں نہیں ہوتے۔

اولیاء کی توبہ ان نامناسب امور سے ہوتی ہے جو ان کی سوچ پر طاری ہوتے ہیں۔

خواص کی توبہ غیر اللہ کی طرف متوجہ اور مشغول ہونے سے ہوتی ہے۔

عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک آغازِ توبہ میں ایک مخصوص درجہ کی معرفت اور آگاہی رکھتا ہے۔

(بحارالانوار،٦:٣١)

۹۔ توبہ کے اثرات وبرکات

حقیقی اور دل کی گہرائی سے اٹھنے والی جامع الشرائط توبہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے اور اس کے اثرات و برکات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ان اثرات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ توبہ کرنے والا مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے کہ دورانِ گناہ میں اس نے جو خرابیاں کی ہیں، حتی الامکان ان کی اصلاح کرے اور وہ اپنے کیئے پر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے۔

۲۔ حقیقی تائب اپنے آپ کو گناہ کی محافل سے دور رکھتے ہیں اور ان عوامل سے بھی دور رہتے ہیں جو ان کے اندر گناہ کی رغبت پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۔ تائب اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

ان علامات کے ذریعے ہم حقیقی توبہ کرنے والوں کو زبانی توبہ کرنے والوں سے پہچان سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔'' (تحریم:۸)

کہا ہے کہ ''نصوح'' سے مراد وہ توبہ ہے جس میں لوگوں کیلئے نصیحت پائی جاتی ہو، یعنی جسے دیکھ کر دوسرے گناہگاروں کو بھی توبہ کی ترغیب ملے، اس لئے کہ اس توبہ کے آثار تائب کے اندر ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنے عمل سے دوسروں کو یہ درس دے رہا ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے دل سے گناہوں کی جڑیں نکال پھینکیں اور کبھی گناہ کی طرف واپس نہ جائیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد خالص توبہ ہے، جبکہ بعض نے کہا ہے کہ نصوح ''نصاحت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی سلائی کرنے کے ہیں، اس لئے کہ گناہ ایمان کے لباس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور خالص اور سچی توبہ اس پارہ پارہ لباس کو سینے کا کام کرتی

ہے، یا یہ کہ گناہ انسان اور اللہ کے تعلق کو منقطع کر دیتا ہے اور توبہ اس تعلق کو پھر جوڑ دیتی ہے۔(بحار الانوار ۶:۱۷)

توبہ کے فوائد اور برکات بہت زیادہ ہیں جن کی طرف قرآن وسنت میں تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ان فوائد اور برکات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔امید ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔''(تحریم۔۸)

۲۔ توبہ کرنے والوں پر زمین وآسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں۔سورۂ نوح آیات ۱۰ تا ۱۲ میں ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲

''میں نے (اپنی قوم سے کہا): تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں برسائے گا۔تمہارے اموال واولاد میں اضافہ کرے گا، تمہیں سرسبز باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔''

۳۔ توبہ صرف گناہ کو مٹاتی ہی نہیں بلکہ اسے نیکی میں تبدیل کر دیتی ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں، تو اللہ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔''(فرقان:۷۰)

۴۔ اگر توبہ سچی اور خالص ہو تو اللہ تعالیٰ گناہ کے اثرات کو اس طرح مٹا دیتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا تاب العبد توبة نصوحا احبه الله و ستر عليه فی الدنيا و الآخرة فقلت و كيف يستر عليه؟ قال ينسى ملكيه ما كتبا عليه من الذنوب ويوحى الى جوارحه اكتمى عليه ذنوبه، ويوحى الى بقاع الارض اكتمى ماكان يعمل عليك من الذنوب فيلقى الله حين يلقاه و ليس شیء يشهد عليه بشيئ من الذنوب

(اصول کافی ۲: ۴۳۰)

''جب بندہ خالص اور سچی توبہ کرتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور دنیا میں اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔''

راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: کس طرح پردہ ڈال دیتا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: جو فرشتے گناہ لکھتے ہیں، انہیں اس کا گناہ بھلا دیتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہ کو چھپا دیں۔ زمین کے جس حصے پر اس نے گناہ کیا ہوتا ہے، اسے حکم دیتا ہے کہ اس کا گناہ چھپا دے۔ پھر جب وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کے خلاف گواہی دے۔''

۵۔ حقیقی تائب اس طرح اللہ کی محبت اور عنایت کا مستحق قرار پاتا ہے کہ حاملانِ عرش الٰہی اس کیلئے استغفار کرتے ہیں اور اس کے اور اس کے خاندان کیلئے جنت میں داخلے کی دعا کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

ان الله عزوجل اعطى التائبين ثلاث خصال، لو اعطى خصلة منها جميع اهل السماوات والارض لنجوا بها

''اللہ تعالیٰ نے حقیقی تائب کو تین فضیلتیں عطا کی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی تمام اہل آسمان و زمین کو دی جاتی تو وہ اس کے سبب نجات پا لیتے اور وہ یہ ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۲۲۲﴾ (بقرہ: ۲۲۲)

یعنی ''اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور طہارت اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

ظاہری بات ہے کہ جس سے اللہ محبت کرے، اسے سزا نہیں دے گا۔

اس کے بعد حدیث میں اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ

هُوَالۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۞

''وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر چھائے ہوئے ہیں۔ پس تو ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور ان کو عذاب جہنم سے بچا۔ اے ہمارے رب! تو انہیں جنت کے باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے جو صالح تھے، ان کو بھی۔ تو غالب اور حکیم ہے اور انہیں برائیوں سے محفوظ رکھ اور جس کو اس دن تو نے برائیوں سے محفوظ رکھا، تو نے اسے اپنی رحمت میں داخل کرلیا اور یہی عظیم کامیابی ہے۔'' (مومن ۷ تا ۹)

اس مقام پر ہم توبہ کے بارے میں، جو کہ تہذیبِ اخلاق کی طرف پہلا عملی قدم ہے، اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اگر چہ اس سلسلہ میں اور بھی مباحث ہیں جن کا توبہ کے بارے میں ایک مستقل بحث میں ذکر کیا جانا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک قلب گناہ کے زنگ سے پاک نہ ہو اور انسان کی جان اور روح توبہ کے پانی کے ذریعے پاک نہ ہو جائے اور توبہ کا نور گناہ کی تاریکی کو باہر نہ نکال دے، تہذیب اخلاق، سیر و سلوک الی اللہ، قرب الٰہی کی منزل تک پہنچنا، نورِ ہدایت اور ناقابل بیان عرفانی جذبات میں غرق ہو جانا ناممکن ہے۔

یہ پہلی منزل ہے اور ایسی منزل ہے جو ہر منزل سے زیادہ اہم ہے۔ اس منزل تک پہنچنا پختہ ارادے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور الطاف کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرا قدم۔ مشارطہ

سیر و سلوک کے مراحل کے بارے میں گزشتہ صفحات میں ہم نے مختصراً اشارہ کیا ہے۔ اب وہ مرحلہ آچکا ہے کہ ہم آیات و روایات کی روشنی میں ان کے بارے میں تفصیل سے بات کریں۔

علمائے اخلاق نے توبہ کے بعد جس قدم کا ذکر کیا ہے، وہ مشارطہ ہے۔ مشارطہ کے معنی ہیں اپنے نفس کے ساتھ شرط باندھنا۔ اس میں ہر روز اپنے نفس کو نصیحت اور یاددہانی کروائی جاتی ہے۔ اس کا بہترین وقت صبح کی نماز سے فراغت کے بعد بیان کیا گیا ہے جو اس عبادت کے نور سے منور ہوتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے اور یاد آوری کرواتا ہے کہ میرے پاس عمر سے زیادہ قیمتی کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ اگر یہ سرمایہ برباد ہو گیا تو میرا سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ انسان کو چاہئے کہ سورۃ العصر کی تلاوت کرکے اپنے

نفس سے کہے کہ اگر میرا سرمایہ ضائع ہو گیا تو میں بہت بڑے اور نا قابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جاؤں گا۔ اس نقصان کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب میں ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی تلقین جیسا سرمایہ اکٹھا کر سکوں۔

انسان اپنے آپ سے کہے کہ ذرا سوچو! اگر اس حالت میں تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے اور مرنے کے بعد کے مراحل کی سختیاں دیکھ کر تم سخت پشیمان ہو کر گڑگڑاتے ہوئے فرشتوں سے التجا کرو:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ

''اے فرشتو! اللہ کیلئے مجھے دنیا میں واپس بھیج دو تا کہ اپنی کوتاہیوں کے مقابلہ میں اچھے اعمال انجام دے سکوں۔'' (مومنون:۹۹،۱۰۰)

فرض کرو کہ فرشتوں نے ''کلا'' (ہرگز نہیں) کہہ کر تمہیں منفی جواب دے دیا تو بتاؤ کہ اس زندگی میں کی گئی کوتاہیوں کی تلافی کس طرح کرو گے!

پھر اپنے ساتوں اعضاء، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور شرمگاہ کے بارے میں اپنے نفس سے اس طرح گفتگو کرے کہ یہ اعضاء تیرے کارکن اور خادم ہیں اور تیرے تابع فرمان ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے سے ایک خاص گروہ کو جہنم میں داخل کیا جائے گا؟ ہوسکتا ہے یہ سات دروازے ان سات اعضاء سے گناہ کرنے والوں کیلئے ہوں، پھر کیوں نہ ان اعضاء کو قابو میں رکھ کر جہنم کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا جائے اور جنت کے دروازے اپنے اوپر کھول لئے جائیں۔

اسی طرح اپنے نفس کو اپنے ان اعضاء کے بارے میں سمجھائے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ ان سے اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کو صرف اُس کی اطاعت میں استعمال کرنا چاہئے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی بعض دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشارطہ کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ صحیفۂ سجادیہ کی اکتیسویں دعا میں، جو دعائے توبہ کے نام سے معروف ہے، آپؑ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

ولك یارب شرطی الا اعود فی مکروهك، وضمانی ان لا ارجع فی مذمومك وعهدی ان اهجر جمیع معاصیك

''اے میرے رب! میں نے تیری بارگاہ میں یہ شرط کی ہے کہ جو کچھ تجھے پسند نہیں ہے، اس کی طرف واپس نہ لوٹوں گا اور میں یہ عہد کرتا ہوں کہ جن چیزوں کی تو نے مذمت کی ہے، ان کے قریب نہ جاؤں گا اور جن چیزوں سے تو نے منع فرمایا ہے، ان سے دور رہوں۔''

قرآنی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب اہم امور سے متعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا کرتے تھے

اور یہ بھی مشارطہ کی ایک قسم ہے۔سورۂ احزاب، آیت ۲۳ میں ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''مومنین کے درمیان کچھ ایسے افراد ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچائی کے ساتھ پورا کیا (اوراس راہ میں شہادت پائی) جبکہ ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''(بحارالانوار، ۶۷:۶۴)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض اللہ سے عہد اور شرط باندھتے تھے اور اسے توڑ دیتے تھے۔اس آیت سے پہلے آیت ۱۵ میں ہے:

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾

'(کچھ لوگ جو جنگ احزاب میں دوسروں کو میدانِ جنگ سے واپسی کی ترغیب دیتے تھے) اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ میدان میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ کے عہد کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا۔''

ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من لم يتعاهد النقص من نفسه غلب عليه الهوى، و من كان في نقص فالموت خيرله

''جوشخص اپنی ذات کے نقائص کی چھان بین نہ کرے، اس کی خواہشات اس پر غالب آجاتی ہیں اور جوشخص نقص کی حالت پر باقی رہے، اس کیلئے موت بہتر ہے۔''(بحارالانوار ۶۷:۶۴)

مختصر یہ کہ مشارطہ تہذیب اخلاق کی راہ میں اٹھایا جانے والا ایک اہم قدم ہے۔اس کے بغیر غفلت وفریب کے سیاہ بادل انسان کے دل پر اپنا منحوس سایہ ڈال دیتے ہیں اور اس کی نجات بہت مشکل ہوجاتی ہے۔

تیسرا قدم مراقبہ

''مراقبہ'' رقبہ سے ماخوذ ہے اور عربی میں رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔جب انسان کسی چیز کی نگرانی کرتا ہے تو اپنی گردن اونچی کر کے دیکھتا ہے۔لہٰذا مراقبہ کا لفظ نگرانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

علمائے علم اخلاق کی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں:''اپنے آپ کی نگرانی کرنا'' مراقبہ کا مرحلہ مشارطہ کے بعد آتا ہے۔

یعنی جب انسان مشارطہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی اور گناہ سے اجتناب کا عہد کر لیتا ہے تو اس کے بعد اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پاکیزگی پر کڑی نظر رکھے، اس لئے کہ غفلت کی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے تمام عہد و پیمان و مشارطہ کی عمارت زمین بوس ہو جائے۔

البتہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی نگرانی کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَۙ ﴿۱۰﴾

یعنی "بے شک تمہارے اوپر حفاظت اور نگرانی کرنے والے (کراماً کاتبین) مقرر کیے گئے ہیں (جو تمہارے اعمال کی کڑی نگرانی کرتے ہیں)"۔ (سورۂ انفطار: ۱۰)

اس آیت میں حافظین سے مراد اعمال کی نگرانی کرنے والے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے:

يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

یعنی "جو کچھ تم کرتے ہو، وہ اسے جانتے ہیں۔" (انفطار: ۱۲)

سورۂ ق کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ ﴿۱۸﴾

"انسان جو لفظ بھی اپنے منہ سے نکالتا ہے، ایک فرشتہ اس کی نگرانی کیلئے مامور ہوتا ہے۔"

ان سب سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کا سب سے بڑا نگران ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ﴿۱﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔" (نساء: ۱)

سورۂ احزاب کی آیت ۵۲ میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا ﴿۵۲﴾

"اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔"

سورۂ علق، آیت ۱۴ میں ہے:

اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾

"کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ (اس کے تمام اعمال و اموال) کو دیکھ رہا ہے؟"

سورۂ سبا، آیت ۲۱ میں ہے:

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

''اور تیرا رب ہر چیز پر محافظ ہے۔''

لیکن سالکانِ راہِ حق، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کریں، خود اپنے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ مراقبت اندر سے اُٹھتی ہے، باہر سے مسلط نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر بہت زیادہ اور غیر معمولی ہوتا ہے۔ البتہ بیرونی مراقبت پر توجہ دی جائے تو اندرونی مراقبت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔

درحقیقت اس دنیا میں انسان کی حیثیت اس شخص کی مانند ہے جس کے پاس گراں بہا موتی ہیں۔ وہ بازار میں جاتا ہے تاکہ ان کے بدلہ اپنے لئے بہترین اربابِ زندگی خریدے لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد چوروں اور ٹھگوں کا ہجوم ہے۔ ایسی صورت میں وہ ذرا سی بھی غفلت کرے تو اس کا نفیس اور قیمتی سرمایہ لٹ سکتا ہے اور وہ حسرت و اندوہ سے ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔

بالکل اسی طرح شیاطین جن و انس، اس دنیا میں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اندرونی ہوا و ہوس بھی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد نہ کرے اور اپنے اعمال کی نگرانی نہ کرے تو اس کے ایمان اور تقویٰ کا سرمایہ لٹ جائے گا اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا کو جاتے وقت خالی ہاتھ ہوگا۔

قرآنی آیات و احادیث میں اس حقیقت کی طرف متعدد مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے:

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿١٤﴾

''کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟'' (علق: ۱۴)

یہ آیت ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، لہٰذا ہمیں بھی چاہئے کہ اپنے اعمال پر نظر رکھیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨﴾ (حشر: ۱۸)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ ہر انسان یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے۔ اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو (اور جان لو کہ) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں یہ جملہ ''وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ'' (ہر انسان دیکھے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے)، درحقیقت مراقبہ کے مفہوم کو بیان کر رہا ہے۔

ایک اور مقام پر اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ﴿٢٤﴾

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے پر نظر رکھے۔'' (عبس: ۲۴)

یعنی انسان یہ دیکھے کہ اس نے کھانا حلال کے راستے سے حاصل کیا ہے یا حرام کے راستے سے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کی تفسیر میں:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

یعنی ''اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔'' فرماتے ہیں:

الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك

''احسان یعنی نیکی یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (کنز العمال، ۳:۲۲، بحار الانوار، ۲۵:۲۰۴)

یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ اگر انسان اس حقیقت کی طرف توجہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، تو اس سے اس کے اندر مراقبہ کی روح زندہ ہو جاتی ہے تاکہ وہ مسلسل اپنے اعمال کی نگرانی کرے۔

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم)

ينبغي ان يكون الرجل مهيمنا على نفسه، مراقبا قلبه، حافظا لسانه

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر حاوی رہے، اپنے دل کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔''

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من رعى قلبه عن الغفلة و نفسه عن الشهوة و عقله عن الجهل، فقد دخل في ديوان المتنبهين، ثم من رعى عمله عن الهوى، ودينه عن البدعة، وماله عن الحرام فهو من جملة الصالحين

''جو شخص اپنے دل کی غفلت سے، اپنے نفس کو شہوت سے اور اپنی عقل کو جہل سے بچائے، اس کا نام بیدار اور آگاہ افراد کے دیوان (رجسٹر) میں لکھا جاتا ہے۔ جو کوئی اپنے عمل کو نفس پرستی سے، اپنے دین کو بدعت سے اور اپنے مال کو حرام سے بچائے، وہ صالحین میں شمار ہوگا۔'' (بحار الانوار، ۶۷:۶۸)

۵۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یابوسا للقانطین من رحمتی، و یابوسا لمن عصانی ولم یراقبنی

''بدنصیب ہیں وہ جو میری رحمت سے مایوس ہیں اور بدنصیب ہیں وہ جو میری نافرمانی کرتے ہیں اور توجہ نہیں رکھتے کہ میں دیکھ رہا ہوں۔'' (اصولِ کافی، ۲:۶۷)

۶۔ ایک خطبہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرحم اللہ امرء راقب ربہ وتنکب ذنبہ، وکابر ھواہ، وکذب مناہ

''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے رب کی طرف متوجہ رہتا ہے، گناہ سے پرہیز کرتا ہے، اپنے نفس کی خواہش سے جنگ کرتا ہے اور اپنی آرزوؤں کو جھٹلاتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۴:۳۴۹)

۷۔ نہج البلاغہ میں ہے:

فاتقوا اللہ عباد اللہ تقیۃ ذی لب شغل التفکر قلبہ ___ وراقب فی یومہ غدہ

''اللہ سے ڈرو، اس صاحب عقل شخص کی طرح جس کی سوچ نے اس کے دل کو مشغول رکھا ہوا ہے اور جو آج، کل (قیامت) کے بارے میں مراقبہ کرتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۸۳)

ان روایات میں اپنے بارے میں، اللہ کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں مراقبہ کرنے کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی اپنے اعمال اور اخلاق پر ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں کڑی نظر رکھنا۔

مختصر یہ کہ سالکانِ راہ خدا پر لازم ہے کہ مشارطہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا عہد و پیمان باندھنے کے بعد انسان اپنے اوپر مسلسل اور کڑی نگرانی رکھے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوا یہ عہد و پیمان کسی بھی موقع پر ٹوٹنے نہ پائے۔ اس سلسلہ میں انسان کو اپنے نفس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جیسے قرض خواہ مقروض سے کرتا ہے، اس لئے کہ جس طرح انسان دوسروں سے اپنے مالی مطالبات میں سستی کرے تو اس کا سرمایہ ضائع ہوسکتا ہے، اسی طرح اگر وہ معنوی معاملات میں اپنے نفس سے مطالبہ کرنے میں سستی کرے تو بہت بڑا نقصان اٹھائے گا۔

چوتھا قدم محاسبہ

چوتھا قدم جو علمائے علم اخلاق نے رہروانِ راہ قرب کیلئے بیان کیا ہے، وہ محاسبہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر سال، ہر ماہ، ہر ہفتہ یا ہر دن کے اختتام پر اپنے اچھے اور برے اعمال، اطاعت و معصیت خدا اور خدا پرستی اور نفس پرستی کے حوالہ سے اپنا محاسبہ کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک تاجر اپنے تجارتی معاملات کا انتہائی باریک بینی سے محاسب کرتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ محاسبہ دینی امور میں ہو یا دنیوی امور میں، اس کا ان دو بڑے فائدوں میں سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر محاسبہ کے نتیجہ میں زیادہ منافع نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل صحیح تھا اور یہ کہ اسے اپنے اسی راستے پر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ اگر محاسبہ کے دوران نقصان نظر آئے تو اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا طریقہ کار غلط تھا یا کہیں کوئی چور یا بددیانت افراد اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں لامحالہ وہ اپنے معاملات کی اصلاح کی طرف توجہ دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں آیات و احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر اشارات پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد آیات ہمیں اس نکتہ پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ کائنات میں ہر جگہ ایک لطیف نظم و ربط کام کر رہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں ہر نظام حساب و کتاب کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝

''اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں قانون مقرر کیا تا کہ تم میزان میں طغیان نہ کرو (اور اسے عدل اور حساب کی راہ سے منحرف نہ کر دو)۔'' (الرحمن: ۷، ۸)

ایک اور مقام پر ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝

یعنی ''اللہ کے پاس ہر چیز کی ایک مقدار (واضح حساب) ہے۔'' (سورۂ رعد: ۸)

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (حجر: ۲۱)

''ہر چیز کے خزانے صرف ہمارے پاس ہیں اور ہم انہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔''

قرآن شریف کی متعدد آیات میں قیامت کے دن کے سخت اور باریک بینی پر مبنی حساب کا ذکر ہے۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝

''اگر ایک ذرے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو تو خواہ کسی چٹان کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں، اللہ اسے (قیامت کے دن حساب کیلئے) لے آئے گا۔ اللہ لطیف اور خبیر ہے۔'' (لقمان: ۱۶)

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ (بقرہ:۲۸۴)

''جو کچھ تمہارے باطن میں ہے، خواہ اسے ظاہر کردیا یا چھپاؤ، اللہ اس پر تمہارا حساب لے گا۔''

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہی ''یوم الحساب'' ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶

''جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کیلئے سخت عذاب ہے، اس لئے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے تھے۔'' (ص:۲۶)

قیامت کے دن کا حساب اس قدر سخت اور باریک بینی پر مبنی ہوگا کہ انسان کو خود ہی اپنا محتسب بنا دیا جائیگا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴

یعنی ''اپنا اعمال نامہ پڑھ۔ آج اپنا حساب کرنے کیلئے تو خود ہی کافی ہے۔'' (بنی اسرائیل:۱۴)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا اور آخرت میں ہر چیز کا حساب ہے، انسان کیلئے اس بات کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ اس زندگی میں حساب سے غافل رہے! جب کل اسے اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ آج سے، اسی دنیا میں اپنا محاسبہ کرے۔ بنابراین مندرجہ بالا آیات اور ان جیسی دیگر آیات انسان کو یہ اہم پیغام دیتی ہیں کہ اپنے حساب سے غافل نہ رہے۔ اگر وہ چاہتا ہو کہ کل اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے وقت اس کی پشت پر گناہوں کا بوجھ نہ ہو تو اسی دنیا میں خود اپنا محاسبہ کرے، اس سے پہلے کہ اس دنیا میں اس کا حساب لیا جائے۔

احادیث میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

۱۔ ایک مشہور حدیث نبویؐ میں ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبو اوزنوھا قبل ان توزنو او تجھزوا للعرض الا کبر

''اپنا محاسبہ کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور اپنا وزن کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے اور (قیامت کے دن کی) بڑی حاضری کیلئے تیار ہو جاؤ۔'' (بحارالانوار:۶۷:۷۳)

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے حضرت ابوذرؓ غفاری کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

یاباذر حاسب نفسك قبل ان تحاسب فانه اھون لحسابك غدا وزن نفسك قبل توزن

''اے ابوذرؓ! اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، اپنا محاسبہ کرو اور اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا

جائے اپنا وزن کرو۔" (میزان الحکمہ ،۱:۱۹ بحوالہ امالی طوسی)

۳۔ ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ما احق للانسان ان تکون له ساعة لا یشغله شاغل یحاسب فیها نفسه، فینظر فیما اکتسب لها و علیها فی لیلها و نهارها

"انسان کیلئے کس قدر اچھا ہے کہ اپنے اوقات میں سے ایک ساعت مخصوص کرے جس میں کوئی کام اسے اپنی طرف مشغول نہ کرے، اس میں وہ اپنا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ جو کام اس نے اپنے شب و روز میں انجام دیئے ہیں، ان میں سے کونسا اس کیلئے مفید اور کونسا نقصان دہ ہے۔" (مستدرک الوسائل:۱۲: ۱۵۴)

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی بات کو اس پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

حق علی کل مسلم یعرفنا، ان یعرض عمله فی کل یوم و لیلة علی نفسه، فیکون محاسب نفسه، فان رای حسنة استزاد منها و ان رای سیئة استغفر منها لئلا یخزی یوم القیامة

"ہر مسلمان جو ہماری معرفت رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ ہر شب و روز اپنے اعمال کا جائزہ لے، اپنا محاسبہ کرے۔ اگر کوئی نیکی دیکھے تو اس میں اضافہ کی دعا مانگے اور اگر اسے کوئی برائی نظر آئے تو اس سے استغفار کرے تا کہ قیامت کے دن رسوا نہ ہو۔" (تحف العقول:۲۳۱)

۵۔ اس بات کو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یا هشام لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم فان عمل حسنة استزاد منه و ان عمل سیئا استغفر الله منه و تاب (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۵۳)

"اے ہشام! جو کوئی ہر روز اپنا محاسبہ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پس اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اس میں اضافے کی دعا مانگے اور اگر کوئی برا عمل انجام دیا ہو تو اس سے استغفار اور توبہ کرے۔"

اس موضوع پر احادیث بہت زیادہ ہیں۔ جو حضرات ان کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں، مستدرک الوسائل، کتاب الجہاد، ابواب جہاد النفس کی طرف رجوع کریں۔ (مستدرک الوسائل، ۱۲: ۱۵۲ تا ۱۵۶، اصول کافی ۲: ۴۵۳)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں محاسبۂ نفس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ جو لوگ اہل محاسبۂ نفس نہیں ہیں، وہ آئمہ معصومینؑ کے سچے پیروکار نہیں ہیں۔

ان احادیث میں محاسبہ کے فلسفہ وحکمت کی طرف بھی واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کام نیکیوں میں اضافے اور برائیوں کی روک تھام اور تلافی کا باعث ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسان گرداب ہلاکت میں گرنے اور غفلت کے دریا میں ڈوبنے سے بھی محفوظ ہوجاتا ہے۔

یہ بات بہت غور وفکر کے قابل ہے کہ ہم مادی اور معنوی امور کو یکساں اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ مادی امور میں تو ہم بڑے حساب کتاب اور کھاتے وغیرہ کا انتہائی باریک بینی سے انتظام کرتے ہیں لیکن معنوی امور کا انگلیوں پر بھی حساب نہیں کرتے، حالانکہ معنوی امور کی اہمیت مادی امور کی نسبت اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے درمیان موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

لایکون العبد مومنا حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریك شریکه، و السید عبده

''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے نفس سے حساب لینے میں اتنی سخت گیری نہ کرے جتنی کوئی شریک اپنے شریک یا مالک اپنے غلام سے حساب لینے میں کرتا ہے۔'' (محاسبۂ نفس از سید ابن طاؤس: ۱۴، بحارالانوار، ۶۷، ۷۲)

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ بعض بزرگوں نے محاسبۂ نفس کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں جن میں سید ابن طاؤس متوفی ۶۶۴ ہجری کی ''محاسبۃ النفس''، نویں ہجری کے عالم مرحوم کفعمی کی ''محاسبۃ النفس'' اور سید علی مرعشی متوفی ۱۰۸۰ ہجری کی ''محاسبۃ النفس'' اور حاج مرزا علی حائری مرعشی متوفی ۱۳۴۴ ہجری کی "محاسبة النفس فی اصلاح عمل الیوم والاعتذار من الامس" قابل ذکر ہیں۔

اس مقام پر چند امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ انسان کو اپنا محاسبہ کس طرح کرنا چاہئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنا محاسبہ کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ آپؑ نے رسول اللہؐ کی یہ حدیث بیان فرمائی:

اکیس الکیسین من حاسب نفسه

''عاقل ترین شخص وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرے۔''

ایک شخص نے پوچھا:

و کیف یحاسب الرجل نفسه

یعنی ''انسان کس طرح اپنا محاسبہ کرے؟''

امام علیہ السلام نے اسے تفصیلی جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''جب سارا دن گزر جانے کے بعد شام ہو تو اپنے نفس کو مخاطب قرار دے کر کہو: اے نفس! آج کا دن گزر گیا اور قیامت تک واپس نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے اس کے بارے میں پوچھے گا کہ تو نے یہ دن کیسے گزارا؟ اس دن میں کیا عمل کیا؟ آیا اللہ کا ذکر کیا اور اس کی حمد کی؟ آیا کسی مومن کی غیبت کو روکا؟ آیا کسی مسلمان کی مدد کی؟ آج کون کون سے مثبت کام کئے؟

اس کے بعد دن بھر کے کاموں کو یاد کرے۔ اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اللہ کی حمد کرے اور تکبیر کہے کہ اس نے اللہ کی توفیق سے یہ نیکی انجام دی۔ اگر اس کا کوئی برا عمل اسے یاد آئے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اسے ترک کرنے کا پختہ عزم کرے اور محمدؐ و آل محمدؑ پر صلوات بھیج کر اور امیر المؤمنین علیہ السلام سے تجدید بیعت کے ذریعے اپنے دل سے اس کے آثار کو محو کرنے کی کوشش کرے اور انؑ کے دشمنوں پر اور انؑ کے حقوق روکنے والوں پر لعنت کرے۔''

جب انسان یہ جامع اور کامل محاسبہ انجام دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''چونکہ تو ان سے محبت کرتا ہے جو میرے محبوب ہیں اور ان سے دشمنی کرتا ہے جو میرے دشمن ہیں (اور تیرے اس محاسبۂ نفس کی وجہ سے) میں تیرے گناہوں پر سخت گیری نہیں کروں گا اور تجھے اپنے عفو میں داخل کروں گا۔'' (بحار الانوار: ۸۹:۲۵۰)

بلاشبہ یہ محاسبہ کا بہترین طریقہ ہے۔

۲۔ محاسبۂ نفس کے آثار کیا ہیں؟

اگرچہ اس سوال کا جواب گزشتہ بیانات سے واضح ہو جاتا ہے لیکن بہتر ہے کہ جو کچھ اس بارے میں احادیث میں بیان ہوا ہے، اس سے بھی استفادہ کیا جائے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه وقف علی عیوبه و احاط بذنوبه. و استقال الذنوب واصلح العیوب

''جو کوئی محاسبۂ نفس کرتا ہے، اپنے عیوب سے واقف ہو جاتا ہے اور اپنے گناہوں کا احاطہ کر لیتا ہے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اپنے عیوب کی اصلاح کرتا ہے۔'' (غرر الحکم)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه سعد

''جو اپنا محاسبہ کرتا ہے، خوش نصیب ہو جاتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل: ۱۲: ۱۵۴)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

ثمرۃ المحاسبۃ صلاح النفس

یعنی ''اصلاحِ نفس محاسبہ کا ثمر ہے۔'' (غرر الحکم)

بعض علمائے اخلاق نے محاسبہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ محاسبہ اس طرح سے کیا جائے جیسے اپنے شریک کار سے کیا جاتا ہے۔ اگر منافع حاصل ہو تو اپنا حصہ وصول کرے اور شریک کار کا شکریہ ادا کرے، اگر نقصان پر نظر پڑے تو شریک کار کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائے اور اسے مستقبل میں اس نقصان کی تلافی پر مجبور کرے۔

انسان کا سب سے اہم سرمایہ یعنی اس کی عمر کا بھی یہی حال ہے۔ یہ سرمایہ انسان کے نفس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا نفع کارہائے خیر اور اس کا خسارہ اور نقصان گناہ ہیں۔ اس کی تجارت کا وقت دن بھر کے اوقات اور اس کا شریک تجارت اس کا نفس امارہ ہے۔

انسان پر لازم ہے کہ محاسبہ کرتے وقت سب سے پہلے اپنے نفس سے فرائض کا حساب لے۔ اگر سارے فرائض انجام دیئے گئے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اس راہ پر چلنے میں اپنی حوصلہ افزائی کرے۔ اگر کوئی فریضہ ادا ہونے سے رہ گیا ہو تو اپنے آپ سے اس کی قضا بجالانے کا مطالبہ کرے۔ اگر کوئی فریضہ ناقص طور پر انجام دیا گیا ہو تو نوافل کے ذریعے اس کے نقص کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب کیا ہو تو اس کی تلافی کا مطالبہ کرے، جیسے ایک تاجر اپنے شریک کار سے محاسبہ کرتا ہے، یہاں تک کہ چھوٹی سی رقم کے بارے میں بھی اسے کوئی رعایت نہیں دیتا تاکہ اسے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ انسان کو نفس امارہ کے ساتھ خاص طور پر ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے کیونکہ وہ انتہائی مکار اور چالباز ہے۔

انسان کو چاہئے کہ جو محاسبہ قیامت کے دن فرشتوں نے کرنا ہے، اسی دنیا میں خود اپنے لئے کرے، یہاں تک کہ محاسبہ کرتے وقت اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات، اپنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے بولنے اور خاموشی پر بھی اپنا محاسبہ کرے۔ مثلاً اپنے نفس سے سوال کرے کہ فلاں مقام پر کیوں خاموش رہے؟ فلاں موقع پر فلاں بات کیوں کہی؟ (بہتر ہے کہ انسان روز بروز یا ہر گھنٹے اپنا محاسبہ کرے، ورنہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا)۔

اگر انسان اپنی زندگی میں انجام دیئے جانے والے ہر گناہ پر ایک کنکر اپنے گھر کے کسی کونے میں رکھتا رہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے گھر کا صحن کنکروں سے بھر جائے گا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نقائص اور عیوب کا محاسبہ کرنے کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن جو فرشتے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال لکھنے کیلئے مقرر فرمائے ہیں، وہ اپنا کام انتہائی باریک بینی سے انجام دیتے ہیں۔ ان سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَحۡصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوۡهُ ؕ

یعنی ''اللہ نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے اور یہ اسے بھولے ہوئے ہیں۔'' (مجادلہ:٦)

ہم اس بحث کا اختتام اس حدیث پر کرتے ہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کس طرح محاسبہ ہوگا تا کہ ہم دنیا میں محاسبہ کا طریقہ سیکھ سکیں:

رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع عن عمره فی ما افناه و عن شبابه فی ما ابلاه، وعن ماله من این اکتسبه و فی ما انفقه و عن حبنا اهل البیت (خصال صدوق:٢٥٣)

''قیامت کے دن قدم اٹھانے سے قبل ہر انسان سے چار چیزوں کا سوال کیا جائے گا:

١۔ اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی؟

٢۔ اپنی جوانی کو کہاں صرف کیا؟

٣۔ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

٤۔ ہم اہل بیتؑ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا (کہ آیا ہماری محبت کا حق ادا کیا یا نہیں؟)''

پانچواں قدم معاتبہ و معاقبہ (سرزنش اور سزا)

پانچواں قدم جو محاسبہ کے بعد آتا ہے، وہ معاتبہ اور معاقبہ ہے یعنی سرزنش اور سزا۔ یعنی انسان اپنے نفس کو اس کی خطاؤں اور خلاف ورزیوں پر سرزنش کرے اور سزا دے، اس لئے کہ اگر انسان محاسبہ کرے اور غلط کاموں کے خلاف کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کرے تو محاسبہ کا الٹا اثر ہوگا یعنی نفس مزید جری اور دلیر ہوجائے گا۔

جب انسان اپنے نوکروں اور ملازمین کا محاسبہ کرتا ہے تو ان کے غلط کاموں پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے جو ہلکی سرزنش سے سخت سزا تک کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ قربِ الٰہی کے سفر میں مشغول ہیں، انہیں بھی چاہیئے کہ اپنے سرکش نفس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، ورنہ محاسبۂ نفس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا یعنی اس کی جرأت اور حوصلے میں اضافہ ہوجائے گا۔

قرآن مجید میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس لوامہ کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ﴿۲﴾

''میں نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں۔'' (سورۂ قیامت:٢)

ہم سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفس لوامہ سے مراد انسان کا زندہ اور بیدار ضمیر ہے جو برے اعمال کی انجام دہی

پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک قسم کی سزا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ برے کاموں کی انجام دہی پر اپنے آپ کو سزا دینے کے مختلف درجات ہیں جو ملامت سے شروع ہوتے ہیں اور پھر نفس امارہ کو مختلف لذتوں سے محروم کرنے کی صورت میں شدید سے شدید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس کی دلچسپ مثال ان تین افراد کا واقعہ ہے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ جنگ سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ اس قطع تعلق کے نتیجہ میں ان کی حالت یہ ہوگئی کہ گویا زمین اپنی تمام تر راحت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ ان تینوں نے ایک دوسرے سے بھی قطع تعلق کر لیا اور توبہ میں مشغول ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اور ان تین افراد کی بھی توبہ قبول کی جو (مدینہ میں) رہ گئے تھے (اور جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور مسلمانوں س نے ان سے تعلق توڑ لیا تھا) یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے دل بھی ان کیلئے تنگ ہوگئے اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی پناہ نہیں ہے۔ پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی تا کہ وہ توبہ کر سکیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (توبہ:۱۱۸)

ممکن ہے یہ جملہ ''وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ ''، ''ان کے دل بھی ان پر تنگ ہوگئے''، معاقبہ نفس کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو سزا دینے کیلئے آپس میں ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا اور مکمل تنہائی اور خلوت اختیار کر لی ہو اور اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہو۔

اسی طرح سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۲ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ابولبابہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ آیت یہ ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

''اور کچھ دوسرے لوگ، جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور اچھے اور برے اعمال باہم مخلوط کر دیئے، امید ہے اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا

ہے۔" (توبہ:۱۰۲)

ابولبابہ ایک انصاری تھے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ بعد میں سخت پشیمان ہوئے اور اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ یہ ستون اب بھی ستونِ ابولبابہ یا ستونِ توبہ کے نام سے معروف ہے۔ وہ کچھ عرصہ اس ستون سے بندھے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت نازل کرکے ان کی توبہ کو قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔

ظاہری بات ہے کہ ابولبابہ کا یہ اقدام "معاقبہ" یعنی اپنے آپ کو سزا دینا شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیر و سلوک کا یہ قدم رسول اللہؐ کے دور میں ان کے اصحاب میں بھی رائج تھا۔

ممکن ہے آیت کا یہ جملہ "خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ" (انہوں نے اچھے اور برے اعمال باہم ملا دیئے) بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

احادیث میں بھی معاقبہ کے بارے میں واضح بیانات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے متقین کی نمایاں صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان استصعبت علیه نفسه فی ما تکره لم یعطها سولها فی ما تحب

"جب بھی اس کا نفس کسی ایسے کام کو انجام دینے میں سرکشی کرے جو اسے ناگوار گزرتا ہے (یا گناہ کی راہ پر چلتا ہے) تو وہ (یعنی متقی) بھی اس (یعنی نفس) کو اس کی پسندیدہ چیز سے محروم کر دیتا ہے (اور اس طرح اپنے سرکش نفس کو سزا دیتا ہے)۔" (نہج البلاغہ: ۱۹۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک متقی انسان اپنے نفس کی سرکشی کی وجہ سے اسے نیند، اس کی پسندیدہ خوراک اور آرام وغیرہ سے محروم کر دیتا ہے تاکہ اس طرح نفس کو سزا ملے اور وہ آئندہ گناہ اور نافرمانی کی راہ پر نہ چلے۔

۲۔ غرر الحکم میں ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

اذا صعبت علیك نفسك فاصعب لها تذل لك

"جب تمہارا نفس سخت گیری کرے (یعنی اللہ کی اطاعت میں تمہارا ساتھ نہ دے) تو تم بھی اس پر سخت گیری کرو (یعنی اسے اس کی پسندیدہ چیزوں سے محروم کر دو) تاکہ وہ تمہارا مطیع ہو جائے۔"

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

من ذم نفسه اصلحها من مدح نفسه ذبحها

جو اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے، وہ اس کی اصلاح کرتا ہے اور جو اس کی تعریف کرتا ہے، وہ اسے ذبح کر دیتا ہے۔ (غرر الحکم)

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

دواء النفس الصوم عن الھوی، والحمیہ عن الذات الدنیا

''سرکش نفس کی دوا خواہشات پر قابو رکھنا اور دنیوی لذتوں سے پرہیز کرنا ہے۔''(غرر الحکم: ۵۱۵)

اصحاب رسولؐ، علمائے بزرگ اور پاک دل مومنین کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے ارتکابِ گناہ کی صورت میں اپنے نفس کو سزا دی تا کہ مستقبل میں اس گناہ کا تکرار نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ رسولؐ اللہ کے ایک صحابی تھے جن کا نام ثعلبہ تھا۔ وہ انصاری تھے اور انہوں نے سعید بن عبدالرحمن کے ساتھ، جو مہاجر تھے، عہد اخوت باندھا تھا۔ ایک جنگ میں سعید رسولؐ اللہ کے ساتھ گئے جبکہ ثعلبہ مدینہ میں رہے۔ سعید کو اپنے اس بھائی پر اعتماد تھا کہ وہ اس کے اہل و عیال کا خیال رکھے گا۔ وہ بھی اسی بنیاد پر ہر روز انہیں پانی، ایندھن وغیرہ فراہم کرتے تھے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دن سعید کی بیوی پردے کے پیچھے سے ثعلبہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھی کہ ثعلبہ کی نفسانی خواہش اس پر غالب آ گئی۔ اس نے پردہ ایک طرف کر دیا اور سعید کی خوبصورت بیوی کو بانہوں میں لینے کیلئے ہاتھ آگے بڑھائے سعید کی بیوی چیخ کر بولی: ثعلبہ کیا کر رہے ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارا مجاہد بھائی اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو اور تم اس کے گھر میں اس کی بیوی کے بارے میں بری نیت رکھتے ہو؟

ثعلبہ کا ضمیر اچانک بیدار ہو گیا۔ وہ سعید کے گھر سے نکل کر صحرا کی طرف نکل گیا اور گریہ و زاری میں مشغول ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح معافی مانگنے لگا:

الھی انت المعروف بالغفران وانا الموصوف بالعصیان

''اے میرے معبود! تو مغفرت کی وجہ سے معروف ہے جبکہ میں نافرمانی سے موصوف ہوں۔''

اس طرح اس نے اپنے اس گناہ کی وجہ سے سختی کی اور آخر کار آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا آپؐ سے بیان کیا اور اپنی توبہ آپؐ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ نازل فرمائی:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''جب وہ کسی برے کام کے مرتکب ہوتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اور پھر وہ دانستہ

اپنے کئے ہوئے گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔‘‘[1]

۲۔ آیت اللہ بروجردی مرحومؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض اوقات دورانِ درس کسی شاگرد سے سختی سے بات کرجاتے تھے۔اگرچہ یہ ایک پدرانہ سختی ہوتی تھی مگر وہ اس پر اپنے شاگرد سے معافی طلب کرتے تھے اور جیسا کہ انہوں نے منت مانی ہوئی تھی، اس سے اگلے دن روزہ رکھ کر اپنے نفس کو سزا دیتے تھے۔

۳۔ علمائے اخلاق میں سے ایک بزرگ عالم نے ایک خطیب کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں منبر پر جاتے وقت امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں اور ان کا جواب سنتا ہوں۔اگر ان کی طرف سے جواب نہ آئے تو منبر پر نہیں جاتا اور تقریر نہیں کرتا۔میری یہ روحانی حالت اس طرح حاصل ہوئی کہ ایک بار میں ایک بہت بڑی اور اہم مجلس میں گیا۔ایک بہت مشہور خطیب تقریر کررہے تھے۔میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے بعد ایسی تقریر کروں جس سے اس کی دلکش تقریر کا اثر ختم ہوجائے۔لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت ہی برا خیال تھا جو میرے دل میں آیا۔میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے نفس کو سزا دینے کیلئے چالیس دن تک کوئی تقریر نہیں کروں گا۔اس معاقبہ نفس کے نتیجہ میں میرے دل میں یہ نورانیت پیدا ہوگئی کہ امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں تو ان کا جواب سنتا ہوں۔

مختصر یہ کہ مراقبہ اور محاسبہ کا فیصلہ کن اثر صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ان کے بعد معاقبہ اور مناسب سزا کا بھی انتظام ہوتا کہ نفس امارہ کو اس کی سرکشی سے باز رکھا جاسکے، ورنہ مراقبہ اور محاسبہ کی تاثیر بہت کمزور ہوگی۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم جوگیوں اور بھٹکے ہوئے صوفیاء کے طرزِ عمل کو صحیح جاننے لگیں اور ان واقعات کی تصدیق کرنے لگیں جو غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کئے ہیں جن سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان اپنے نفس کی خطاؤں پر اسے خطرناک اور احمقانہ قسم کی سخت سزائیں دے۔معاقبہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان روزہ رکھ کر، یا نفس کی پسندیدہ حلال لذتوں سے اسے محروم کرکے اسے مناسب سزا دے۔

مرحوم نراقی ’’معراج السعادۃ‘‘ میں لکھتے ہیں:

اگر انسان سے کوئی غلط کام سرزد ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو سزا دے، مثلاً کوئی سنگین عبادت انجام دے یا اپنے اموال میں سے کوئی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خیرات کرے۔اگر اس نے حرام یا مشکوک غذا کا لقمہ کھایا ہو تو اپنے نفس پر بھوک مسلط کرے۔اگر کسی کی غیبت کی ہو تو اس کی تعریف کرکے یا اپنے نفس پر خاموشی کو مسلط کرکے اپنے آپ کو سزا دے یا ذکر خدا سے اس کی تلافی کرے۔اگر اس نے کسی فقیر یا تنگدست کی تحقیر کی ہو تو اسے بھاری مقدار میں مال دے اور اسی طرح دیگر گناہوں اور لغزشوں کی تلافی کرے۔

---

[1] یہ واقعہ مختلف کتب میں تفصیل کے ساتھ ’’خزینۃ الجواہر، ص ۳۲۰ سے نقل کیا گیا ہے۔فخر رازی نے تفسیر کبیر، ج ۹، ص ۹ میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نیت اور اخلاصِ نیت

بہت سے علمائے اخلاق نے اخلاقی مباحث کے آغاز میں نیت اور اخلاصِ نیت کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ اور جدا قرار دیا ہے۔یعنی ان کے نزدیک نیت اور چیز ہے اور اخلاصِ نیت اور چیز ہے لیکن مقام بحث میں انہوں نے ان کے فرق کو واضح نہیں کیا۔

ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کیلئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیت سے مراد کسی کام کو کرنے کا عزمِ راسخ اور پختہ ارادہ ہے، خواہ اس کام کو انجام دینے کا محرک الٰہی ہو یا مادی۔

ظاہر سی بات ہے کہ کوئی بھی کام اسی صورت میں نتیجہ بخش ہوسکتا ہے جب مضبوط ارادے اور پختہ عزم کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔حصولِ علم، تجارت، زراعت، پیداواری سرگرمیاں، معاشرتی اور سیاسی سرگرمیاں اور ہر کام صرف اسی صورت میں نتیجہ بخش اور مفید ہوتا ہے جب اسے تذبذب اور دودلی کے ساتھ نہیں بلکہ یقین اور یکسوئی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان اس کام کو انجام دینے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح سے جائزہ لے۔ اس کام کی پیشرفت کی ضروری شرائط اور پیش آنے والی ممکنہ رکاوٹوں سے آگاہ ہو، پھر مضبوط ارادے کے ساتھ میدان میں اترے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔

تہذیب اخلاق اور سیر وسلوک الی اللہ کیلئے بھی پختہ اور دوٹوک ارادہ ضروری ہے۔ کمزور، سست اور کاہل افراد ہرگز اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ معمولی سی رکاوٹ کا سامنا کرنے پر رک جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ کمزور ارادہ انسان کی طاقت کو بھی کمزور کردیتا ہے۔اس کے برعکس قوی ارادہ انسان کی تمام اندرونی صلاحیتوں کیلئے مہمیز ثابت ہوتا ہے اور انسان کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف حرکت میں لے آتا ہے۔

قرآن مجید میں اسی چیز کو عزم کا نام دیا گیا ہے اور اللہ کے بڑے انبیاء کو اسی وجہ سے اولوالعزم کہا گیا کہ ان کے ارادے بہت بلند اور پختہ تھے۔

قرآن مجید میں رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

''ہم نے آدمؑ سے عہد لیا تھا (کہ شجرۂ ممنوعہ کے قریب نہ جانا) لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔'' (طٰہٰ:۱۱۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ماہِ رجب کی ایک دعا میں ہے:

وقد علمت ان افضل زادالراحل الیک عزم ارادة یختارک بها و قدناجاك

بعزم الارادة قلبی

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری طرف آنے والوں کا بہترین زادِسفر پختہ ارادہ ہے جس سے وہ تجھے اختیار کرتا ہے اور میرا دل پختہ ارادے سے تجھ سے مناجات کر رہا ہے۔''

(مفاتیح الجنان، اعمال ماہ رجب)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انما قدر الله عون العباد علی قدر نیاتهم فمن صحت نیته تم عون الله له. و من قصرت نیته قصر عنه العون بقدر الذی قصره

''اللہ تعالیٰ بندوں کی نیت کے حساب سے ان کی مدد کرتا ہے، جس کی نیت صحیح ہو، اللہ اس کی پوری مدد کرتا ہے، جس کی نیت ناقص ہو، اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق اس کی مدد کرتا ہے۔''

(بحارالانوار، ۶۷:۲۱۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما ضعف بدن عما قویت علیه النیة

''جس کام کی نیت مضبوط ہو، بدن اس پر سست اور ناتوان نہیں ہوتا۔'' (بحارالانوار، ۶۷:۲۰۵)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ پختہ عزم اور ارادہ انسان کی جسمانی طاقت کو بھی زیادہ کرتا ہے اور اسے قوت اور حوصلہ بخشتا ہے۔

نیت کے ایک اور معنی

اس میں محرک کا فرق ہے۔ ممکن ہے چند افراد ایک ہی کام کر رہے ہوں، مثلاً جہاد میں شریک ہوں، ایک کا محرک مال غنیمت کا حصول یا برتری طلبی ہو جبکہ دوسرے کا محرک حق کی مدد کرنا، ظلم کا خاتمہ کرنا اور فتنہ کی آگ کو بجھانا ہو۔

ان دونوں افراد کا عمل ظاہری شکل میں ایک جیسا ہے، دونوں میدانِ جنگ میں جا کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہیں لیکن دونوں کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ابتدائے کار میں انسان اپنی نیت کو واضح کر لے۔

سالکانِ راہِ خدا بھی بڑی باریک بینی سے اپنی نیت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا ان کا مقصد اصلاحِ نفس، اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کی منزل تک پہنچنا ہے یا لوگوں پر اپنی برتری کا سکہ جمانے کیلئے کرامات حاصل کرنا ہے!

مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا اشارہ بھی اسی حقیقت کی طرف ہے جو کہ حدیث کے ذیل سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء مانوی فمن کانت هجرته الی الله و رسوله فهجرته الی الله و رسوله ومن کان هجرته الی دنیا یصیبها او امراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه

''اعمال کی قدر و قیمت کا دارو مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی طرف محسوب ہوگی اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا کی خاطر یا کسی عورت سے شادی کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اسی کی طرف محسوب ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔'' (بحار الانوار ۶۷:۲۱۱)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

علی قدر النیة تکون من الله عطیة

''اللہ کی عطا انسان کی نیت کے حساب سے ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم، حدیث ۱۵۹۴)

مندرجہ بالا بحث سے بخوبی یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر کام میں کامیابی کیلئے عزم راسخ، مستحکم نیت اور قوت ارادی اشد ضروری ہے۔ جب تک یہ حاصل نہ ہو، انسان کی تمام کوششیں لاحاصل یا کم حاصل رہیں گی۔

جو لوگ اصلاحِ نفس اور تہذیب اخلاق کی راہ میں قدم بڑھانا چاہتے ہیں، وہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان پر بھی لازم ہے کہ فولادی عزم اور آہنی ارادے سے اپنے کام کا آغاز کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

یہاں یہ سوال پیش آسکتا ہے کہ مذکورہ بالا قوتِ ارادی کو کس طرح حاصل کیا جائے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اس قوتِ ارادی کے حصول کا اصل راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کام کے نتائج اور مقصد کی عظمت کی طرف توجہ کرے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرے۔ جس قدر ان معاملات میں انسان کی سوچ اور تجزیہ وسیع ہوگا اور وہ مقصد کی اہمیت کو اچھی طرح پہچانتا ہوگا، اسی قدر مضبوط قوتِ ارادی سے اس راہ میں قدم اُٹھائے گا۔

جب انسان یہ سوچے کہ اس کے وجود کی قدر و قیمت اس کی اخلاقی صفات پر منحصر ہے اور یہ کہ انسان کی خلقت کا مقصد اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر وہ اس اہم ہدف سے غفلت کرے گا تو اس کی ہلاکت کا سفر شروع ہو جائے گا۔ انسان جس قدر ان حقائق کے بارے میں باریک بینی اور موشگافی سے کام لے گا، اسی قدر پختہ عزم اور ارادے سے اس راہ میں قدم

اُٹھائے گا۔

ایک جملے میں اس بات کو اسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پختہ ارادے، مقصد کی مکمل معرفت اور اس کی طرف مکمل توجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اخلاص

اخلاص سے مراد خلوصِ نیت ہے اور خلوصِ نیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی کام کے فیصلے کے پیچھے اصل محرک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہو۔

ممکن ہے بعض لوگ کسی کام کو انجام دینے کا پختہ عزم اور محکم ارادہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرک مادی ہو۔ لیکن سالکانِ راہِ خدا کا عزم اور ارادہ خلوصِ نیت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور ان کے ہر کام کا محرک الٰہی ہوتا ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث میں کسی چیز کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی، جتنی اخلاصِ نیت کو دی گئی ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ معصومینؑ میں جگہ جگہ اخلاصِ نیت کا ذکر ملتا ہے اور اسے دنیا اور آخرت کی کامیابی کا بنیادی عامل قرار دیا گیا ہے۔ اصولی طور پر اسلام کی نظر میں اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جس میں اخلاص نیت نہ ہو۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اخلاصِ نیت کے حصول کو مشکل ترین کام قرار دیا گیا ہے۔ اس قدر مشکل کہ صرف اللہ کے اولیاء اور بندگانِ خاص ہی اخلاصِ کامل کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اگرچہ اخلاص نیت کا ہر درجہ اپنے مقام پر پسندیدہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر پہلے ہم اخلاص نیت سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں مخلصین (خالص ہونے والے) یا مخلصین (جو خالص ہو چکے ہیں) کے بارے میں بات کی گئی ہے اور مختلف الفاظ میں ان کی تعریف و ستائش کی گئی ہے:

۱۔ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلْقَيِّمَةِ ۝٥

”انہیں اس کے سوا اور کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا کہ اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے یکسوئی سے اس کی عبادت کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی پائیدار دین ہے۔“ (بینہ:۵)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دین کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس میں تمام عقائد و اعمال آجاتے ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ ”ماامروا“ میں ضمیر غائب تمام آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کی طرف لوٹتی ہے، اور اس چیز کے پیش نظر کہ اخلاص، نماز اور زکوٰۃ کا حکم ان سب کو دیا گیا ہے، مسئلہ اخلاص کی اہمیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام احکامِ الٰہی کی بنیاد توحید اور اخلاص کی حقیقت پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ (مومن: ۱۴)

''اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے صرف اللہ کو پکارو خواہ یہ کافروں کو ناگوار گزرے۔''

۳۔ ایک اور مقام پر رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں۔'' (زمر: ۱۱)

ان آیات اور ان جیسی دیگر متعدد آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاص دین کا بنیادی رکن ہے، اس کے علاوہ مخلِصین یا مخلَصین کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اہم عبارات نظر آتی ہیں۔

۱۔ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

تیرے مخلَص بندوں کے علاوہ ان سب کو بہکاؤں گا۔ (حجر۔ ۳۹۔ ۴۰)

یہ بات شیطان نے اس وقت کہی تھی جب اسے بارگاہ قرب الٰہی سے دھتکارا گیا تھا۔ اس آیت سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اللہ کے مخلَص بندوں کی حالت اس قدر مضبوط ہے کہ شیطان کو بھی اس کے گمراہ نہ ہونے کا یقین۔

۲۔ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''تمہیں وہی صلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے رہے، سوائے اللہ کے مخلَص بندوں کے۔''

(صافات۔ ۳۹۔ ۴۰)

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق صلہ ملے گا مگر مخلَصین کو بے حساب اجر و نعمت سے نوازا جائے گا۔

۳۔ اس طرح سورۂ صافات ہی کی آیات ۱۲۷ اور ۱۲۸ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مخلَصین اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے معاف ہوں گے اور امید ہے جنت کی طرف روانہ کر دیئے جائیں گے۔

۴۔ اسی سورت کی آیات ۱۵۹ اور ۱۶۰ میں اللہ کو لوگوں کی بیان کردہ صفات سے پاکیزہ و منزہ قرار دیا گیا ہے مگر مخلَصین کی بیان کردہ توصیف کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اللہ ان کی بیان کردہ صفات سے منزہ ہے، سوائے اللہ کے مخلَص بندوں کے۔''

(صافات:۱۵۹،۱۶۰)

۵۔ سورۂ یوسف کی آیت ۲۴ میں عزیز مصر کی بیوی کے وسوسوں کے مقابلہ میں حضرت یوسفؑ کی حمایت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۲۴

''اس طرح ہم نے بدی اور فحشاء کو اس سے پھیر دیا۔ بے شک وہ ہمارے مخلَص بندوں میں سے تھا۔''

مخلِص اور مخلَص کا فرق بیان کرنے کے لئے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہے کہ مخلِص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کے مراحل میں سے گزر رہے ہیں جبکہ مخلَص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کا عمل مکمل کر کے ہر لحاظ سے مکمل طور پر خالص ہو چکے ہیں۔

یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر پائی جانے والی آلائشات کی دو اقسام ہیں:

ایک وہ آلائشات جن سے انسان آگاہ ہوتا ہے اور ان کو برطرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے عقیدہ وعمل کو خالص بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آلائشات کی دوسری قسم اس قدر مرموز اور پوشیدہ ہوتی ہے کہ اول تو انسان ان کو پہچان ہی نہیں سکتا اور اگر انہیں پہچان لے تو انہیں برطرف کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے:

ان الشرك اخفى من دبيب النمل على صفاة سوداء في ليلة ظلماء

(بحار الانوار:۶۹:۹۳)

''شرک تاریک رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی چال چلتا ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا لطف ایسے حالات میں سالک کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ان دشوار مراحل سے کبھی نہ گزر سکے اور آلائشات میں پھنسا رہ جائے گا۔ لیکن جو لوگ اپنی طاقت، توانائی اور دائرۂ اختیار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اپنے آپ کو حتی الامکان خالص بنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا یہ انعام دیتا ہے کہ باقی ماندہ راستے کو وہ اس کی توفیق وعنایت سے طے کر لیتے ہیں اور مخلِص سے مخلَص ہو جاتے ہیں۔

جب انسان اس مرحلہ پر پہنچ جائے ہیں تو شیاطین کے وسوسوں اور ہوائے نفس کے شر سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے۔ شیطان ایسے انسانوں سے مایوس ہو جاتا ہے اور باقاعدہ طور پر ان کے سامنے ہار مان لیتا ہے۔

اس مقام پر سالک اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وسیع دسترخوان سے بے حساب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اللہ کے جلال اور جمال کے بارے میں ان کی توصیف پر خالص توحید کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ وہ جنت میں بھی بغیر حساب کتاب کے جاتا

ہے، اس لئے کہ دنیا میں ہی وہ اپنا حساب صاف کر چکا ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

قد اخلص للہ فاستخلص

''اس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کیا اور اللہ نے اس کے خلوص کو قبول کر لیا (اور اسے مرحلہ کمال تک پہنچا دیا)۔'' (خطبہ: ۸۷)

اسی بناء پر ایک حدیث میں رسولؐ اللہ کے بارے میں ہے: (بحار الانوار، ۱۴: ۵۲۰)

فعند ذلك استخلص الله عزوجل لنبوته و رسالته من الشجرة المشرفة الطيبة .... محمدا اختصه للنبوة و اصطفاه بالرسالة

''اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت اور رسالت کیلئے حضورؐ کو پاکیزہ شجر سے چن لیا۔''

آئمہ معصومینؑ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

وجدت ابن آدم بين الله و بين الشيطان فان احبه الله تقدست اسمائه. خلصه و استخلصه و الا خلى بينه و بين عدوه (بحار الانوار، ۵: ۵۵)

''میں نے فرزندِ آدم کو اللہ اور شیطان کے درمیان پایا ہے۔ اگر اللہ (اس کے کردار کی وجہ سے) اس سے محبت کرتا ہو تو اسے خالص و مخلص بنا دیتا ہے، ورنہ اسے شیطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔''

مختصر یہ کہ نیت، عقیدہ، اخلاق اور عمل میں اخلاص پیدا کرنا تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کے اہم ترین اور اساسی ترین مراحل میں سے ایک ہے۔

اخلاص احادیث کی روشنی میں

اخلاص کے بارے میں احادیث میں بھی مفصل بحث کی گئی ہے جس کے بعض پہلوؤں کا ہم ذیل میں جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۲۵۔ خصال، باب الثلاثۃ: ۱۶۷)

ثلاث لا يغل عليهن قلب رجل مسلم اخلاص العمل لله عزوجل و النصيحة لائمة المسلمين و اللزوم لجماعتهم

''تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں خیانت نہیں پائی جانی چاہئے: عمل کو اللہ کے خالص کرنا، مسلمان حکام کی خیر خواہی اور جماعت مسلمین کے ساتھ رہنا۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الاخلاص سر من اسراری استودعه قلب من احببته من عبادی

''اخلاص میرے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے میں اپنے اس بندے کے قلب میں ڈالتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔'' (محجۃ البیضاء: ۸:۱۲۵)

۳۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص اشرف نهاية

''اخلاص اشرف ترین انجام ہے۔'' (تصنیف الغرر: ۱۹۷)

۴۔ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

الاخلاص اعلی الایمان

''اخلاص ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔'' (غرر الحکم: ۱:۱۲۵)

۵۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص الاعمال تنافس اولوا النهی والالباب

''اہل عقل و خرد اعمال کے اخلاص میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲: ۵۱۳)

۶۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

بالاخلاص تتفاضل مراتب المومنين

''مومنین کی درجہ بندی اخلاص کے درجات کی بنیاد پر ہوگی۔'' (میزان الحکمہ ،۱:۳۰)

۷۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

غاية اليقين الاخلاص

''اخلاص یقین کا آخری درجہ ہے۔'' (غرر الحکم: ۲)

۸۔ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخلص قلبك يكفك القليل من العمل

''اپنے دل کو خالص کرلو تو تمہارا قلیل عمل بھی کافی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۰:۱۷۵)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص عبادة المقربین

''اخلاص مقربین کی عبادت ہے۔''(غرر الحکم،۱:۲۵)

۱۰۔ ہم اس مفصل بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

طوبی لمن اخلص الله العبادة و الدعاء و لم یشغل قلبه بما تری عیناه، ولم ینس ذکر الله بما تسمع اذناه ولم یحزن صدره بما اعطی غیره

''خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی عبادت اور دعا کو اللہ کیلئے خالص کرے اور اپنے دل کو ان چیزوں میں مشغول نہ کرے جو اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ جو کچھ اس کے کان سنتے ہیں، اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر کو فراموش نہ کرے اور جو کچھ دوسروں کو دیا گیا ہے، اس پر اس کا دل غمگین نہ ہو۔''

(اصولِ کافی)

اخلاص کی حقیقت

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں اس بارے میں کہتے ہیں:

''اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی نیت ہر قسم کے شرکِ مخفی اور شرکِ جلی سے پاک ہو۔''

قرآن مجید میں ہے:

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ ﴿٦٦﴾

''چوپایوں میں تمہارے لئے درس عبرت ہے، اس لئے کہ ہم ان کے پیٹ میں سے ہضم شدہ خوراک اور خوراک کے درمیان سے تمہیں خالص اور لذیذ دودھ پلاتے ہیں۔''(نحل:٦٦)

خالص دودھ وہ ہوتا ہے جو خون کے دھبوں، اندرونِ شکم کی آلائشات اور دیگر آلودگیوں سے پاک ہو۔ خالص نیت اور خالص عمل بھی وہی ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی آلائش نہ ہو۔''(محجۃ البیضاء،۸:۱۲۸)

احادیث میں بھی اخلاص کی حقیقت اور مخلصین کی نشانیوں کے بارے میں نہایت لطیف بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

ان لكل حق حقيقة و ما بلغ عبد حقيقة الاخلاص حتى لایحب ان یحمد علی شیء من عمل لله (بحار الانوار،٦٩:٣٠٤)

''ہر حقیقت کی ایک علامت ہوتی ہے۔کوئی شخص اس وقت تک اخلاص کی حقیقت کونہیں پا سکتا جب تک اس کی حالت یہ نہ ہوجائے کہ وہ اللہ کیلئے کئے گئے اعمال پر اپنی تعریف کو پسند نہ کرے۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

اما علامة المخلص فاربعة، یسلم قلبه، وتسلم جوارحه، وبذل خیره و کف شره (تحف العقول:۱۶)

''مخلص کی چار نشانیاں ہیں: اس کا دل اللہ کے حضور جھکا ہوا ہوتا ہے، اس کے اعضاء اللہ کے حکم کے سامنے جھکے ہوئے ہوتے ہیں، لوگوں کو اس سے خیر نصیب ہوتی ہے اور اپنی برائی کو روکے رکھتا ہے۔''

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لایکون العبد عابد الله حق عبادته حتی ینقطع عن الخلق کله الیه، فحینئذ یقول هذا خالص لی فیتقبله بکرمه

''کوئی عابد اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کرسکتا جب تک مخلوق سے منقطع ہوکر مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوجائے۔ جب وہ ایسا ہوجائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے خالص ہو چکا ہے۔ پس وہ اپنے کرم سے اسے قبول کرلیتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل، ۱:۱۰۱)

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما انعم الله عزوجل علی عبد اجل من ان لایکون فی قلبه مع الله غیره (مستدرک الوسائل، ۱:۱۰۱)

''کسی بندے پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کے ساتھ اور کوئی نہ ہو۔''

اخلاص کی غیر معمولی اہمیت اور راہِ حق پر چلنے اور قرب الٰہی کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں اس کی گہری تاثیر کے بارے میں آگاہی حاصل کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اخلاص کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاص نیت، ایمان، یقین اور معرفت الٰہی کی گہرائی سے جنم لیتا ہے۔ انسان کا توحید افعالی پر جس قدر زیادہ یقین ہوگا اور وہ عالم ہستی میں اللہ کے سوا کسی کو موثر نہ سمجھے، ہر چیز کو اسی کی طرف سے اور اس کے حکم کے تابع سمجھے، حتیٰ کہ اسباب وعوامل کو بھی اس کا مطیع اور محکوم جانے تو ایسے شخص کے تمام اعمال خلوص پر مبنی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کا مبداء موثر صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی مختصر اور مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة اليقين

''اخلاص یقین کا پھل ہے۔''(غرر الحکم،ا:۳۰)

چونکہ ''واعبد ربك حتی یاتیك الیقین''(اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین آ جائے) کی رو سے عبادت اسباب یقین میں سے ہے،اسی لئے حضرت علیؑ ایک اور ارشاد میں فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة العبادة

''اخلاص عبادت کا ثمر ہے۔''(غرر الحکم:ا:۱۷۱)

چونکہ علم معرفت یقین کے ذرائع میں سے ہیں اور یقین اخلاص کا سرچشمہ ہے، ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة العلم اخلاص العمل

''علم کا ثمر اخلاصِ عمل ہے۔''(غرر الحکم،ا:۳۶۱)

آخر میں ہم مولا علی علیہ السلام کا ایک جامع فرمان نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جس میں اخلاص کے سرچشموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اول الدین معرفته و کمال معرفته التصدیق به، و کمال التصدیق به توحیده و کمال توحیده الاخلاص له

''دین کا آغاز اللہ کی معرفت ہے،اس کی معرفت کا کمال اس کی ذاتِ مقدس کی تصدیق ہے،اس کی تصدیق کا کمال توحید ہےاور اس کی توحید کا کمال یہ ہے کہ انسان اس کیلئے خالص ہو جائے۔''

(نہج البلاغہ،خطبہ ا)

اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے اس بارے میں واضح اور لطیف نکات بیان کئے ہیں۔بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاص کی راہ میں بہت سی خفیہ اور آشکار رکاوٹیں موجود ہیں جن میں سے بعض بہت قوی اور خطرناک جبکہ بعض نسبتاً کمزور ہوتی ہیں۔شیطان اور ہوائے نفس بھی انسان کے ذہن کو آلودہ کرنے اور اخلاص کی بجائے اعمال کو ریا کاری کی آلائشات سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریا کاری اور آلودگی نیت کے بعض درجات تو اس قدر واضح اور آشکار ہوتے ہیں کہ ہر انسان انہیں پہچان سکتا ہے،مثلاً

شیطان کسی نمازی سے یہ کہے کہ نماز آہستہ آہستہ اور خشوع وخضوع سے پڑھ تا کہ حاضرین تجھے ایک صالح مومن سمجھیں اور کبھی تیری غیبت اور بدگوئی نہ کریں۔ یہ نہایت ہی واضح شیطانی فریب ہے۔

بعض اوقات یہ شیطانی وسوسہ نسبتاً پوشیدہ شکل میں ہوتا ہے اور اطاعت کی صورت میں سامنے آتا ہے، مثلاً وہ انسان سے کہتا ہے کہ تم ایک نمایاں اور ممتاز شخصیت ہو۔ اگر تم اپنی نماز اور دیگر اعمال کو خوبصورت اور پر کشش بنا لو تو لوگ تمہارے پیچھے نماز پڑھنے لگیں گے۔ اس طرح تم ان کے ثواب میں بھی شریک ہو جاؤ گے۔ انسان آسانی سے اس وسوسے کا شکار ہو کر ریاکاری کے ہولناک گڑھے میں جا گرتا ہے۔

بعض اوقات شیطان کا وسوسہ اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ شیطان کسی نماز گزار سے یہ کہے کہ مخلص انسان وہ ہوتا ہے جو خلوت اور جلوت میں ایک جیسا ہے، جس کی عبادت خلوت میں کم اور جلوت میں زیادہ ہو، وہ ریاکار ہوتا ہے۔ اس طرح شیطان اسے اس بات پر اکساتا ہے کہ خلوت میں بھی اچھی طرح نماز پڑھے تا کہ جلوت میں اچھی طرح نماز پڑھے تو ریاکاری شمار نہ ہو اور اپنے مقاصد بھی حاصل کر سکے۔ یہ ایک انتہائی خفیہ ریاکاری ہے اور ممکن ہے کہ زیادہ تر لوگ اس سے غافل رہیں۔ اسی طرح اس سے زیادہ خفیہ اور مرموز قسم کی ریاکاری بھی ممکن ہے۔ (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۳۳)

سچ تو یہ ہے کہ اخلاص کے موانع اس قدر زیادہ، پیچیدہ اور مخفی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے پاس پناہ لئے بغیر ان سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

احادیث میں بھی اخلاص کے موانع کے بارے میں جس انداز سے خبردار کیا گیا ہے، وہ بہت اہم اور قابل ذکر ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

کیف یستطیع الاخلاص من یغلبه الھوی

"جس کی ہوائے نفس اس پر غالب ہو، وہ کیسے اخلاص پر قادر ہوسکتا ہے!" (غرر الحکم، ۲: ۵۵۳)

اس حدیث میں اخلاص کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائے نفس اخلاص تک لے جانے والے راستوں کو تاریکیوں سے پر کر دیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قلل الامال تخلص لك الاعمال

یعنی "اپنی آرزوؤں کو چھوٹا کر دو، تمہارے اعمال میں اخلاص پیدا ہو جائے گا۔" (غرر الحکم: ۲۹۰۶)

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات انسان شیطان کے عجیب وغریب اور فریب کارانہ وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے، مثلاً شیطان اسے کہتا ہے کہ نمازِ جماعت میں شرکت نہ کرو کیونکہ ممکن ہے لوگوں کے سامنے عبادت کرنے سے تمہاری نیت ریاکاری سے آلودہ نہ ہو جائے۔ لہٰذا گھر پر ہی نماز پڑھا کرو اور اگر کبھی لوگوں کے سامنے نماز پڑھنی پڑھے تو اس میں سے مستحب اعمال کو ساقط کر دو

اور نماز کو جلدی جلدی ادا کرو تا کہ ریا کاری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اسی طرز فکر کی وجہ سے مستحب اعمال مؤکدہ بھی ترک کر دیتے ہیں۔

شاید اسی وجہ سے قرآن مجید پوشیدہ اور آشکارا انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾

''وہ اپنے اموال رات میں اور دن کو پوشیدہ و اعلانیہ انفاق کرتے ہیں۔ ان کا اجران کے رب کے ہاں ہے اور ان پر کوئی خوف اور حزن نہ ہوگا۔'' (بقرہ: ۲۷۴)

ایک اور نکتہ کا ذکر کر کے ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ تنہائی اور خلوت میں اخلاص کا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان لوگوں کے درمیان کھلم کھلا اپنے اعمال کو اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اخلاص کے آثار

چونکہ اخلاص انسان کے قلب و روح میں پیدا ہونے والا گراں بہا ترین موتی ہے، لہٰذا اس کے آثار و نتائج بھی انتہائی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں احادیث میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ایک بہت مشہور معروف حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ما اخلص عبد للہ عزوجل اربعین صباحا الا جرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ

''کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو چالیس روز اللہ کیلئے خالص گزارے مگر یہ کہ حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔'' (عیون الاخبار الرضا، ۲:۶۹۔ بحار الانوار: ۶۷:۲۴۲)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

عند تحقق الاخلاص تستنیر البصائر

''حصولِ اخلاص پر انسان کی بصیرت نورانی ہو جاتی ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۴۹۲)

آپؑ ہی سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص النیات نجاح الامور

''کاموں کی کامیابی نیتوں کے اخلاص پر مضمر ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۱۴)

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ نیت جس قدر پاکیزہ ہو، انسان اسی قدر کاموں کے باطن پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ بعبارتِ دیگر، اس صورت میں امور کی پختگی اعلیٰ ترین حدوں پر ہوتی ہے۔ اسی لئے کاموں کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی نیت ریا سے آلودہ ہو تو وہ باطن سے زیادہ ظاہر پر توجہ دیتا ہے جس کے نتیجہ میں کاموں میں کھوکھلا پن پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ناکامی سے دوچار ہوجاتے ہیں۔

اسی لئے ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو خلصت النیات لزکت الاعمال

''اگر نیتیں خالص ہوجائیں تو اعمال پاک ہوجاتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲:۶۳)

ریا کاری

ریا کاری اخلاص کا نکتہ مخالف ہے۔ آیات و احادیث میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے اعمال کے باطل ہونے کا سبب اور منافقین کی نشانی اور شرک کی اقسام میں سے ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔

ریا کاری فضائل اخلاق کو تباہ کردیتی ہے اور رذائل اخلاق کے بیج انسان کے قلب و جان میں بکھیر دیتی ہے۔ ریا کاری اعمال کو کھوکھلا کردیتی ہے اور انسان کو اعمال کے باطن پر توجہ دینے سے روک دیتی ہے۔ ریا کاری انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اس مختصر اشارے کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں ریا کاروں کے چہرے اور ان کے اعمال کے نتائج پر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنے مال میں سے انفاق کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے عمل کی مثال پتھر جیسی ہے جس پر مٹی (کی معمولی سی تہہ) ہے (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں) اور اس پر بارش پڑے تو سب کچھ صاف ہوجائے۔ وہ اپنے اعمال کا کچھ نتیجہ حاصل

نہیں کرتے اور اللہ ان کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (بقرہ: ۲۶۴)

۲۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

"جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔" (کہف: ۱۱۰)

۳۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

"منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ انہیں دھوکا دیتا ہے، جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ ریا کاری کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔" (نسا: ۱۴۲)

۴۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

"اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خود خواہی اور خود نمائی کی خاطر اپنے گھروں سے نکلے۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اس پر محیط ہے۔" (انفال: ۴۷)

۵۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿۶﴾ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾

"ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ جو ریا کرتے ہیں اور ضروریاتِ زندگی استعمال کیلئے نہیں دیتے۔" (ماعون: ۴،۷)

تفسیر

پہلی آیت میں احسان جتلانے والے، اذیت پہنچانے والے اور ریا کاری کرنے والے ایک ہی زمرے میں شمار کئے گئے ہیں اور ان سب کو صدقات کی بربادی کا سبب قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسا شخص اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس لئے کہ ایسے افراد کو ان لوگوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے:

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

آیت کے ذیل میں ایک بہت دلنشین مثال کے ذریعے ایسے افراد کی حالت کو بیان کیا گیا ہے:

’’ان کے اعمال کی مثال ایک پتھر جیسی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہہ ہو (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں)، اس پر زوردار بارش آئے (اور ساری مٹی اور بیجوں کو بہا کر لے جائے) اور صاف پتھر باقی رہ جائے۔‘‘

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

یقیناً ایسے افراد کو ان کے کاموں کا کوئی نتیجہ نہیں ملتا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴

اس آیت میں ایک لطیف اشارے کے ذریعے ریا کاروں کو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے کا فرقرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے اعمال کو کھوکھلا اور بے بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اپنے اعمال کی تخم ریزی ریا کی کھیتی میں کی، جس میں نشوونما کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وہ خود ایک پتھر کی مانند ہیں جس پر مٹی کی ہلکی سی تہہ موجود رہے اور وہ کسی بیج کی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بے شک ان کے دل پتھروں کی مانند ہیں اور ان کی روح پر کسی اچھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال بغیر جڑوں کے درخت کی مانند اور ان کی نیتیں آلودہ ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس آیت کے بعد اگلی آیت میں خالصین اور مخلصین کے اعمال کو سرسبز اور پر برکت باغوں سے تشبیہ دی گئی ہے جن میں اچھے بیج اور پودے لگائے گئے، مناسب بارش، دھوپ اور ہوا سے ان کی پرورش کی گئی اور اس میں بکثرت پھل پیدا ہوئے۔

دوسری آیت میں رسولؐ اللہ کو مخاطب کر کے حکم دیا جا رہا ہے کہ خالص توحید کو اسلام کی بنیاد اور اساس کی حیثیت سے لوگوں سے متعارف کروائیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

’’اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں تم جیسا انسان ہی ہوں، (مجھ میں اور تم میں صرف اس بات کا فرق ہے) کہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمہارا معبود صرف ایک ہے۔‘‘ (کہف: ۱۱۰)

اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال ہر لحاظ سے خالص ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰

’’جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔‘‘

اس آیت کی رو سے عبادت میں شرک کرنا بھی توحید کی بنیادوں کو تباہ کر دیتا ہے اور عقیدۂ آخرت کی بھی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر جنت میں داخل ہونے کا اجازت نامہ عمل خالص ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ جندب بن زہیر نامی ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنے اعمال اللہ کیلئے انجام دیتا ہوں اور میرا مقصد اس کی رضا کا حصول ہے لیکن جب لوگوں کو میرے اچھے کاموں کا علم ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

رسولؐ اللہ نے اس کی بات سن کر فرمایا:

ان اللہ طیب ولا یقبل الا الطیب ولا یقبل ما شورك فیه

''اللہ تعالیٰ طیب ہے اور اعمال طیب کو ہی قبول کرتا ہے، جس عمل میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (تفسیر قرطبی، ۶:۴۱۰۸)

اسی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں ایک اور واقعہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کو پسند کرتا ہوں مگر میری یہ خواہش ہے کہ لوگ بحیثیت مجاہد میرے مقام کو جانیں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

اس قسم کے اور بھی واقعات اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان کئے گئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان اعمال کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں اللہ کی خوشنودی کے علاوہ دیگر اہداف بھی پیش نظر تھے۔ اس آیت میں ریا کار کو ایسا مشرک قرار دیا گیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من صلی یرائی فقد اشرك و من صام یرائی فقد اشرك و من تصدق یرائی فقد اشرك ثم قرء فمن کان یرجو القاء ربه.........

''جس نے نماز پڑھی اور ریا کیا، اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا اور ریا کیا، اس نے شرک کیا۔

پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

(المیزان ۱۳: ۴۰۷ بحوالہ در المنثور)

تیسری آیت میں ریا کو منافقین کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں

جبکہ اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے۔ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کا نام ہے جبکہ ریا کاری بھی ظاہر و باطن کا اختلاف ہوتی ہے، اس لئے کہ عمل ظاہراً الٰہی ہوتا ہے لیکن اس کا باطن شیطانی اور ریا کارانہ ہوتا ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ریا کاری کو منافقین کا عمل کہنا بالکل سیدھی سی بات ہے۔

چوتھی آیت میں ریا کار کے اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان سے محروم شیطان کے ساتھی کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنا مال نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کا ساتھی اور ہم نشین ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا ساتھی بہت برا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿٣٨﴾

اس آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کفار جیسا طرزِ عمل اپنانے سے منع فرما رہا ہے "جو خود پرستی اور خود نمائی کے جذبے سے جنگ کیلئے گھروں سے نکلے۔ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اللہ ان کے اعمال پر محیط ہے۔"

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾

آیت کے اندرونی قرائن اور مفسرین کے بیانات کے مطابق یہ آیت قریش کے سپاہیوں کے بارے میں ہے جو جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کیلئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ مکہ سے نکلتے وقت لہو ولعب کے آلات، گانا گانے والے اور شراب بھی ساتھ لئے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے خود پرستی اور خود نمائی اس قدر واضح تھی کہ اگر وہ بت پرستی کا دعویٰ کرتے تھے تو وہ ریا کارانہ تھا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ چونکہ بدر عربوں کے تجارتی میلے کی جگہ تھی اور مشرکین سال کے دوران جب بھی وہاں جاتے تو ان کی، خاص طور پر ابوجہل کی، کوشش ہوتی کہ عیاشی کا سامان اپنے ساتھ لے جائے تاکہ وہاں اپنے جاننے والوں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار کر سکے۔

بہرصورت قرآن شریف مسلمانوں کو ایسے کاموں سے منع فرما رہا ہے اور انہیں حکم دے رہا ہے کہ تقویٰ اور اخلاص کو اپنا کر

اپنی تمام مشکلات پر غلبہ حاصل کریں اور میدانِ بدر میں ریا کاروں اور خود پرستوں کا جو انجام ہوا، اس سے عبرت حاصل کریں۔

آخری آیت میں بھی ایک اور انداز سے ریا کاری کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو ریا کرتے ہیں اور استعمال کی چیزیں لوگوں کو نہیں دیتے۔''

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۝

قرآن مجید میں ''ویل'' کا لفظ ۲۷ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ خطرناک اور سنگین گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ ریا کاروں کیلئے اس لفظ کا استعمال ریا کاری کے گناہ کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کس قدر قبیح اور گھناؤنا گناہ ہے اور انسان کی سعادت کی راہ میں سنگین خطرات کا باعث ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کاری تہذیب نفس اور تطہیر قلب وروح کیلئے ایک اہم رکاوٹ ہے اور اس کا نقطۂ مقابل اخلاص اور پاکیزگی قلب ہے۔

ریا احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ریا کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے خطرناک ترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخوف ما اخاف عليكم الريا و الشهوة الخفية

''سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں، ریا کاری اور خفیہ شہوت ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶: ۱۴۱)

ظاہراً خفیہ شہوت سے مراد ریا کاری کے مخفی محرکات ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

ادنى الرياء شرك

یعنی ''ریا کا ادنیٰ ترین درجہ بھی شرک ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶: ۱۴۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؐ ہی سے مروی ہے:

لا یقبل الله عملا فیه مقدار ذرة من ریاء

''جس عمل میں ذرہ بھر ریا ہو، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۴۔ آنحضرتؐ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ان المرائی ینادی علیه یوم القیامة فاجر یا غادر یامرائی ضل عملك و حبط اجرك اذهب فخذ اجرك ممن کنت تعمل له (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

''قیامت کے دن ریا کار کو آواز دی جائے گی: اے فاجر! اے فریب کار! اے ریاکار! تیرے اعمال کھو گئے۔ تیرا اجر برباد ہو گیا۔ جا! اپنے اعمال کا اجر انہیں سے لے جن کیلئے تو نے عمل کیا تھا۔''

۵۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ کو روتے ہوئے دیکھا، عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپ کیوں گریہ کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

انی تخوفت علی امتی الشرك. اما انهم لایعبدون صنما ولا شمسا ولاقمر او لاحجرا، ولکنهم یراؤن باعمالهم

''میں اپنی امت کے بارے میں شرک سے خائف ہوں۔ وہ کسی بت، سورج، چاند یا پتھر کو نہیں پوجیں گے لیکن اپنے اعمال میں ریاکاری کریں گے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۶۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

ان الملك لیصعد بعمل العبد مبتهجا به فاذا صعد بحسناته یقول الله عزوجل اجعلوها فی سجین انه لیس ایای ارادبها

''فرشتہ کسی شخص کے عمل کو خوشی کے ساتھ اوپر لے جاتا ہے، جب وہ اس کی نیکیاں لے کر اوپر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انہیں جہنم میں ڈال دو، اس نے یہ اعمال میرے لئے انجام نہیں دیئے۔''

۷۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

یقول الله سبحانه انی اغنی الشرکاء فمن عمل عملا ثم اشرك فیه غیری فانا منه بریء وهو للذی اشرك به دونی

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرکاء سے بے نیاز ہوں۔ جو کوئی کسی عمل کو انجام دے اور میرے سوا کسی اور کو اس میں شریک کرے، میں اس عمل سے بیزار ہوں اور یہ عمل اس کیلئے ہے جسے شریک قرار دیا گیا

ہے۔" (میزان الحکمہ، ۲:۱۰۱۷)

رسولؐ اللہ سے مروی یہ سات احادیث، جو انتہائی بامعنی اور جھنجھوڑ دینے والی ہیں، اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آثار ونتائج، جو فرد، معاشرے، جسم اور روح پر مرتب ہوتے ہیں، بہت ہی برے ہیں۔

آئمہ معصومین سے بھی اس سلسلہ میں ہلا دینے والی روایات موجود ہیں:

۸۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

سیاتی علی الناس زمان تخبث فیہ سرائرھم وتحسن فیہ علانیتھم خوف یعمھم اللہ بعقاب فیدعونہ دعاء الغریق فلایستجیب لھم

"لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب ان کا ظاہر حسین اور باطن آلودہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ دنیا کی طمع میں گرفتار ہو جائیں گے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی خواہش نہیں کریں گے۔ ان کا دین ریاکاری ہوگا، ان کے دلوں میں خوفِ خدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب پھیلا دے گا، پھر وہ اسے اس طرح پکاریں گے جیسے ڈوبنے والا پکارتا ہے لیکن ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔" (اصولِ کافی، ۲:۲۹۵)

۹۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ریاء شرک انہ من عمل للناس کان ثوابہ علی الناس ومن عمل للہ کان ثوابہ علی اللہ

"ہر ریا شرک ہے۔ جو شخص لوگوں کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی لوگوں کے ذمہ ہے۔ جو شخص اللہ کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی اللہ کے ذمہ ہے۔" (اصولِ کافی ۲:۲۹۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

المرائی ظاھرہ جمیل وباطنہ علیل........

"ریاکار کا ظاہر خوبصورت اور باطن بیمار ہوتا ہے۔" (امالی صدوق: ۳۹۸، غرر الحکم: ۱:۶۰)

اس سلسلہ میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ سے بکثرت احادیث پائی جاتی ہیں۔

ریا کی حرمت کا فلسفہ

شاید ظاہر بین افراد ریا اور اس کے وحشت ناک آثار کے بارے میں یہ احادیث دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائیں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر انسان کا عمل اچھا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی نیت کیا ہو! فرض کریں ایک انسان ہسپتال یا مسجد، سڑک، پل یا کوئی ایسی چیز بنوائے جس سے عوام الناس کو فائدہ ہو تو اس کی نیت جیسی بھی ہو، لوگوں کو اس کے عمل کا فائدہ تو پہنچ رہا ہوتا ہے۔

یہ طرز فکر ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ ہر عمل اپنے اندر دو قسم کے اثرات رکھتا ہے: ایک اثر خود اس کے کام کے انجام دینے والے پر اور دوسرا لوگوں پر۔ ریا کار اپنے ریا کارانہ عمل کے ذریعے اپنے باطن کو ویران کر دیتا ہے اور توحید کے عظیم الشان مقام سے دور ہو کر شرک کی گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔ وہ لوگوں کو عزت کا سبب سمجھنے لگتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے۔ یہ ریا کاری ایک قسم کی بت پرستی ہے جو بہت سی اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ریا کاری کی بنیاد پر انجام پانے والا عمل معاشرے کیلئے بھی نقصان کا سبب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ریا کار شخص، عمل کے باطن اور حقیقت کی بجائے اس کے ظاہر پر توجہ دیتا ہے، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی بہبود کیلئے کیا جانے والا کام لوگوں کیلئے عذاب بن جاتا ہے اور اس سے ناقابل تلافی نقصانات بھی رونما ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں جو معاشرہ ریا کاری کا عادی ہو جاتا ہے، وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کی سیاست، معیشت، ثقافت، دفاع، غرضیکہ ہر چیز کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ ظاہر پر قناعت ہو رہی ہوتی ہے اور کوئی بھی معاشرے کی خیر و سعادت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ہر شخص انہی کاموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جس کا ظاہر خوبصورت ہوتا ہے۔ اس طرز فکر و عمل سے معاشرے کی ساخت پر جو زد پڑتی ہے، وہ کسی عقلمند پر پوشیدہ نہیں ہے۔

ریا کاروں کی علامات

مندرجہ بالا احادیث اور ان جیسے دیگر سخت بیانات پڑھ کر بہت سے لوگ ریا اور ریا کار کی شناخت کے بارے میں وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان ریا کے بارے میں سخت گیری کرے، اس لئے کہ ریا انتہائی پر اسرار طور پر انسان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ممکن ہے انسان سالہا سال تک ایک عمل کو انجام دیتا رہے اور کئی سالوں کے بعد اسے معلوم ہو کہ اس کے عمل کی ساری عمارت ریا کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

لیکن اس کے باوجود انسان کو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے اور افراط و تفریط سے بچنا چاہئے۔ ریا کو اس کی علامات کی روشنی میں سمجھنا اور پہچاننا چاہئے اور خوامخواہ کے وسوسوں سے بچنا چاہئے۔

علمائے اخلاق نے اس سلسلہ میں بہت اچھی مباحث کی ہیں۔ مرحوم فیض کاشانی نے محجۃ البیضاء میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر

کوئی عالم یا واعظ یہ جاننا چاہے کہ وہ اپنے مواعظ میں مخلص ہے، ریا کارنہیں ہے تو کیا کرے؟

پھر وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اس بات کی کئی علامات ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس سے بہتر واعظ، جس کی مقبولیت اور علم بھی زیادہ ہو، معاشرے میں پیدا ہو جائے تو وہ خوش ہو اور حسد کے جذبات اس کے دل میں پیدا نہ ہوں، ہاں! رشک اور چیز ہے کہ وہ اس جیسا یا اس سے بہتر بننے کی آرزو کرے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر معاشرے کی بڑی اور معتبر شخصیات اس کی مجلس میں ہوں تو اس کے بولنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ ان کی توجہ حاصل کرنے کیلئے اس کا انداز نہ بدلے بلکہ سب حاضرین کو ایک نظر سے دیکھے۔

ایک اور نشانی یہ ہے کہ اگر گلی یا بازار میں چلتے وقت اس کے سامعین یا ارادتمندوں کی ایک جماعت اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو تو اس سے اسے خوشی نہ ہو۔ (محجۃ البیضاء،۶:۲۰۰)

ریا کارانہ اور غیر ریا کارانہ اعمال کا فرق جاننے کیلئے بہترین کسوٹی وہی ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

اما علامة المرائی فاربعة: یحرص فی العمل للہ اذا کان عندہ احد ویکسل اذا کان وحدہ ویحرص فی کل امرہ علی المحمدة ویحسن سمته بجھدہ

''ریا کار کی چار علامات ہیں اگر کوئی اس کے پاس موجود ہو تو عمل کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے، جب تنہا ہوتا ہے تو عمل میں سستی کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے ہر کام پر اس کی تعریف کریں اور ہر لحاظ سے اپنے ظاہر کو بہتر بنانے میں لگا رہتا ہے۔'' (تحف العقول:۱۷)

۲۔ ایک اور حدیث میں یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ذرا مختلف انداز میں بیان کی ہے:

للمرائی اربع علامات:
یکسل اذا کان وحدہ وینشط اذا کان فی الناس و یزید فی العمل اذا اثنی علیه وینقص منه اذا لم یثنی علیه (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲:۱۰۸)

''ریا کار کی چار علامات ہیں:
اکیلا ہو تو سستی کے ساتھ عمل کرتا ہے، لوگوں کے درمیان ہو تو نشاط و تازگی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کی تعریف کی جائے تو اس کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے اور تعریف نہ کی جائے تو اس کا عمل کم ہو جاتا ہے۔''

مختصر یہ کہ ہر وہ کام جو لوگوں کی نظر میں زیادہ خوبصورت اور پرکشش بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جائے، اس میں ریا کاری کا جذبہ داخل ہو جانے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہ محرک خواہ کتنا ہی پوشیدہ اور مخفی کیوں نہ ہو، خلوت وجلوت میں عمل کی انجام دہی کی کیفیت کے مختلف ہونے کی مدد سے آشکار ہو جاتا ہے۔

یہ بات اس قدر مرموز اور پراسرار ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے ضمیر کو فریب دینے کیلئے خلوت میں اپنے عمل کو بہتر بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے تاکہ اسے جلوت میں پرکشش بنانے کا جواز حاصل کر سکے۔ اس صورت میں جلوت میں انجام دیئے جانے والے عمل کے ساتھ خلوت میں انجام دیا جانے والا عمل بھی ریا سے آلودہ ہو جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے بچنا ضروری ہے۔ اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ ریا کاری سے بچنے کیلئے نمازِ با جماعت اور منبر سے درس یا وعظ کہنا ترک کر دیتے ہیں۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل انجام دے اور لوگوں کو اس کا علم ہونے پر وہ شخص خوش ہو تو اس کے عمل کی صحت اور قربت الٰہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر اس نے ابتداء میں اس کام کو اللہ کیلئے انجام دیا ہو۔ (وسائل الشیعہ ۱:۵۵)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کسی محفل میں یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے کسی کی نیکی کی تشہیر کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ بزرگوں کی سیرت یہ رہی ہے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے عمل کو انجام دینے والے کا اجر بھی ضائع نہیں ہوتا، بشرطیکہ ابتداء میں اس کی نیت خالص ہو۔

قرآنی آیات میں متعدد مقامات پر پوشیدہ اور دکھا کر صدقہ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان لوگوں کو دکھا کر عمل کرے اور اس کا عمل ریا سے محفوظ بھی ہو۔

قرآن مجید کی پانچ آیات میں انفاق کو "سرا و علانیة" یا "سرا وجهرا" انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان دونوں کے معنی ہیں "پوشیدہ وآشکار" (بقرہ: ۲۷۴، رعد: ۲۲، ابراہیم: ۳۱، نحل: ۷۵، فاطر: ۲۹)

بنیادی طور پر بعض اسلامی عبادات کو لوگوں کی موجودگی میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے جیسے نماز جمعہ، حج، نمازِ جنازہ اور جہاد وغیرہ۔ اگر انسان وسوسوں کا شکار ہو جائے تو وہ ان سب کو ترک کر دیتا ہے۔

ریا کا علاج

تمام ناپسندیدہ اعمال واخلاق کے علاج کی طرح ریا کا علاج بھی دو طرح سے کیا جا سکتا ہے:

ایک یہ کہ اس کے اسباب وعوامل کی طرف توجہ کر کے ان کا خاتمہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کے خطرناک منفی نتائج پر غور کیا جائے جو اس برائی سے آلودہ افراد کو پیش آ سکتے ہیں۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ریا کا بنیادی وجہ "شرکِ افعالی" اور "حقیقت توحید سے غفلت" ہے۔ اگر ہمارے اندر توحید افعالی

کی بنیادیں مضبوط ہوں اور ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ عزت، ذلت، رزق اور نعمتیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے دل بھی اس کے اختیار میں ہیں تو ہم کسی طور پر بھی این و آن کی پسند کی خاطر اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ نہیں کریں گے۔

اگر ہمیں یقین ہو کہ جو اللہ کے ساتھ ہے، اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور جو اللہ سے دور ہوتا ہے، اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر اللہ تم کو چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔'' (آل عمران: ۱۶۰)

اسی طرح ہمیں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہئے:

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

''اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرنے والے ان کے پاس عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ہر قسم کی عزت تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔'' (نساء: ۱۳۹)

اگر ان چیزوں پر ایمان ہمارے دل و جان کی گہرائی میں اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے کوئی عمل انجام دے یا ان کی نظر میں عزت اور اعتماد حاصل کرنے کیلئے اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ کرلے۔

بعض علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ ریا کی بنیادی وجہ حب جاہ و مقام ہے۔ اگر اس بات کو کھولا جائے تو تین چیزیں سامنے آتی ہیں: لوگوں کی طرف سے تعریف کی خواہش، لوگوں کی طرف سے مذمت سے فرار اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اس کی طمع۔

اس کے بعد وہ ایسے شخص کی مثال بیان کرتے ہیں جو اس لئے جہاد پر جاتا ہے کہ لوگ اس کی بہادری کی باتیں کریں یا اس لئے جہاد کرتا ہے کہ لوگ اسے بزدل نہ کہیں، یا اس لئے جہاد کرتا ہے تاکہ مال غنیمت حاصل کرسکے۔ صرف وہی شخص اپنے جہاد کا صحیح ثمر حاصل کرسکتا ہے جو اللہ کے دین کی حفاظت اور سربلندی کیلئے دشمنانِ دین سے جنگ کرے۔

دوسری طرف سے اگر انسان ریاکاری کے خطرناک نتائج پر غور کرے کہ ریا ایک ایسی آگ ہے جو انسان کے اعمال کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، صرف اس کی عبادت کو تباہ و برباد نہیں کرتی بلکہ ایسا گناہ بھی ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ریا ایک دیمک ہے جو انسان کی سعادت کے محل کی نبیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ریا ایک قسم کا کفر و نفاق اور شرک ہے۔ ریاکاری انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ہے اور اسے حقیقی آزادی اور احترام سے محروم کر دیتی ہے۔ قیامت کے دن اسے بدبخت ترین انسان بنا دیتی ہے۔

اگر ان باتوں کی طرف توجہ کی جائے تو ان کا مثبت اثر ضرور ظاہر ہوگا اور ریاکار ریا سے رک جائے گا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ریا سے آلودہ نیتوں کو زیادہ عرصہ تک چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ ریا کاروں کی قلعی عام طور پر اسی دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہ ذلیل ورسوا ہو جاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے ریا کی آلودگی ظاہر ہوتی رہتی ہے جس سے لوگوں کی نظروں سے ان کی عزت جاتی رہتی ہے۔ اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنے سے بھی انسان ریا سے رک سکتا ہے۔

خالص عمل سے انسان کو جو روحانی اور معنوی لذت حاصل ہوتی ہے، اس کا موازنہ کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات نیت کو خالص بنانے کیلئے کافی ہے۔

بعض علمائے اخلاق نے کہا ہے کہ ریا کے علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی عبادات اور نیکیوں کو پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کرے تاکہ آہستہ آہستہ یہ بات ایک پختہ عادت بن جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ جمعہ، جماعت، حج اور دیگر اجتماعی عبادات میں شرکت سے گریز کرنے لگے کیونکہ یہ بھی ایک بہت بڑا نقصان ہے۔

کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کسی عبادت کو اچھی طرح سے انجام دینے کے بعد سرور اور نشاط محسوس کرے تو کیا یہ ریاکاری کی علامت نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس سرور و نشاط کا سبب اللہ کی دی ہوئی توفیق عمل اور عمل سے حاصل ہونے والی نورانیت اور روحانیت ہو تو یہ اخلاصِ نیت کے منافی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس نشاط کی وجہ یہ ہو کہ لوگوں نے اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ خلوص کے منافی ہے۔ اگرچہ اس سے عمل باطل نہیں ہوتا، بشرطیکہ لوگوں کے مشاہدہ کی وجہ سے وہ اپنے عمل کی مقدار اور معیار میں تبدیلی نہ لائے۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ان کے ایک صحابی نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص کوئی عمل انجام دے رہا ہو اور کوئی دوسرا اسے دیکھ رہا ہو جس سے عمل کرنے والے کو خوشی ہو تو کیا یہ خلوص نیت کے خلاف ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

لا بأس، ما من احد الا وهو يحب ان يظهر له في الناس الخير اذا لم يكن صنع ذلك لذلك!

''کوئی حرج نہیں ہے، ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عمل خیر لوگوں میں معروف ہو (اور لوگ اسے ایک نیک آدمی کے طور پر پہچانیں) بشرطیکہ عمل کو انجام دینے کا مقصد یہ نہ ہو۔''

(وسائل الشیعہ، ۱:۵۵)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس سے ملتا جلتا سوال رسول اللہؐ سے کیا کہ اگر کوئی انسان کوئی عمل

قربِ الٰہی کے حصول کی نیت سے انجام دے اور لوگ اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے اچھا سمجھنے لگیں تو یہ کیسا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

تلك عاجل بشری المومن

''یہ ایک بشارت ہے جو اللہ اس دنیا میں مومن کو دیتا ہے۔''

ریا اور سمعہ کا فرق

یہاں ایک اور سوال رونما ہوتا ہے کہ ریا اور سمعہ میں کیا فرق ہے؟ آیا یہ دونوں خلوص نیت کے خلاف اور بطلانِ عمل کا موجب ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ریا یہ ہے کہ انسان کسی عمل کو اس طرح انجام دے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس طرح لوگوں کی نظر میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ لیکن سمعہ یہ ہے کہ انسان اپنا عمل تو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ انجام دے تا کہ بعد میں اسے لوگوں کو سنا سکے اور معاشرے میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ ان دونوں اعمال کا محرک غیر الٰہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریا میں عمل لوگوں کو دکھایا جاتا ہے اور سمعہ میں عمل لوگوں کو سنایا جاتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں عمل باطل ہوتا ہے۔

لیکن اگر سمعہ کی تشریح اس طرح کی جائے کہ انسان کسی عمل کو قصد قربت الٰہی کی نیت سے انجام دیتا ہے، بعد میں جب لوگ اس کے اس عمل کے بارے میں سنتے ہیں تو اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس حالت میں یقیناً عمل باطل نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی عمل کو مقصد قربت سے انجام دے اور بعد میں یہ سوچنے لگے کہ اپنے عمل کا چرچا کر کے شہرت اور عزت حاصل کرے (اس عمل کو ریا بعد از عمل کہتے ہیں)، تو اس سے عمل تو باطل نہیں ہوتا لیکن اس کی قدر و قیمت ضرور کم ہو جاتی ہے اور یہ اخلاقی انحطاط کا سبب بھی بنتا ہے۔

بعض فقہائے بزرگ نے انسان کے عمل میں ریا کاری کے داخل ہونے کی دس صورتیں بیان کی ہیں:

۱۔ اس کے عمل کا مقصد اور نیت ہی یہ ہو کہ عمل لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا جائے۔ ایسی صورت میں عمل یقیناً باطل ہوگا۔

۲۔ اس کے عمل کا مقصد قربِ الٰہی بھی ہو اور ریا کاری بھی۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۳۔ اعمال کے بعض اجزا کو مثلاً نماز میں رکوع یا سجدے کو ریا کاری کیلئے انجام دے۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے، اگر چہ اس جزو کے تدارک کی فرصت ابھی باقی ہو۔ اسی لئے بعض فقہاء نے نماز کے دوران ریا کو نماز کے دوران وضو ٹوٹ جانے سے تشبیہ دی ہے۔ اگر چہ اس میں احتیاط یہ ہے کہ ریا زدہ جزو کو دوبارہ انجام دیا جائے اور بعد میں نماز کو دوبارہ پڑھا جائے۔

۴۔ کسی مستحب جزو مثلاً دعائے قنوت وغیرہ میں ریا کرنا۔ اس کو بھی بطلانِ عمل قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا گیا ہو لیکن ایسی جگہ یا مسجد وغیرہ میں انجام دیا گیا ہو جس کا محرک الٰہی نہ ہو۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۶۔ عمل اللہ کیلئے ہو لیکن ایسے وقت میں انجام دیا جائے جس کا محرک الٰہی نہ ہو، مثلاً کوئی شخص اول وقت میں نماز ادا کرتا ہے، نماز تو اللہ کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اول وقت کے معاملہ میں ریا کرتا ہے۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۷۔ عمل کی بعض خصوصیات میں ریا کاری کرنا مثلاً کوئی شخص نماز تو اللہ ہی کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اس کے خشوع اور خضوع کی کیفیت میں ریا کاری کرتا ہے۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے کیونکہ یہ صفات عمل سے جدا نہیں ہیں۔

۸۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اس کے بعض مقدمات میں ریا کاری کی جائے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص مسجد میں اللہ کی خوشنودی کیلئے نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے مسجد کی طرف جانے میں ریا کاری پائی جاتی ہے۔ اکثر فقہاء اس ریا کو عمل کے باطل ہونے کا سبب نہیں سمجھتے اور فقہی قاعدے کا بھی یہی تقاضا ہے۔

۹۔ عمل کی بجائے عمل کے بعض بیرونی اوصاف میں ریا کرنا، مثلاً یہ کہ انسان نماز اللہ کیلئے ادا کرے لیکن عمامہ باندھنے وغیرہ میں ریا کاری کرے۔ یہ عمل اگرچہ مذموم ہے لیکن اس سے اصل عمل باطل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ عمل اصل میں اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اگر لوگ دیکھ رہے ہوں تو اس سے عمل انجام دینے والے کو خوشی ہو مگر اس سے عمل کی کیفیت اور کمیت پر کوئی فرق نہ پڑے، اس سے بھی عمل باطل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں یہ ریا ہی نہیں ہے، اس لئے کہ ریا کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کو انجام دینے کا بنیادی مقصد ہی لوگوں کو دکھانا ہو۔

ریا کے بارے میں اس بحث کو ہم یہاں پر ختم کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بارے میں اور بھی مباحث ہیں لیکن طوالت سے پرہیز کی خاطر ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

خاموشی اور اصلاحِ زبان

بہت سی احادیث میں ان دو چیزوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور انہیں غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ علمائے اخلاق کی نظر میں بھی ان دونوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ سالکانِ راہِ حق خاموشی کے بغیر اور زبان کے گناہوں سے اجتناب کے بغیر کوئی پیش رفت نہیں کر سکتے، خواہ مختلف اقسام کی دوسری جسمانی اور روحانی عبادتیں اور ریاضتیں کرتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر تہذیبِ نفس اور سیر الی اللہ کی وادی میں داخل ہونے کی کنجی خاموشی اور اصلاحِ زبان ہیں۔ جو لوگ اس مرحلہ میں ناکام ہو جائیں، وہ اعلیٰ روحانی منازل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس تعارفی اشارے کے بعد ہم قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں۔

جب حضرت مریمؑ دردِ زہ کی تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہی تھیں اور وہ آبادی سے دور ایک خشک بیابان میں تھیں، اس کے

علاوہ بچے کی پیدائش کے بعد لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا خوف ان پر چھایا ہوا تھا، ان کی اس کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں موت کی آرزو کر رہی تھیں۔ اس حالت میں اچانک انہوں نے یہ آواز سنی:

''غمگین نہ ہو، ہم نے تمہارے پاؤں کے نیچے چشمہ جاری کر دیا ہے اور اللہ کے حکم سے کھجور کا خشک درخت پھلدار ہو گیا ہے۔ اس پھل میں سے کھاؤ اور پانی میں سے پیو اور اپنی آنکھیں اس نومولود بچے سے ٹھنڈی کرو۔ جب بھی تم کسی انسان کو دیکھو جو اس بارے میں تم سے وضاحت طلب کرے تو اشارے سے کہہ دو کہ میں نے رحمن کیلئے روزہ رکھا ہوا ہے اور آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔'' (مریم: ۲۳ تا ۲۶)

فَأَجَآءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يَٰلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادَىٰهَا مِن تَحْتِهَآ أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّىٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِى وَاشْرَبِى وَقَرِّى عَيْنًا ۖ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِىٓ إِنِّى نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا ﴿٢٦﴾

اس آیت میں اگرچہ کئی چیزیں غور طلب ہیں لیکن جو بات ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت مریمؑ کو خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ منت کسی ایسی چیز کی ہی مانی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو۔ بنابراین اس آیت میں خاموشی کا روزہ اللہ کا پسندیدہ عمل تھا۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں خاموشی کا روزہ لوگوں کے درمیان ایک جانا پہچانا عمل تھا۔ لہٰذا جب انہوں نے اشارے سے بتایا کہ انہوں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے تو کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔

اسلام میں زمان و مکان کی شرائط مختلف ہونے کی وجہ سے خاموشی کا روزہ حرام ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

وصوم الصمت حرام

یعنی ''خاموشی کا روزہ حرام ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷: ۳۹۰)

یہی بات امیر المومنین علیہ السلام کی نصیحتوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولا صمت یوما الی اللیل

یعنی ''اسلام میں صبح سے رات تک خاموشی کا روزہ نہیں ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷: ۳۹۰)

البتہ اسلام میں مکمل روزے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ انسان روزہ کی حالت میں اپنی زبان کو ان باتوں سے

آلودہ نہ کرے جنہیں گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ روزے کے دوران انسان اپنی آنکھوں اور کانوں کو گناہ سے آلودہ نہ ہونے دے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصوم لیس من الطعام والشراب وحدہ ان مریم قالت انی نذرت للرحمان صوما ای صمتا فاحفظوا السنتکم وغضوا ابصارکم

''روزہ صرف کھانے پینے سے اجتناب کا نام نہیں ہے۔ حضرت مریمؑ نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں نے اللہ کیلئے (خاموشی) کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا جب تم روزے سے ہوتے ہو تو اپنی زبان اور آنکھوں کو گناہ سے محفوظ رکھو۔'' (نور الثقلین، ۳: ۳۳۲)

بہرحال اس آیت اور اس کی تفسیر میں بیان ہونے والی روایت سے خاموشی کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ اس سورۃ کی آیت ۱۰ میں بھی خاموشی کی اہمیت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جب حضرت ذکریاؑ کو بڑھاپے میں اور بیوی کے بانجھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹے (حضرت یحییٰ) کی ولادت کی بشارت دی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی طلب کی۔ انہیں جواب ملا کہ نشانی یہ ہے کہ تمہاری زبان صحیح و سالم ہونے کے باوجود تین دن تک تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے (اور تمہاری زبان صرف دعا اور ذکر خدا کر سکے گی)۔

اس آیت میں اگرچہ خاموشی کی تعریف یا مذمت نہیں کی گئی ہے لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ذکریاؑ کیلئے نشانی قرار دیا جانا ہی یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ خاموشی ایک الٰہی عمل ہے۔ یہی بات سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۱ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت ذکریا علیہ السلام کا لوگوں سے گفتگو نہ کرنا اختیاری عمل تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کی زبان دعا اور ذکر خدا کے علاوہ کوئی بات کرنے کی قدرت ہی نہ رکھتی تھی۔ بالفاظ دیگر حضرت ذکریاؑ کو تین دن کیلئے خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

فخر رازی نے یہ تفسیر ابو مسلم سے نقل کی ہے اور اسے عمدہ اور معقول تفسیر قرار دیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر آیت کے الفاظ کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت ذکریاؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس بشارت کی نشانی طلب کی تھی۔ ظاہر سی بات ہے کہ اختیاری سکوت کو ایسی نشانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہرحال آیت کی تفسیر میں یہ اختلافات ہمارے اس مقصد سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے کہ از روئے قرآن خاموشی ایک پسندیدہ عمل ہے، اس لئے کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی ایک قابل قدر عمل تھا جسے ایک الٰہی نشانی قرار دیا گیا۔

خاموشی،احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ''صمت'' یعنی خاموشی کی اہمیت پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے اوراس کے بارے میں نہایت لطیف و ظریف نکات بیان کئے گئے ہیں۔اس کے نتائج واثرات کوانتہائی دلکش اوردلنشین انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:(بحارالانوار،۷۵:۳۱۲)

اذار ایتم المومن صموتا فادنوا منه فانه یلقی الحکمة و المومن قلیل الکلام کثیر العمل و المنافق کثیر الکلام قلیل العمل

''جب تم کسی مومن کودیکھو کہ وہ زیادہ تر خاموش رہتا ہےتواس کےقریب ہوجاؤ،اس لئے کہ وہ تمہیں علم وحکمت دے گا۔مومن باتیں کم اورعمل زیادہ کرتا ہےجبکہ منافق باتیں زیادہ اورعمل کم کرتا ہے۔''

۲۔ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

دلیل العاقل التفکر و دلیل التفکر الصمت

''عاقل کی علامت غوروفکر ہےاورغوروفکر کی علامت خاموشی ہے۔''(بحارالانوار،۷۵:۳۱۲)

۳۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام کاارشاد ہے:

اکثر صمتك یتوفر فکرك و یستنر قلبك ویسلم الناس من یدك

''اپنی خاموشی کوزیادہ کرو،تمہاری فکرترقی کرے گی اورتمہارےقلب کونورانیت حاصل ہوگی اورلوگ تمہارے ہاتھ سےمحفوظ رہیں گے۔''(میزان الحکمہ،۲:۱۶۶۷)

ان روایات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ فکری ارتقاءاورخاموشی کے درمیان گہراتعلق ہے۔اس کی وجہ بھی ظاہر ہے،اس لئے کہ انسان کی بہت سی فکری صلاحیتیں فضول اوربیہودہ باتوں میں ضائع ہوجاتی ہیں۔جب انسان خاموشی اختیارکرتا ہےتو یہ ساری توانائیاں ایک مرکز پرجمع ہوجاتی ہیں۔فکرمصروف عمل ہوجاتی ہےاورعلم وحکمت کے ابواب انسان کے دل پرکھلتے چلے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں یہ بات معروف ہے کہ زیادہ باتیں کرنا کم عقلی کی نشانی ہے۔

۴۔ روایات سےمعلوم ہوتا ہےکہ خاموشی اہم ترین عبادت ہے۔حضرت ابوذرغفاریؓ کونصیحت کرتے ہوئے فرمایا: (میزان الحکمہ:باب صمت)

اربع لا یصیبهن الا مومن، الصمت وهو اول العبادة............

''چارچیزیں ایسی ہیں جوصرف مومن کوملتی ہیں۔خاموشی جوکہ تمام عبادات کانقطہ آغاز ہے......''

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كان المسيح يقول لا تكثر الكلام في غير ذكر الله فان الذين يكثرون الكلام في غير ذكر الله قاسية ولكن لا يعلمون

''اللہ کے ذکر کے سوا کوئی بات زیادہ نہ کرو، جو لوگ ذکر اللہ کے سوا دوسری باتیں زیادہ کرتے ہیں، ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور انہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۴)

۶۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصمت باب من ابواب الحكمة، ان الصمت يكسب المحبة انه دليل على كل خير

''خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ خاموشی حصولِ محبت کا باعث ہوتی ہے اور ہر بھلائی کی راہ دکھاتی ہے۔'' (اصولِ کافی: ۲: ۱۱۳)

خاموشی کے حصولِ محبت کا ذریعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی رنجشیں اور عداوتیں زبان کے بے جا استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ خاموشی اختیار کرنے سے انسان ان قباحتوں سے بچ جاتا ہے۔

۷۔ خاموشی بہت سے گناہوں سے نجات کا ذریعہ اور جنت میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا:

''کیا تجھے ایک ایسی بات بتاؤں جس کے ذریعے اللہ تجھے جنت میں داخل کر دے گا؟''

اس نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! فرمائیے!''

رسولؐ اللہ نے اسے انفاق اور مشورے کے ذریعے دوستوں کی مدد کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا:

فاصمت لسانك الا من خير

''خیر کے علاوہ اپنی زبان بند رکھو۔'' (اصول کافی: ۲: ۱۱۳)

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اگر ان صفات میں سے ایک صفت بھی تم میں پیدا ہو جائے تو وہ تمہیں جنت میں لے جائے گی۔''

۸۔ خاموشی کے نتائج میں سے ایک مثبت نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی شخصیت کو باوقار بناتی ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین

علیہ السلام فرماتے ہیں:

الصمت يكسيك الوقار، ويكفيك مونة الاعتذار

’’خاموشی تمہیں وقار کا لباس پہناتی ہے اور تمہیں معذرت خواہی سے بچاتی ہے۔‘‘ (غرر الحکم: ۱۸۲۷)

جو شخص زیادہ باتیں کرتا ہے، وہ غلطیاں بھی زیادہ کرتا ہے۔ اس سے اس کے وقار میں بھی کمی ہوتی ہے اور اسے بار بار معذرت خواہی کرنا پڑتی ہے۔

۹۔ یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں زیادہ موثر انداز میں بیان فرمائی ہے:

ان كان فى الكلام بلاغة ففى الصمت السلامة من العثار

’’اگر بات کرنے میں بلاغت ہے تو خاموشی میں سلامتی ہے۔‘‘ (غرر الحکم، حکمت: ۳۷۱۴)

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات خاموشی کلام بلیغ سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ہم امام حسن علیہ السلام کی اس حدیث کو بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں: (میزان الحکمہ، باب صمت، حدیث: ۱۰۸۲۶)

نعم العون الصمت فى مواطن كثيرة وان كنت فصيحا

’’اکثر مقامات پر خاموشی اچھی مددگار ہوتی ہے، خواہ تم بات کرنے میں فصیح ہو۔‘‘

ایک غلط فہمی کا ازالہ

خاموشی کے مندرجہ بالا فوائد اور مثبت نتائج کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ بات کرنا ہر مقام پر مذموم ہے اور یہ کہ انسان کو مکمل طور پر اپنے ہونٹ سی لینے چاہئیں، اس لئے کہ بذاتِ خود یہ ایک بڑی آفت ہے۔

احادیث میں خاموشی کی تعریف کرنے کا مقصد بیہودہ اور غیر ضروری گفتگو کی حوصلہ شکنی کرنا ہے ورنہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بعض مواقع پر بات کرنا واجب اور خاموشی اختیار کرنا حرام ہے۔

یہ بات یہاں سے بخوبی واضح وعیاں ہو جاتی ہے کہ سورۂ رحمن میں ’’بیان‘‘ کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور قدرتِ کلام و سخن انسان کی ایک امتیازی خصوصیت اور انسان کا ایک بڑا اعزاز ہے۔

بہت سی عبادات، جیسا کہ نماز، حج کے بعض اعمال و تلاوتِ قرآن اور ذکر الٰہی، زبان کے ذریعے ہی انجام دی جاتی ہیں۔

امر بالمعروف و نہی از منکر، علوم اسلامی و دیگر علوم واجب کی تعلیم، جاہلوں کی رہنمائی، غافلوں کو متنبہ کرنا، حق و عدالت کی طرف رہنمائی اور اس قسم کے دیگر فرائض اور کارہائے خیر صرف زبان کے ذریعے ہی انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان مواقع پر خاموش رہنا چاہئے۔ جو چیز انسان کی بدبختی کا سبب بنتی ہے، اسے قرب الٰہی کے سفر سے روک دیتی ہے اور تزکیہ نفس و تہذیب

اخلاق کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ ''فضول گفتگو'' ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں انسان اعتدال کی راہ اختیار کرے اور ہر قسم کے افراط تفریط سے محفوظ رہے۔

اس سلسلہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی حقیقت کو مکمل طور پر آشکار کر دیتا ہے:

ایک شخص انؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''یا بن رسولؐ اللہ! کلام افضل ہے یا سکوت؟''

آپؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

لکل واحد منهما آفات فاذا سلما من الافات فالکلام افضل من السکوت، قیل کیف ذلك یابن رسول الله قال: لان الله عزوجل مابعث الانبیاء والاوصیاء بالسکوت، انما بعثهم بالکلام، ولا استحقت الجنة بالسکوت ولا استوجبت ولایة بالسکوت ولا توقیت النار بالسکوت انما ذلك کلة بالکلام، ما کنت لاعدل القمر بالشمس انك تصف فضل السکوت بالکلام و لست تصف فضل الکلام بالسکوت

''ان دونوں میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی آفات ہیں۔ جب یہ دونوں آفات سے خالی ہوں تو بات کرنا خاموشی سے افضل ہے۔ اس شخص نے کہا: یا بن رسولؐ اللہ! کیسے؟ آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اوصیاء کو خاموشی کے ساتھ نہیں بل کہ کلام کے ساتھ معبوث فرمایا۔ خاموشی کے ذریعے جنت ہاتھ نہیں آ سکتی، خاموشی کے ذریعے انسان ولایت الٰہی کے درجہ پر فائز نہیں ہوسکتا، خاموشی کے ذریعے انسان جہنم سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ سب چیزیں کلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ میں ہرگز چاند اور سورج کو برابر قرار نہیں دیتا، یہاں تک کہ خاموشی کی فضیلت بھی کلام کے ذریعے ہی بیان کی جا سکتی ہے جبکہ کلام کی فضیلت کو کبھی خاموشی کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

(بحار الانوار ۶۸: ۲۷۴)

بلاشبہ کلام اور سکوت میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام اور موقع ہوتا ہے اور ہر ایک میں مثبت اور منفی پہلو پائے جاتے ہیں۔ کلام کے مثبت پہلو اس کے منفی پہلوؤں سے زیادہ ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے مثبت پہلو اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب انسان کافی حد تک تہذیب نفس کے مراحل طے کر چکا ہو، اس لئے آغازِ سیر وسلوک پر خاموشی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب سالک خواہشاتِ نفس پر غلبہ پالے اور اپنی زبان پر مسلط ہوجائے تو پھر اسے کلام کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

ہم اس بات کواس پیمانے پربھی پرکھ سکتے ہیں کہ اگر ہم ایک شب وروز میں کی جانے والی گفتگوکو ریکارڈ یا محفوظ کرلیں اور بعد میں ایمانداری کے ساتھ غور سے اسے سنیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کا بہت کم حصہ الٰہی مقاصد یا زندگی کی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی ساری گفتگو فضول ہوتی ہے جس میں ناروا اور گناہ سے آلودہ باتیں بھی کافی ہوتی ہیں یا کم ازکم مشکوک اور مشتبہ ضرور ہوتی ہیں۔

خاموشی کا مقصد غیر ضروری اور بے مقصد گفتگو اور گناہ آلود گفتگو کا سدباب کرنا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ لغت میں اگرچہ ''سکوت'' اور''صمت'' کے ایک ہی معنی بیان کئے گئے ہیں لیکن علمائے علم اخلاق نے ان دونوں کے درمیان فرق روا رکھا ہے۔ان کے مطابق ''سکوت'' سے مراد یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر گفتگو کو ترک کردے جبکہ ''صمت'' کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو کو ترک کیا جائے۔ سالکانِ راہِ خدا کیلئے اور تہذیب اخلاق وتزکیہ نفس کے لیے جو چیز ضروری ہے، وہ سکوت نہیں بلکہ صمت ہے۔

اصلاحِ زبان

سکوت وصمت کی اہمیت اور تزکیہ نفس پر اس کے مثبت آثار ونتائج کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ آفاتِ زبان کے سدباب کا ایک بنیادی طریقہ ہے، اس لئے کہ زبان علم وثقافت اور عقیدہ واخلاق کی کلید ہے۔ زبان کی اصلاح ان سب کی اصلاح اور زبان کا فساد ان سب کے فساد کا سبب ہے۔ بنابریں اصلاحِ زبان کی بحث، خاموشی کی بحث سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اخلاقی مباحث میں اصلاحِ زبان کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان اور عقل کی نمائندہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کی شخصیت کی کلید اور اس کی روح کا دریچہ ہوتی ہے۔

بالفاظِ دیگر جو چیز بھی انسان کے قلب وجان پر نقش ہوتی ہے، سب سے پہلے اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ماضی میں اطباء کسی شخص کی صحت وبیماری کو جاننے کے لیے بھی اس کی زبان کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس دور میں جبکہ لیبارٹری میں کئے جانے والے ٹیسٹ، ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولتیں موجود نہ تھیں، اطباء کسی شخص کی زبان پر نظر ڈال کر اس کی بیماری اور صحت کی ساری کیفیت کا مطالعہ کر لیتے تھے۔

یہی بات فکری اور اخلاقی امور پر بھی صادق آتی ہے۔ انسان کی زبان سے انسان کی اخلاقی اور فکری حالت بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر علمائے علم اخلاق، اصلاحِ زبان کیلئے غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں اور فضائل اخلاقی کی تقویت اور روحانی کمالات کے حصول کیلئے اسے ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے حکیمانہ ارشادات میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

تکلموا تعرفوا فان المرء مخبوء تحت لسانہ (نھج البلاغہ، کلمات قصار:۳۹۲)

"بات کروتا کہ پہچانے جاؤ، اس لئے کہ انسان کی شخصیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبه، ولا یستقیم قلبه حتی یستقیم لسانه

"کسی شخص کا ایمان درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا قلب درست نہ ہو اور کسی شخص کا قلب درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔" (بحارالانوار ۶۸:۲۸۶، محجۃ البیضاء ۵:۱۹۵)

اس اشارے کے بعد ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں اور چار پہلوؤں سے اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کی حیثیت سے زبان کی اہمیت۔

۲۔ اصلاحِ زبان اور اصلاحِ روح وفکر و اخلاق کا باہمی تعلق۔

۳۔ آفات زبان۔

۴۔ آفاتِ زبان کی روک تھام کے قواعد۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں سورۂ رحمن اور سورۂ بلد نے حق بیان ادا کر دیا ہے۔

سورۂ بلد کی آیات ۸ تا ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾

"کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دونوں (اچھی بری) راہیں بھی دکھا دیں۔"

یہ آیات انسان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر کر رہی ہیں۔ آنکھ، زبان اور ہونٹ، ہدایت کی نعمت اور خیر وشر کی معرفت کی نعمت۔

بلاشبہ انسانی اعضاء میں سے حیرت انگیز ترین عضو ہے جس کو اہم ترین ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایسی ذمہ داری جو کسی اور عضو کو نہیں سونپی گئی۔ زبان خوراک کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ خوراک کو چباتے وقت اسے منہ میں ہلانے کا کام اتنی مہارت سے انجام دیتی ہے کہ خود دانتوں کے نیچے نہیں آتی۔ کبھی کبھار کھانا کھاتے ہوئے جب ہماری زبان دانتوں کے نیچے آجاتی ہے اور اس کے

نتیجہ میں جو تکلیف ہم محسوس کرتے ہیں، اس سے ہم بات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر زبان کو اپنے اس کام میں غیر معمولی مہارت حاصل نہ ہوتی تو ہر روز ہمیں کتنی مصیبت اٹھانا پڑتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ کھانا کھا لینے کے بعد منہ کے اندر کی فضا اور دانتوں کی صفائی کا کام بھی زبان ہی نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

لیکن ان سب سے اہم مسئلہ بات کرنے کا ہے جو زبان کی انتہائی تیز اور منظم حرکات وسکنات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی بہت حیرت انگیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کے لیے ایسا آلہ انسان کو عطا کیا ہے کہ آسانی سے ہر وقت ہمیں دستیاب ہے، جو کبھی تھکتا بھی نہیں اور نہ ہی اسے استعمال کرنے پر کوئی اخراجات آتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات انسان کے اندر پائی جانے والی گفتگو کی صلاحیت اور استعداد ہے جس کی مدد سے انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے لامحدود الفاظ کا استعمال اور لامحدود جملے بنانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے الفاظ کی تخلیق کی ایسی استعداد اور صلاحیت عطا کی ہے جس کے استعمال سے ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ الفاظ کی تخلیق کا یہ سلسلہ بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں اسے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا ہے، اس لیے کہ بہت سے الفاظ کے تلفظ اور گفتگو میں زبان کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہونٹ انسان کی زبان کو قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ اور وسیلہ بھی ہیں۔ ایک حدیث نبویؐ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے:

يابن آدم ان نازعك لسانك فى ما حرمت عليك فقد اعنتك بطبقتين فاطبق

''اے فرزندِ آدمؑ! اگر تیری زبان تجھے گناہ پر اکسائے تو اسے قابو میں رکھنے کے لیے میں نے تجھے دو ہونٹ دیئے ہیں۔ ایسی حالت میں اپنے ہونٹوں کو بند کر لے۔''

(مجمع البیان ۱۰: ۴۹۴، نور الثقلین ۵:۵۸۱)

سورۂ رحمن کی پہلی چار آیات میں بھی بیان کو، جو کہ زبان کا ایک اثر اور نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اہم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا گیا ہے۔ ان چار آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ''الرحمن'' کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس وسیع ترین رحمت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ کے دوست اور دشمن سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت یعنی قرآن کا ذکر ہے۔ اس کے بعد انسانی خلقت اور بعد ازاں قدرتِ بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴

''رحمن، جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی تعلیم دی۔''

اس طرح آیت میں نعمت بیان کو انسان کی خلقت کے بعد سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کی ترقی اور تہذیب وتمدن کی پیش رفت پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے تجربات ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کر سکتا اور اس طرح تہذیب وتمدن اور دین واخلاق کا پھیلنا ناممکن ہو جاتا۔

بلاشبہ اگر ایک دن یہ نعمت تمام انسانوں سے سلب کر لی جائے تو اسی دن انسانی معاشرہ زوال و پسماندگی کی تاریکی میں جا گرے گا۔

بیان کے لیے انسان کے پاس ایک آلہ ہے اور ایک اس کے استعمال کا نتیجہ۔ چونکہ ہم ان دونوں کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے یہ سارا عمل ہمیں بہت معمولی اور سادہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی پیچیدہ اور ظریف ولطیف کام اور ایک بے مثال اور نہایت اہم ہنر ہے۔

اس لئے کہ ایک طرف سے آواز ایجاد کرنے کا نظام کام کر رہا ہوتا ہے، پھیپھڑوں میں بھری ہوئی ہوا آواز کی تاروں کو متحرک کرتی ہے۔ یہ آواز زبان اور ہونٹوں کے استعمال کے نتیجہ میں حروف تہجی کو پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح الفاظ کی تخلیق جو کلام و بیان کا بنیادی ترین عنصر ہیں، نیز ایک انتہائی عجیب اور حیرت انگیز عمل ہے، اگر ہم دنیا کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا جائزہ لیں (جن کی تعداد ماہرین لسانیات کے مطابق تین ہزار سے زیادہ ہے) تو اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ الفاظ کی تخلیق کا سلسلہ کبھی نہ رکنے والا سلسلہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال نعمت بیان اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے جو انسان کے آرام وسکون اور اس کی ترقی و پیش رفت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم، حکمت: ۹۶۴۴)

ما الانسان لولا اللسان الا صورة ممثلة، او بهيمة مهملة

''اگر زبان نہ ہوتی تو انسان کیا ہوتا! ایک بے جان مجسمہ یا صحرا میں بھٹکتا ہوا جانور!''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد سے یہ اہم حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ زبان ہی کی بدولت انسان جانوروں سے الگ اور ممتاز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

الجمال فی اللسان

''انسان کا سارا جمال زبان میں ہے۔''(بحار الانوار، ۷۴:۱۴۱)

یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

الجمال فی اللسان و الکمال فی العقل (بحار الانوار، ۷۵:۸۰)

''انسان کا حسن و جمال اس کی زبان میں ہے اور اس کا کمال عقل میں ہے۔''

ہم ان احادیث کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ان فی الانسان عشر خصال یظهرها لسانه: شاهد یخبر عن الضمیر، و حاکم یفصل بین الخطاب، وناطق یردبه الجواب، و شافع یدرك به الحاجة، وواصف یعرف به الاشیاء، و امیر یامر بالحسن، وواعظ ینهی عن القبیح، و معز تسکن به الاحزان، و حاضر (حامد) تجلی به الضغائن و مونق تلذبه الاسماع (کافی، ۸:۲۰)

''انسان میں دس چیزیں ایسی ہیں جو زبان سے ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ یہ ایک شاہد ہے جو انسان کے باطن کی خبر دیتی ہے۔

۲۔ یہ ایک قاضی ہے جو حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔

۳۔ وہ ایک ترجمان ہے جو سوالات کا جواب دیتی ہے۔

۴۔ وہ ایک شفاعت و سفارش کرنے والی ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مقاصد کو حاصل کرتا ہے۔

۵۔ وہ ایک توصیف گر ہے جو چیزوں کے اوصاف بیان کرتی ہے۔

۶۔ وہ حاکم ہے جو نیکیوں کی طرف دعوت دیتی ہے۔

۷۔ وہ ایک واعظ ہے جو برائیوں سے روکتی ہے۔

۸۔ وہ ایک تسلی دینے والی ہے جس سے غموں کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

۹۔ وہ ایک ایسی تعریف کرنے والی ہے جو دلوں سے دشمنی اور کینے کے زنگ کو دور کر دیتی ہے۔

۱۰۔ وہ ایسی ہنرمند ہے جو کانوں کی لذت کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس بحث کے اختتام کے لیے ہم محجۃ البیضاء کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

اس کتاب کے مؤلف، مرحوم محسن فیض کاشانی ''آفات اللسان'' کے عنوان سے ایک بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور اس کی صنعت گری کا لطیف اور حیرت انگیز نمونہ ہے۔ وہ خود چھوٹی سی ہے لیکن اس کی عبادت اور گناہ دونوں ہی بہت بڑے ہیں، اس لئے کہ کفر اور ایمان کا اظہار زبان سے ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک سب سے بڑی اطاعت وعبادت ہے اور دوسرا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے، خواہ موجود ہو یا معدوم، خالق ہو یا مخلوق، خیالی ہو یا حقیقی، مظنون ہو یا موہوم، زبان اس کے بارے میں بات نہ کرتی ہو اور منفی یا مثبت اس کے بارے میں اظہارِ خیال نہ کرتی ہو۔
یہ ایسی خصوصیت ہے جو زبان کے علاوہ کسی اور عضو میں نہیں پائی جاتی۔ آنکھیں رنگوں اور شکلوں کو پہچاننے اور دیکھنے کے سوا اور کوئی کام انجام نہیں دیتی ہیں۔ کان صرف آوازوں کو سنتے ہیں۔ ہاتھ صرف ان چیزوں سے سروکار رکھتے ہیں جو جسمانی وجود رکھتی ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اعضاء کا ہے۔ لیکن زبان کی ایسی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی جولانگاہ نیکی میں بھی بہت وسیع ہے اور بدی میں بھی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زبان کو کھلا چھوڑ دے اور اس کی نگہبانی وحفاظت نہ کرے تو شیطان اسے ہر میدان میں لے جاتا ہے اور جہنم کے کنارے تک پہنچا دیتا ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۵:۱۹۰)

۲۔ زبان کا فکر واخلاق سے تعلق

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان انسان کی روح کا دریچہ ہے۔ ہر انسان کی باتوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی روح کی گہرائی میں کیا چھپا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کی بات اس کے دل وجان پر اثر انداز ہوتی ہے اور بتدریج اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اس طرح روح اور زبان ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔
زبان اور فکر واخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں سورۂ محمد کی آیت ۳۰ نہایت واضح دلیل ہے۔ اس کی رو سے کسی کی باتوں پر غور وفکر کرنے سے بخوبی اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی اور دورِ حاضر میں بھی لوگوں کے افکار، اسرار اور نیتوں کو جاننے کے لیے تفتیش کے دوران اس تعلق سے استفادہ کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے۔
منافقین کے بارے میں اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰

''اگر ہم چاہیں تو انہیں آپ کو دکھا دیں تا کہ آپ ان کو چہروں سے پہچان لیں (لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے) آپ انہیں ان کی بات کرنے کے انداز سے پہچان سکتے ہیں اور اللہ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے۔''
علامہ راغب اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب ''مفردات'' میں لکھا ہے کہ ''لحن'' کے معنی یہ ہیں کہ بات کو اس کے خاص قواعدو

ضوابط سے منحرف کردیا جائے، اسے غلط اعراب دے دیئے جائیں، یا صاف بات کرنے کی بجائے اشارہ وکنایہ میں بات کی جائے۔ اس آیت میں "لحن القول" سے یہی آخری معنی مراد ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ منافقین کے اس اندازِ گفتگو سے، جس میں ایک بات کے دو معنی یا دو پہلو پائے جاتے ہیں، ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔

ابوسعید خدری سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

لحن القول بغضهم علی بن ابیطالب، و کنا نعرف المنافقین علی عهد رسول الله ببغضهم علی بن البیطالب (مجمع البیان، ۹:۱۰۶)

"لحن القول سے مراد منافقین کا بغض علی علیہ السلام ہے اور ہم زمانہ رسولؐ میں منافقین کو ان کے بغض علی علیہ السلام کی وجہ سے پہچانتے تھے۔" (یعنی اس کا ایک نمایاں مصداق حضرت علی علیہ السلام سے ان کی دشمنی ہے)۔

احادیث میں انسان کے مافی الضمیر اور اس کے اندازِ گفتگو کے باہمی تعلق کے بارے میں مفصل بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شیئا الا ظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

"انسان جو بات بھی اپنے دل میں چھپاتا ہے، وہ اس کی باتوں سے یا اس کے چہرے کے آثار سے ظاہر ہو جاتی ہے۔" (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۶)

امیر المومنین علیہ السلام کا یہ بیان جو نفسیات اور تحلیل نفسی کی بنیاد اور ستون قرار دیا جا سکتا ہے، اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ زبان انسان کی روح کا آئینہ ہوتی ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الانسان لبه لسانه

"انسان کی شخصیت کا خلاصہ اس کی زبان ہے۔" (بحار الانوار، ۷۸:۵۶)

۳۔ آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں منقول ہے:

قلت اربعا. انزل الله تصدیقی بها فی کتابه. قلت المرء مخبوء تحت لسانه فاذا تکلم ظهر. فانزل الله تعالی و لتعرفنهم فی لحن القول. قلت فمن جهل شیئا عاداه. فانزل الله. بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه. وقلت قیمة کل امرء ما یحسن، فانزل الله فی قصة طالوت ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم و

الجسم، و قلت القتل یقل القتل، فانزل الله و لکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (بحارالانوار، ۶۸:۲۸۳)

''میں نے رسولؐ اللہ کے زمانہ حیات میں چار باتیں کہی تھیں جن کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائی۔ میں نے کہا تھا کہ انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے جب بولتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِيۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ

''آپ ان کے اندازِ گفتگو سے ان کو پہچان لیں گے۔'' (سورۂ محمد:۳۰)

میں نے کہا تھا کہ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے، اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ

''انہیں جس بات کا پورا علم نہیں تھا، انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔'' (یونس:۳۹)

میں نے کہا تھا کہ ہر انسان کی قیمت وہ نیکی ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں طالوت کے واقعہ میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَيۡكُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ

یعنی ''اللہ نے اسے تم پر چن لیا اور اسے علم اور جسمانی قوت میں وسعت عطا فرمائی۔'' (بقرہ:۲۴۷)

میں نے کہا تھا کہ قصاص سے معاشرے میں قتل میں کمی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ

یعنی ''اے صاحبانِ عقل! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔'' (بقرہ:۱۷۹)

۴۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

یستدل علی عقل کل اولی الالباب

''کسی انسان کی بات سے اس کی عقل کی پہچان ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۵۔ نیز آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ایاك والكلام فی مالا تعرف طریقة ولا تعلم حقیقته فان قولك یدل علی عقلك و عبادتك تنبو عن معرفتك

''جس چیز کا راستہ اور حقیقت تمہیں معلوم نہ ہو، اس کے بارے میں بات نہ کرو، اس لئے کہ تمہاری بات تمہاری عقل کی اور تمہاری عبادت تمہاری معرفت کی نشاندہی کرتی ہے۔'' (غرر الحکم)

مختصر یہ کہ انسان کی شخصیت اور انسانی معاشرے کی تشکیل میں زبان کا کردار انتہائی اہم اور حساس ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی نعمتیں انسان کے لیے عظیم سرمایہ ہیں مگر ان کی آفات اور ان کے خطرات بھی اسی قدر عظیم ہیں، جس طرح ایٹمی طاقت، اگر اس سے مثبت اور تعمیری انداز میں فائدہ اٹھایا جائے تو دنیا کو اس کی مدد سے آباد کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس سے ایٹم بم بنایا جائے تو چند لمحوں میں ساری دنیا کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ آفات اللسان یا زبان کے خطرات

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ جس طرح زبان کے مثبت اور تعمیری فوائد بہت زیادہ ہیں، اسی طرح اس کے منفی اور مخرب اثرات بھی بہت زیادہ ہیں۔

محقق بزرگوار مرحوم محسن فیض کاشانی نے اپنی کتاب ''محجۃ البیضاء'' میں اور امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں زبان کے گناہوں کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ امام غزالی نے زبان کے بیس گناہوں کی فہرست دی ہے جو یہ ہیں:

۱۔ ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا جن کا انسان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ بیہودہ اور ضرورت سے زائد گفتگو۔

۳۔ گناہ آلود چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا، جیسے شراب یا بدکار عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا۔

۴۔ جدال و مراء (جدال سے مراد وہ بحث ہے جس کا مقصد دوسرے کو ذلیل کرنا ہوتا ہے جبکہ مراء اس بحث کو کہتے ہیں جس کا مقصد اپنی برتری ظاہر کرنا ہو)۔

۵۔ گفتگو کے دوران جھگڑا کرنا اور ہٹ دھرمی سے کام لینا۔

۶۔ گفتگو کے دوران تکلف کرنا اور سجع و قافیہ کے لیے تصنع کرنا۔

۷۔ گالی گلوچ کرنا۔

۸۔ غیر مستحق کو لعنت کرنا۔

۹۔ غنا اور شاعری (اس سے مراد وہ شاعری ہے جو باطل مطالب پر مشتمل ہو یا لہو آمیز انداز میں گائی جائے)۔

۱۰۔ گھٹیا اور پست قسم کا مزاح۔

۱۱۔ دوسروں کا مذاق اڑانا اور ان کی تحقیر کرنا۔

۱۲۔ لوگوں کے راز فاش کرنا۔

۱۳۔ جھوٹا وعدہ کرنا۔

۱۴۔ جھوٹ بولنا۔

۱۵۔ چغل خوری (دو افراد کے درمیان لڑائی یا نفرت پیدا کرنے کے لیے ایک کی بات دوسرے کو بتانا)۔

۱۶۔ غیبت کرنا۔

۱۷۔ گفتگو میں منافقت (لوگوں کے سامنے ان سے اور طرح سے بات کرنا اور ان کی غیر موجودگی میں کسی اور طرح سے)۔

۱۸۔ بے جا تعریف کرنا، یا ایسے افراد کی تعریف کرنا جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔

۱۹۔ بغیر سوچے سمجھے اور مطالعہ کئے بغیر بات کرنا۔

۲۰۔ ایسے امور کے بارے میں سوال کرنا جنہیں سمجھنا خود سوال کرنے والے کے لیے ناممکن ہو۔

اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان کے گناہ انہی بیس چیزوں میں منحصر اور محدود نہیں ہیں۔ شاید فیض کاشانی اور غزالی کا مقصد تمام گناہوں کو بیان کرنا نہ تھا۔ لہٰذا مندرجہ ذیل گناہوں کو بھی مذکورہ بالا فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تہمت لگانا۔

۲۔ جھوٹی گواہی دینا۔

۳۔ خودستائی یعنی اپنے منہ میاں مٹھو۔

۴۔ بے بنیاد افواہیں پھیلانا یا بے حیائی و بدکاری کی نشر و اشاعت کرنا۔

۵۔ سخت لہجہ میں اور بے ادبی کے ساتھ گفتگو کرنا۔

۶۔ کسی بات پر بے جا اصرار کرنا (جیسا کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کے بارے میں کیا جس کے ذبح کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا)۔

۷۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا، بالفاظ دیگر زبان سے گھاؤ لگانا۔

۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو۔

۹۔ زبان سے ناشکری کے کلمات ادا کرنا۔

۱۰۔ تبلیغ باطل، ترغیب گناہ، امر بہ منکر و نہی از معروف۔

شاید یہ بتانا بھی ضروری نہ ہو کہ یہ تیس گناہ بھی زبان کے گناہوں کی مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ گناہانِ زبان میں سے زیادہ نمایاں گناہ ہیں۔

لیکن اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات اس سلسلہ میں افراط کی جانب نکل گئے اور بعض اوقات ان گناہوں کو بھی گناہانِ زبان کی فہرست میں لے آئے جن کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً فقر و ناداری کا ذکر کرنا، دین میں بدعت گزاری کرنا، تفسیر بالرائے اور جاسوسی وغیرہ۔ ان اعمال میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل گناہ ہے، جو ممکن ہے زبان سے، قلم سے یا کسی اور ذریعے سے انجام دیئے جائیں۔ ان کو گناہانِ زبان میں شمار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اس انداز سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر سارے گناہ اور اخلاقی رذایل مثلاً ریا، حسد، تکبر، قتل، زنا وغیرہ کو کسی نہ کسی طرح زبان کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی گناہ کی مختلف صورتوں کو ایک مستقل گناہ قرار دیا جاتا ہے، مثلاً استاد کے ساتھ بدزبان ماں باپ کے ساتھ بدزبانی اور دوسرں کو برے ناموں سے پکارنے کو الگ الگ گناہ شمار کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی گناہ کی مختلف شکلیں ہیں۔

لہٰذا بہتر ہے کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ اس تقسیم سے اصل بحث پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۴۔ خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول

اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ زبان اللہ تعالٰی کی ایک عظیم نعمت ہونے کے باوجود کس قدر خطرناک ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ یہ بہت سے گناہوں کی بنیاد واقع ہو جاتی ہے اور انسان کی سعادت کو خاکستر کر سکتی ہے، لہٰذا یہ فکر کرنی چاہئے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کی پابندی کر کے ان خطرات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے یا کم از کم حد تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

احادیث معصومینؑ، علمائے اخلاق کے اقوال اور عارفانِ حق کے ارشادات سے ایسے امور کی نشاندہی ہوتی ہے جنہیں ہم آفاتِ زبان کا مقابلہ کرنے کے عمومی اصولوں کے نام سے بیان کر رہے ہیں:

۱۔ خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ

ہر خطرناک چیز کے خطرات سے بچنے کے لیے سب سے پہلے اس کے خطرات کی طرف پوری طرح سے توجہ دینا ضروری ہے۔ ہر روز صبح کے وقت بیدار ہونے پر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو نصیحت کرے کہ دن بھر خطراتِ زبان سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا رہے، اس لئے کہ یہ وہ عضو ہے جو انسان کو سعادت کی بلندیوں تک بھی لے جاتا ہے اور شقاوت و بدبختی کی ہولناک پستیوں میں بھی پھینک دیتا ہے۔ اگر اس سے غفلت کی جائے تو ایک خونخوار درندے کی طرح انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ بات احادیث میں انتہائی حسین انداز میں بیان کی گئی ہے:

ایک حدیث میں سعید بن جبیر رسولؐ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

اذا اصبح ابن آدم اصبحت الا عضاء کلھا تستکفی اللسان انی تقول اتق اللہ

فینا فانك ان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا

''جب فرزند آدم صبح بیدار ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو خبردار کرتے ہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، اس لئے کہ اگر تم سیدھی راہ پر چلو تو ہم بھی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اور اگر تم ٹیڑھے راستوں پر چلو تو ہم بھی ٹیڑھے راستوں پر چلنے لگتے ہیں۔'' (محجۃ البیضاء، ۵: ۱۹۳)

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان لسان ابن آدم یشرف علی جمیع جوارحه کل صباح فیقول کیف اصبحتم؟ فیقولون بخیر ان ترکتنا و یقولون الله فینا. و ینا شدونه و یقولون انما نثاب و نعاقب بك

''انسان کی زبان ہر روز صبح کے وقت اس کے تمام اعضاء پر نظر ڈالتی ہے اور کہتی ہے: تم نے کس حال میں صبح کی؟ وہ کہتے ہیں: خیریت کے ساتھ، اگر تم نے ہمیں اسی حال پر رہنے دیا تو! (پھر وہ اسے کہتے ہیں) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، پھر اسے قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری ہی وجہ سے ہم ثواب یا عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۵)

۲۔خاموشی

گزشتہ صفحات میں ہم خاموشی کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں جس میں خاموشی کی اہمیت کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئیں۔ قرآنی آیات میں بھی خاموشی کی اہمیت کے بارے میں اشارات پائے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر کم بولے گا، اسی قدر اس کی غلطیاں کم ہوں گی اور جس قدر اس کی خاموشی زیادہ ہوگی، اسی قدر اسے زیادہ سلامتی نصیب ہوگی۔

اس کے علاوہ خاموشی کی زیادہ سے زیادہ مشق سے انسان کو اپنی زبان پر زیادہ سے زیادہ اختیار اور قابو حاصل ہوتا ہے اور انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔

س یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خاموشی سے مراد مکمل خاموشی نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کی زندگی کی بہت سی مادی اور معنوی ضروریات کی تکمیل، کئی عبادات و اطاعات، علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور لوگوں کے امور کی اصلاح صرف بات کرنے اور زبان کے استعمال سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ یہاں خاموشی سے مراد قلتِ کلام ہے، یعنی ایسی باتوں سے پرہیز کرنا جو فتنہ و فساد یا گناہ کا باعث ہوں، یا مشکوک اور بے معنی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کثر کلامه کثر خطوه، و من کثر خطوه قل حیاوه، و من قل حیاوه قل ورعه، و من قل ورعه مات قلبه، و من مات قلبه دخل النار

''جو زیادہ بولتا ہے، اس کی خطائیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی خطائیں زیادہ ہوں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے، جس کی حیا کم ہوجائے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے اور جس کا دل مردہ ہوجائے، وہ جہنم میں جاتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۳۴۹)

آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الکلام کالدواء قلیله ینفع و کثیره قاتل

''کلام دوا کی مانند ہے، اگر کم ہو تو صحت مندی کا باعث ہوتی ہے، زیادہ ہو تو مار ڈالتی ہے۔''

۳۔ حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا)

اگر انسان بولنے سے پہلے سوچے تو زبان کی بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر یا مطالعہ کے بغیر بات کرنا انسان کو مختلف قسم کے گناہانِ زبان کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

ان لسان المومن وراء قلبه، فاذا اراد ان یتکلم بشیء تدبره بقلبه، ثم امضاه بلسانه، و ان لسان المنافق امام قلبه، فاذاهم بشیء امضاه بلسانه و لم یتدبره بقلبه

''مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے دل سے غور و فکر کرتا ہے، پھر اسے زبان سے ادا کرتا ہے جبکہ منافق کی زبان اس کے دل کے آگے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے اور اس کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتا۔''

(محجۃ البیضاء، ۵:۱۹۵)

یہی بات اختلافِ الفاظ کے ساتھ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۷۶ میں امیر المومنین علیہ السلام نے بھی بیان فرمائی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

قلب الاحمق فی فمه و فم الحکیم فی قلبه (بحار الانوار، ۷۵:۳۷۴)

''احمق کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے جبکہ عاقل کا منہ اس کے دل میں ہوتا ہے۔''

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں قلب سے مراد عقل وفکر ہے اور زبان کے دل کے آگے یا پیچھے ہونے کا مطلب بات کے معنی میں غور وفکر کرنا یا نہ کرنا ہے۔

واقعی یہ کتنا اچھا ہو اگر ہم بات کرنے سے پہلے سوچیں اور دیکھیں کہ یہ بات کرنے کا محرک کیا ہے، اس بات کے نتائج کیا ہوں گے؟ آیا یہ بات بے معنی، مضر یا کسی مومن کی توہین یا ظالم کی حمایت تو نہیں ہے؟ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہے؟ امر بالمعروف ونہی از منکر کیلئے ہے؟ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت پر مبنی ہے؟ اللہ کی رضا اور بندگانِ خدا کی خوشی کا باعث ہے؟

اس گفتگو کو ہم امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو مندرجہ بالا تمام مطالب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور انسان کے دل کی نورانیت کا باعث بن سکتی ہے:

ان احببت سلامة نفسك وستر معايبك فاقلل كلامك و اكثر صمتك. يتوفر فكرك ويستنر قلبك

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نفس کو سلامتی نصیب ہو اور تمہارے عیب پوشیدہ رہیں تو اپنی گفتگو کو کم اور خاموشی کو زیادہ کرو۔ اس سے تمہاری فکر کو قوت اور دل کو نورانیت ملے گی۔'' (تصنیف غرر الحکم، صفحہ ۲۱۶)

یہ تہذیب نفس اور پاکیزگی اخلاق میں زبان کے کردار اور حفاظت زبان کے کلی اصولوں کا خلاصہ تھا۔ البتہ غیبت، تہمت، چغل خوری، برائی اور باطل کی نشر واشاعت جیسے موضوعات پر ہم انشاءاللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

خودشناسی اور خداشناسی

اصلاحِ نفس، تہذیبِ اخلاق اور انسانی صفات کے حصول اور پرورش میں ایک اور اہم قدم خودشناسی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کئے بغیر کمالاتِ انسانی تک پہنچ جائے، اپنے عیوب کی اصلاح کر سکے اور اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک کر سکے۔

جب تک بیمار کو اپنی بیماری کی خبر نہ ہو، کیا وہ طبیب کے پاس جائے گا؟

جو شخص سفر میں بھٹک گیا ہو، جب تک اسے احساس نہ ہو کہ وہ راستہ بھول گیا ہے، کیا وہ کسی رہنما کی ضرورت محسوس کر سکتا ہے؟

جب تک انسان کو احساس نہ ہو کہ دشمن اس کے گھر کے قریب ہے اور اس پر حملہ کرنے والا ہے، کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔اسی طرح جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، اپنے عیوب اور نقائص سے با خبر نہ ہو، ہرگز اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی مسیحا نفس روحانی طبیب کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔اس مختصر تمہید کے بعد ہم خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق اور خدا شناسی و تہذیب نفس کے باہمی ربط و تعلق کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق

خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق کے دلائل نہایت واضح ہیں جنہیں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

۱۔ انسان خودشناسی کے ذریعے انسانی نفس کی عظمت اور کرامت کو اور روح کی اہمیت کو، جو کہ انوار الٰہی اور نفخۂ ربانی کا پرتو ہے، اچھی طرح سے پہچان سکتا ہے اور اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ اس گوہر گراں بہا کو کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہیے اور اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ خودشناسی کے ذریعے انسان ہوائے نفسانی کے خطرات، شہوت کے محرکات اور سعادت کے ساتھ ان کے تضاد کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، وہ ان محرکات سے بے خبر رہ جاتا ہے۔اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جسے ایک خطرناک دشمن نے گھیرا ہوا ہو مگر وہ اس سے غافل ہو۔ظاہری بات ہے کہ ایسا شخص اس دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن کے مہلک وار کا نشانہ بن جائے گا۔

۳۔ جو انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے، وہ ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں۔ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لینے کے بعد اس کے اندر ان کو پروان چڑھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کر سکے اور اپنے جوہر ذات کو ہویدا و آشکار کر سکے۔

جو شخص اپنی معرفت نہیں رکھتا، اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جس کے گھر میں جگہ جگہ قیمتی خزانے دفن ہوں لیکن وہ ان کو نہ جانتا ہو۔ممکن ہے ایسا شخص بھوک سے مر جائے جبکہ اس کے قدموں تلے اتنا بڑا خزانہ چھپا ہوا ہو جس سے ہزاروں افراد کو کھانا کھلایا جا سکتا ہو۔

۴۔ تمام اخلاقی برائیوں کی جڑیں انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔خودشناسی کی مدد سے انسان ان کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بیماریوں کا علاج آسان ہو جاتا ہے۔اس طرح تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کی منزل تک پہنچنے کی راہ اس کے لیے ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خودشناسی، خدا شناسی کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ خدا شناسی اور اللہ کی صفاتِ جلال و جمال کی پہچان اخلاقی فضائل کی نشوونما اور اخلاقی پستیوں سے نجات کے حصول اور اوجِ فضائل تک پہنچنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

اگر گزشتہ مطالبہ میں اس جملے کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ رذائل اخلاقی انسان کو تباہی سے دو چار کر دیتے ہیں، انسانی معاشرے کو خطرناک بحرانوں میں گرفتار کر دیتے ہیں، زندگی کے شہد کو کڑوے زہراب میں بدل دیتے ہیں تو خودشناسی اور خودآ گاہی کی اہمیت مزید واضح وآشکار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

کارل مینگرز اپنی کتاب ''تحلیلِ نفسی کے معجزات'' میں لکھتا ہے:

''خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اپنی مثبت اور محبت انگیز طاقتوں کا بھی علم ہو اور ان منفی ومخرب قوتوں کا بھی علم ہو جو ہمیں بدقسمتی سے دو چار کر سکتی ہیں۔ ان منفی طاقتوں کو نظرانداز کرنا اور دوسروں کے اندر ان کے وجود کی بات نہ کرنا زندگی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔''

''انسان موجودِ ناشناختہ'' جو ایک مشہور ومعروف کتاب ہے، اس میں ایک جملہ ہے جو ہماری بحث کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے:

''بدقسمتی سے صنعتی تمدن میں انسان کی پہچان پر توجہ نہیں دی گئی اور زندگی کا لائحہ عمل انسان کی فطری اور طبیعی بنیادوں پر وضع نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ظاہری حسن ورعنائی کے باوجود انسان کو فلاح کی راہ نہ دکھا سکا۔ سائنسی ترقی درحقیقت کسی منصوبہ بندی کے مطابق عمل میں نہیں آئی بلکہ تقریباً اتفاقی تھی۔ اگر گلیلیو، نیوٹن اور لیوازے اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو انسان کے جسم اور روح کے مطالعہ پر صرف کرتے تو آج دنیا کی شکل کچھ اور ہوتی۔'' (صفحہ:۲۲)

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہوس ران سرکشوں کی سزا خود فراموشی مقرر کی ہے اور مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾

''اور ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انکو ان کے اپنے بارے میں بھلاوے میں ڈال دیا۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (حشر:۱۹)

۲۔ خودشناسی احادیث کی روشنی میں

رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث میں خودشناسی کے بارے میں بہت اہم اور قابل قدر مطالب بیان ہوئے ہیں جو ہمیں اس سلسلہ میں ہر قسم کی تشریح ووضاحت سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

۱۔ امیرالمومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

نال الفوز الاکبر من ظفر بمعرفة النفس (غرر الحکم، حدیث:۹۹۶۵)

''جس نے اپنی معرفت حاصل کر لی، اس نے سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔''

۲۔ اسی کے نقطہ مقابل میں آپؑ ہی سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

من لم یعرف نفسه بعد عن سبیل النجاة و خبط فی الضلال و الجهالات

(غرر الحکم، حدیث: ۹۰۳۴)

''جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا، وہ راہِ نجات سے دور ہو گیا اور گمراہی و جہالت میں گر گیا۔''

۳۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

العارف من عرف نفسه فاعتقها و نزهها عن کل ما یبعدها

''حقیقی عارف وہ ہے جو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے اور اسے خواہشات کی قید سے آزاد کروائے اور ہر اس چیز سے پاک کرے جو اسے سعادت سے دور کرتی ہو۔''

(غرر الحکم بحوالہ المیزان، ۶: ۱۷۳)

۴۔ نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں ہے:

اکثر الناس معرفة لنفسه اخوفهم لربه (غرر الحکم، حدیث ۳۱۲۶)

''جو شخص سب سے زیادہ اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہو، وہ سب سے زیادہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

یہ حدیث خوفِ خدا اور خودشناسی کے قریبی تعلق کو بخوبی بیان کرتی ہے جبکہ خوف خدا تہذیب نفس کا اہم ذریعہ ہے۔

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

من عرفه نفسه جاهدها، و من جهل نفسه اهملها

''جو اپنے نفس کو پہچان لے، اس کے خلاف جہاد کرتا ہے اور جو اپنے نفس کے بارے میں جاہل ہوتا ہے، وہ اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔'' (میزان الحکمہ، ۳: ۱۸۸۱ بحوالہ المیزان)۔

اس حدیث کی رو سے نفس کے خلاف جہاد، جسے جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے، خودشناسی پر موقوف ہے۔

۶۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کرمت علیه نفسه هانت علیه شهواته

''جو اپنے آپ کو محترم جانتا ہے، وہ خواہشاتِ نفس کو حقیر جانتا ہے۔'' (یعنی آسانی سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں کرتا)۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۲۰۹)

۷۔ جس طرح خودشناسی تہذیب نفس اور اخلاقی ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتی ہے، اسی طرح نفس کی حقیقت سے جاہل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تمام اخلاقی اقدار سے بیگانہ اور اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایک حدیث میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ھانت علیہ نفسہ فلا تامن شرہ (تحف العقول، کلماتِ قصار امام علی نقی علیہ السلام)

''جو شخص عزتِ نفس سے محروم ہے، اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھو۔''

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خودشناسی اور معرفت نفس فضائل اخلاقی کی پرورش اور روحانی ارتقاء کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان اس مشکل اور دشوار منزل کو عبور نہیں کر لیتا، کسی بھی معنوی مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق اس بات پر سخت تاکید کرتے ہیں کہ رہروانِ راہِ معرفت خودشناسی کو اہمیت دیں اور اس انتہائی بنیادی اہمیت کے معاملہ سے غفلت نہ کریں۔

۳۔ خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے

قرآن مجید انتہائی صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

''ہم اپنی نشانیاں آفاق (کائنات کی وسعتوں) میں اور ان کے اپنے وجود میں انہیں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔'' (فصلت: ۵۳)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور تمہارے وجود کے اندر اس کی نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟'' (ذاریات: ۲۱)

بعض محققین نے اس آیت سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معرفتِ نفس، معرفت خدا کا ذریعہ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ (اعراف: ۱۷۲)

''جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ قرار دیا (اور ان کے وجود کے اسرار انہیں دکھا کر فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں۔''

تفسیر المیزان میں ہے:

''انسان جس قدر متکبر ہو، وسائلِ زندگی کی فراوانی اسے جس قدر بھی مغرور بنادے، وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے وجود کا مالک نہیں ہے، نہ ہی اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہے۔ اگر وہ اپنا مالک ہوتا تو موت اور زندگی کے دیگر آلام ومصائب کو اپنے آپ سے دور رکھتا۔ اگر اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہوتا تو کبھی عالم اسباب کے سامنے عاجز ومجبور نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ مالک ومدبر رب کا محتاج ہونا انسان کے وجود کے عناصر ترکیبی میں سے ہے۔ فقر وحاجت مندی انسان کی پیشانی پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کسی میں ذرہ بھر شعور ہو، وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا اور اس مسئلہ میں عالم اور جاہل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

بنابرایں انسان انسانیت کے جس مقام پر بھی ہو، وہ اس حقیقت کو بخوبی درک کرتا ہے کہ اس کا ایک مالک اور مدبر رب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی ذاتی حاجت مندی کو تو دیکھ رہا ہو اور اپنی اس حقیقت کو نہ دیکھ سکے۔

لہٰذا یہ آیت ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے جسے انسان دنیوی زندگی میں محسوس کرتا ہے، وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں ایک ایسی ہستی کا محتاج ہے جو اس کی اپنی ذات سے باہر ہے۔ بنابرایں اس آیہ شریفہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے انسان کو اس کی نیازمندی اور احتیاج سے آگاہ کردیا اور انہوں نے ہماری ربوبیت کا اعتراف کرلیا۔'' (المیزان ۸:۳۰۷)

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نفس انسان اور اس کی خصوصیات کی معرفت، اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

مشہور حدیث "من عرف نفسه عرف ربه"، ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''، اسی حقیقت کو بیان کررہی ہے۔ یہ حدیث الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ رسول اللہ اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ بحارالانوار میں یہ حدیث کتاب ادریسؑ کے صحیفہ چہارم سے، جو صحیفۂ معرفت کے نام سے موسوم ہے، اس طرح نقل ہوئی ہے:

من عرف الخلق عرف الخالق، ومن عرف الرزق عرف الرازق، ومن عرف نفسه عرف ربه (بحارالانوار، ۹۲:۴۵۶، ۵۸:۹۹ اور ۶۶:۲۹۳)

''جس نے مخلوق کو پہچان لیا، اس نے خالق کو پہچان لیا، جس نے رزق کو پہچان لیا، اس نے رازق کو پہچان لیا اور جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''شیعہ اور سنی دونوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ ایک مشہور حدیث ہے۔''

حدیث "من عرف نفسه" کی سات تفسیریں

اس حدیث کی مختلف اسالیب میں تشریح وتفسیر کی گئی ہے جن میں سے چند کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ یہ حدیث ''برہانِ نظم'' کی طرف اشارہ کررہی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جوشخص بھی اپنی روح وجسم کی ساخت کے حیرت انگیز پہلوؤں پرنظر ڈالے اوراس عجوبہ خلقت کے پیچیدہ اور پر اسرار نظام کوغور سے دیکھے تو اللہ کی معرفت کا دروازہ اس کے اوپرکھل جائے گا،اس لئے کہ یہ حیرت انگیز نظم کسی عالم وقادر مبداء کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔لہٰذا اپنے نفس کی معرفت اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ امکان وجوب'' کی طرف اشارہ ہو،اس لئے کہ اگرانسان اپنے وجود پرغور کرے تو یہ حقیقت اس پرآشکار ہوجائے گی کہ وہ ہرلحاظ سے غیر مستقل اوروابستہ ہے۔اس کا علم،اس کی قدرت وتوانائی،اس کی عقل وذہانت اوراس کے وجود کے تمام شاخ وبرگ،غیر مستقل اورمحتاج ہیں ایک ایسی ذات کے جومستقل اور بے نیاز ہے۔بالفاظ دیگر جوکوئی اپنے وجود کے بارے میں غوروفکر کرے،وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ خود ''ممکن الوجوڈ'' ہے جواپنے وجوداورتمام خصوصیات میں ''واجب الوجوڈ'' کا محتاج ہے۔

۳۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ علت ومعلول'' کی طرف اشارہ ہو،اس لئے جب انسان اپنے وجود پرغور کرتا ہے تو اس پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس کے جسم وروح کسی اورعلت کے معلول ہیں جس نے ایک خاص زمان ومکان میں انہیں نعمتِ وجود سے نوازا ہے۔جب انسان اپنے وجود کی علت کی جستجو کرتا ہے اوراپنے ماں باپ پرنظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی اورعلت کے معلول ہیں۔جب وہ علت ومعلول کے اس سلسلہ کودیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ علت ومعلول لامتناہی نہیں ہوسکتا،اس لئے کہ اس سے تسلسل لازم آتا ہے اورتسلسل کا باطل ہونا ہرصاحب علم ودانش پرواضح ہے۔

بنابرایں علت ومعلول کے اس سلسلہ کولامحالہ کسی مقام پرختم ہونا ہے،یعنی ایک ایسی علت پر جومعلول نہ ہو، جسے دوسرے الفاظ میں علت العلل یاواجب الوجود کہا جاتا ہے،جس کا وجود ذاتی ہے اور جواپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں ہے۔جب انسان اس لحاظ سے اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے رب کو بھی پالیتا ہے۔

۴۔ یہ حدیث ''برہانِ فطرت'' کی طرف بھی اشارہ ہوسکتی ہے۔جب انسان اپنے قلب وروح کی گہرائیوں اورمختلف زاویوں سے اپنے وجود کا جائزہ لیتا ہے تو دیکھتا ہے کہ توحیداورالوہیت کا نوراس کی فطرت میں ضوفشانی کررہا ہے۔اس طرح کسی قسم کے استدلال کی ضرورت محسوس کئے بغیر اپنے نفس کی معرفت سے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلیتا ہے۔

۵۔ ممکن ہے یہ حدیث ''صفاتِ خدا'' کی طرف اشارہ کررہی ہو۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اپنا وجودمخلوقات اورممکنات کی صفات کا حامل ہے تو وہ اپنے رب کی صفات کو پہچان لیتا ہے۔وہ اپنی محدودیت سے اللہ تعالیٰ کے لامحدود ہونے کو سمجھ لیتا ہے،اس لئے کہ اگراللہ بھی محدود ہوتو وہ مخلوق ہوگا۔وہ اپنے فانی ہونے سے اللہ کے باقی ہونے کو سمجھ لیتا ہے،اس لئے کہ اگروہ بھی فانی ہوتو وہ خدانہیں ہوسکتا۔اسی طرح وہ اپنی نیازمندی سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی،اپنے ضعف سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان لیتا ہے۔یہ وہی چیز ہے جونہج البلاغہ کے خطبۂ اول میں امیرالمومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

و کمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة انها غیر الموصوف و شهادة کل موصوف انه غیر الصفة

''اللہ کے لیے اپنے ایمان کو خالص کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ممکنات کی نفی کی جائے، اس لئے کہ (مخلوق) کی ہر صفت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔''

۶۔ علامہ مجلسیؒ نے بعض علماء سے اس حدیث کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''انسان کی روح ایک لطیف لاہوتی موجود ہے جس نے جامۂ ناسوت زیب تن کر رکھا ہے (یعنی اس کا تعلق عالم ماورائے طبیعت سے ہے مگر وہ عالم طبیعت میں سکونت پذیر ہے) اور یہ دس پہلوؤں سے اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر دلالت کرتی ہے:

۱۔ چونکہ روح بدن کی مدبر ہے، اس سے ہم یہ جان لیتے ہیں کہ کائنات کا بھی کوئی مدبر ہے۔

۲۔ چونکہ روح ایک ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق بھی ایک ہے۔

۳۔ چونکہ یہ جسم کو حرکت دینے پر قادر ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ قادر ہے۔

۴۔ چونکہ روح بدن سے مکمل طور پر آگاہ ہوتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ آگاہ و خبیر ہے۔

۵۔ چونکہ اسے تمام اعضاء پر تسلط حاصل ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اپنی تمام مخلوقات پر مکمل تسلط رکھتا ہے۔

۶۔ چونکہ یہ بدن سے پہلے موجود تھی اور اس کے بعد بھی باقی رہے گی، یہ اللہ کے ازلی اور ابدی ہونے کی دلیل ہے۔

۷۔ چونکہ انسان اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت کو جان لینا ممکن نہیں ہے۔

۸۔ چونکہ انسان کو جسم کے اندر روح کی جگہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکان اور محل سے بے نیاز ہے۔

۹۔ روح کو چھونا ممکن نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو چھونا بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰۔ چونکہ انسان کی روح اور نفس کو دیکھا نہیں جا سکتا، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ خالق کو بھی دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

(بحار الانوار، ۵۸:۹۹و۱۰۰)

۷۔ اس حدیث کی تفسیر اس طرح بھی کی گئی ہے کہ ''**من عرفه نفسه عرفه ربه**'' تعلیق بہ محال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انسان کے لیے محال ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی روح کی حقیقت کو پہچان سکے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور مکمل معرفت بھی ممکن نہیں ہے۔

لیکن یہ تفسیر بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس سے پہلے بیان کی گئی تفاسیر مناسب ہیں اور اس حدیث کے یہ تمام معنی باہم مراد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بلاشبہ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے، وہ اللہ کو پہچان لے گا۔ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے اور خدا شناسی یقینا تہذیب اخلاق اور قلب و روح کو اخلاقی آلائشات سے پاک کرنے کا موثر ترین اور یقینی ذریعہ ہے، اس لئے کہ اس کی پاک ذات تمام کمالات وفضائل کا سرچشمہ ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیر و سلوک اور تہذیب نفس کا سب سے اہم قدم خود شناسی ہے۔ لیکن خود شناسی کی منزل تک پہنچنے میں بھی بہت سی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

خودشناسی کی رکاوٹیں

جسمانی بیماریوں کے علاج کا پہلا قدم بیماری کی تشخیص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے جدید دور میں مختلف ذرائع کی مدد سے بیماری کی کمیت وکیفیت کے بارے میں بہتر آگاہی حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بیماریوں کا علاج کافی آسان ہو گیا ہے۔

روحانی بیماریوں اور اخلاقی آلائشات کا علاج بھی اسی طرح ہے۔ جب تک اخلاقی معالجین کی ہدایات کے مطابق اخلاقی رذائل کی صحیح طرح سے تشخیص نہ کر لی جائے، ان کا علاج ممکن نہیں ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ خطرناک جسمانی بیماریوں کی علامتوں کو دیکھنے کے باوجود، جب ذات کی بنیاد پر اپنی ان خطرناک بیماریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ ایسے افراد عموماً اس وقت بیماری کا اعتراف کرتے ہیں جب بیماری مہلک سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ مگر اس وقت اس اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور بیماری کا علاج ناممکن یا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ عام طور پر حب ذات میں مبتلا انسان اپنے اخلاقی عیوب کا اعتراف نہیں کرتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی اخلاقی برائیوں کی تاویل کرتے ہیں اور ان کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی خامی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ ان اخلاقی بیماریوں کی تشخیص کا راستہ ہی بند کر دیتے ہیں۔

خود شناسی اور اپنے عیوب کا اعتراف کرنا بڑی جرأت وہمت کا کام ہے جس کے لیے آہنی عزم وارادے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ انسان ان عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اگر کبھی اس کا کوئی عیب ظاہر ہو جائے تو وہ چالاکی سے اس کی تاویلیں کرنے لگتا ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

بعض اوقات تو اپنے عیوب کو پہچاننا انتہائی وحشت ناک ہوتا ہے اور اکثر لوگ اس وحشت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ لیکن اس کی انہیں بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔

بہر حال حب ذات، خود پسندی اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا، خود شناسی کی منزل تک پہنچنے میں بنیادی رکاوٹ ہے۔ جب تک یہ حجاب برطرف نہیں ہوتا، خود شناسی ممکن نہیں ہو سکتی اور جب تک انسان خود شناسی کا مرحلہ طے نہ کر لے اور اپنی خامیوں سے آگاہ نہ ہو جائے، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کا راستہ اس پر بند رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی طرف سے جو ارشادات ہم تک پہنچے ہیں، وہ اس بات کی صداقت کے زندہ گواہ ہیں۔ رسول اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

اذا اراد اللہ بعبد خیرا فقھه فی الدین وزھدہ فی الدنیا و بصرہ عیوبه

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ اور دنیا میں زہد عطا کر دیتا ہے اور اس کے عیوب اس کو دکھا دیتا ہے۔'' (نہج الفصاحہ:۲۶)

حضرت علی علیہ السلام ایک مختصر مگر پر مغز جملے میں فرماتے ہیں:

جھل المرء بعیوبه من اکبر ذنوبه

''اپنے عیوب سے جاہل رہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۴:۴۱۹)

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ انسان کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود پسندی کے اس حجاب کو پارہ کر کے اپنے عیوب سے آگاہ ہو جائے۔

مرحوم فیض کاشانی اس سلسلہ میں ایک مفید بحث میں اپنے عیوب کو پہچاننے کے چار راستے بیان فرماتے ہیں:

پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے استاد کی تلاش کرے جو نفس کے عیوب سے آگاہ ہو اور اخلاقی برائیوں کے مخفی پہلوؤں سے باخبر ہو۔ جب انسان ایسا استاد تلاش کر لے تو اسے اپنے نفس کا حاکم بنا لے اور اس کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھائے۔ مگر ہمارے دور میں اس کے امکانات بہت کم ہیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایک سچے اور ایماندار دوست کی جستجو کی جائے اور اس سے درخواست کرے کہ اس کے معاملات پر نظر رکھے اور جب کبھی اس سے کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل سرزد ہو، اسے اس سے آگاہ کرے۔ بعض بزرگانِ دین فرمایا کرتے تھے: ''رحم اللہ امرء اھدی الی عیوبی''، ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیب مجھے تحفے میں دے۔'' لیکن ایسے افراد بھی بہت کم ہوتے ہیں، اس لئے کہ دوستوں کی اکثریت عیبوں کی پردہ پوشی کرتی ہے یا پھر بعض دوست ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسد جیسے جذبات کی وجہ سے آپ کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر آپ کے سامنے بیان کریں گے۔ داؤد بن نصیر طائی جو دوسری صدی ہجری کے عظیم عابد اور زاہد تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگوں سے کیوں دور رہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: میں ایسے لوگوں کے نزدیک کیوں رہوں جو میرے گناہوں کو مجھ سے چھپاتے ہیں۔

دیندار افراد اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں کہ دوسروں کی نصیحت کی روشنی میں اپنے عیوب سے باخبر ہوں۔ لیکن آج کے دور میں حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں ہمارے عیب سے باخبر کرے تو وہی ہماری نظر میں قابل نفرت بن جاتا ہے۔ ہم نہ صرف ان کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ الٹا ان سے جھگڑا کرنے لگتے ہیں، اپنے دل میں ان کے بارے میں کینہ اور غصہ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان بھی ہم خود اٹھاتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم ان کی نصیحتوں

سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تیسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے عیب اپنے دشمن کی زبان سے سنے، اس لئے کہ انسان کا دشمن بڑی باریک بینی سے اس کی کوتاہیوں اور خامیوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایک سخت کینہ پرور دشمن سے ایسی باتیں سیکھ لیتا ہے جو خوشامد کرنے والے دوستوں سے نہیں سیکھ سکتا۔

چوتھا راستہ یہ ہے کہ انسان لوگوں میں رہے۔ ان کے افعال و اخلاق کا غور سے مطالعہ کرے اور جو ناپسندیدہ اور مذموم صفات ان میں دیکھے، ان کے حوالہ سے اپنا جائزہ لیتا رہے کہ کہیں وہ صفات خود اس میں تو موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان اس کے عیوب کے آئینے میں اپنے عیوب کو تلاش کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ آپؑ کو یہ آداب کس نے سکھائے؟ انہوں نے جواب دیا: میں نے یہ آداب کسی سے نہیں سیکھے لیکن جب میں نے جاہل کے جہل کو دیکھا اور وہ مجھے ناپسندیدہ لگا تو میں نے اس سے اجتناب کیا۔ (یہ بات حضرت لقمان کے بارے میں اس طرح مشہور ہے کہ آپ نے کس سے آداب سیکھے تو انہوں نے جواب دیا: بے ادب افراد سے)۔ (محجۃ البیضاء ۵:۱۱۲)

عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں

تہذیب اخلاق کے لیے دوسرا قدم یہ ہے کہ عبادات اور دعا کی طرف توجہ کی جائے۔ عبادت اور دعا تہذیب نفس اور اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے میں کتنا موثر کردار ادا کرتی ہیں، یہ جاننے کے لیے ہر چیز سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم عبادت کی حقیقت کو سمجھیں۔

عبادت کی حقیقت کے بارے میں گفتگو اگرچہ بہت طولانی اور مفصل ہے مگر اختصار کے ساتھ اس کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ عبادت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ''عبد'' کے مفہوم پر غور کیا جائے، اس لیے کہ ''عبادت''، ''عبد'' سے ماخوذ ہے۔

لغت کی رو سے ''عبد'' اس شخص کو کہتے ہیں جو سر سے پاؤں تک اپنے مالک اور آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ آقا کے ارادے کے تابع اور اس کی ہر خواہش اس کے آقا کی خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ اپنے مالک کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتا اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی سستی روا نہیں رکھتا۔

اس لحاظ سے عبودیت کسی ایسی ذات کے سامنے خشوع وخضوع کے انتہائی درجے کا اظہار ہے جس سے انسان کا وجود اور اس کی ہر چیز وابستہ ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی انسان کا معبود صرف وہ ہو سکتا ہے جس نے اس پر بے حدو حساب انعام واکرام کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں ہے۔

بالفاظِ دیگر ''عبودیت'' کسی انسان کی روح کے ارتقاء کا اعلیٰ ترین مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا دوسرا

نام ہے۔"عبودیت" اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے سامنے بے قید وشرط اور سو فیصد سپردگی کا نام ہے۔ بنا برایں، عبادت صرف رکوع و سجود اور قیام وقعود کا نام نہیں بلکہ یہ کمال مطلق اور ہر عیب ونقص سے پاک ذات کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسا عمل کمالِ مطلق کی طرف توجہ کرنے اور ہر قسم کی ناپاکی و آلائش سے اجتناب کا بہترین محرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عمل کے ذریعے انسان اپنے معبود کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ معبود کے جلال و جمال کا پرتو اس کے وجود میں منعکس ہو جائے اور وہ "مظہر صفاتِ خدا" بن جائے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة (مصباح الشریعہ بحوالہ میزان الحکمہ، مادہ: عبد)

"عبودیت ایک ایسا جوہر ہے جس کے باطن میں ربوبیت پوشیدہ ہے۔"

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت کے ذریعے عبد کوشش کرتا ہے کہ اس کے کردار اور صفات میں رب کی صفات جلال و جمال کا ظہور ہو۔ اس کے علاوہ عبد، عبودیت کے زیر سایہ ولایت تکوینیہ کے مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ (ولایت تکوینیہ کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو ولایت تکوینیہ حاصل ہے یا نہیں۔ اگرچہ علماء کی ایک جماعت انبیاء، آئمہ اور اولیاء کے بعد ولایت تکوینیہ کی قائل ہے مگر بزرگ علماء کی اچھی خاصی تعداد ولایت تکوینیہ کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص قرار دیتی ہے)۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن شریف کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ فضائل اخلاق کی پرورش میں عبادت کیا کردار ادا کرتی ہے۔

۱۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ (بقرہ:۲۱)

"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔"

۲۔ يَاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔" (بقرہ: ۱۸۳)

۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ

''اور نماز قائم کرو، بے شک نماز بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے۔'' (عنکبوت: ۴۵)

۴۔ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾

''یقیناً انسان حریص اور کم ہمت پیدا کیا گیا ہے۔ جب کوئی برائی اسے پہنچتی ہے تو بیتابی کرتا ہے اور جب کوئی خیر اور بھلائی اسے پہنچتی ہے تو دوسروں کو اس سے روکتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں۔'' (معارج: ۱۹ تا ۲۳)

۵۔ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۰۳)

''ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو اور اس کے ذریعے انہیں پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

۶۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد: ۲۸)

۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٣﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (بقرہ: ۱۵۳)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں عبادت کا تقویٰ، گناہوں سے پرہیز اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ساتھ قریبی تعلق نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ سالکانِ راہِ خدا اور تقویٰ وخودسازی کی منزل کے مسافروں پر لازم ہے کہ وہ عبادت اور دعا کے ذریعے مدد مانگیں اور اپنے وجود کی آلائشات کو عشق خدا کی بھٹی میں جلا کر ان سے چھٹکارا حاصل کریں اور اس طرح اپنے وجود کے تانبے کو کیمیائے عبادت کے ذریعے سونا بنالیں۔

اس سلسلہ میں مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت بغیر کسی استثناء کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے انہیں یہ کہہ رہی ہے:

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾

(بقرہ:۲۱)

اس آیت میں گزشتہ لوگوں کی غفلت کی طرف اشارہ کرنے سے شاید یہ مقصود ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی بت پرستی کا جواز یہ بتاتے تھے کہ ان کی گزشتہ نسلیں بت پرستی اور شرک کی راہ پر چل رہی تھیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ تمہارا اور تم سے پہلے سب لوگوں کا خالق اللہ ہی ہے، وہ ہر ایک اور ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ بت کسی طور پر بھی پرستش کے لائق نہیں ہیں۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس کی بندگی و عبادت کرو گے تو تمہارے وجود کی شاخوں پر تقویٰ کے پھول کھلیں گے۔ تمہاری موجودہ غیر اخلاقی صورتحال کی وجہ تمہاری جاہلانہ عبادات ہیں۔

یہ آیت عبادت اور تقویٰ کے تعلق کو غیر مشروط طور پر بیان کرتی ہے۔

دوسری آیت میں روزہ اور تقویٰ کے باہمی ربط و تعلق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہا ہے:

''اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾

ہر انسان اس بات کو بخوبی درک کرسکتا ہے کہ جب وہ روزہ کی حالت میں ہوتا ہے تو ایک خاص نورانیت اور پاکیزگی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے وہ اپنے آپ کو نیکی کے قریب تر اور برائیوں سے دور محسوس کرتا ہے۔ اعداد و شمار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہِ مبارک رمضان میں معاشرے میں جرائم کی سطح نیچے آجاتی ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جس قدر اللہ کی بندگی کے نزدیک ہوتا ہے، اتنا ہی برائیوں سے دور ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں نماز اور فحش حرکات و منکرات سے دوری کا باہمی تعلق نظر آتا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

''نماز قائم کرو، یقیناً نماز (انسان کو) برائی اور گناہ سے باز رکھتی ہے۔''

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ

اس آیت میں ''فحشاء و منکرات'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمام غیر اخلاقی افعال کے مجموعہ پر منطبق ہوتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام غیر اخلاقی افعال کا سرچشمہ وہ غیر اخلاقی اقدار ہوتی ہیں جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔

بالفاظ دیگر یہ اندرونی اخلاق ہے جو ظاہری اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نماز فحشاء و منکرات سے اس لئے روکتی ہے کہ نماز کے با معنی اذکار و اعمال کی بدولت انسان قرب خدا کی روحانی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کے محرکات یعنی ہوائے نفس اور حب دنیا سے دور ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پابند نماز افراد کی زندگی میں گناہ کم نظر آتا ہے۔جس قدر نماز زیادہ معنویت کے ساتھ ادا کی جائے،اسی تناسب سے انسان برائی اور بدکاری سے دور ہوجاتا ہے اور اسی قدر انسان کے اندر اخلاقی صفات واضح اور آشکار ہوجاتی ہیں۔

چوتھی آیت میں صرف نمازیوں کو بعض اخلاقی رذائل مثلاً مشکلات میں بے صبری،حصول دولت کے بعد بخل وغیرہ سے مستثنٰی کیا گیا ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''انسان حریص اور کم ہمت پیدا ہوا ہے، جب کوئی برائی اس پر آتی ہے تو وہ بے صبری کرنے لگتا ہے، جب اسے کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے اور دوسروں کا حق روکتا ہے،سوائے ان نمازیوں کے جو باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔''

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ (معارج:۱۹ تا ۲۳)

یہ آیت اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف توجہ،عبادت اور دعا،انسان کے باطن سے بخل،بے صبری اور دیگر اخلاقی برائیوں کے خاتمہ پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔

پانچویں آیت میں زکوٰۃ اور روح کی پاکیزگی و تزکیہ نفس کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ ایک اہم عبادت ہے۔اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

''ان کے اموال سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کروتا کہ تم اس کے ذریعے ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ نفس کرو۔''

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (توبہ:۱۰۳)

''تزکیھم بھا'' کے الفاظ واضح طور پر اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے،اس لئے کہ زکوٰۃ کے ذریعے انسان بخل،حرص،دنیا پرستی اور حب مال جیسے رذائل سے پاک ہوجاتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان دوستی،سخاوت اور غریبوں سے ہمدردی جیسی اخلاقی صفات انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں،وہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔رسولؐ اللہ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

ما تصدق احد کم بصدقۃ من طیب۔ و لا یقبل اللہ الا اخذھا الرحمان بیمینہ
و ان کانت تمرۃ فتربو من کف الرحمان فی الرحمان حتی تکون اعظم من الجبل

”تم میں سے جو کوئی مالِ حلال سے صدقہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ سوائے مال حلال کے قبول نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاتھ سے وصول فرماتا ہے، خواہ وہ کھجور کا ایک دانہ ہو۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔“ (صحیح مسلم، ۲:۱۰۲، مطبوعہ بیروت)

یہ حدیث انتہائی بامعنی تشبیہ اور کنایہ پر مشتمل ہے اور زکوٰۃ ایسی عظیم عبادت کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے براہِ راست تعلق کو واضح کرتی ہے۔

چھٹی آیت میں ایک اور اہم عبادت یعنی اللہ کے ذکر کی اس خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ اطمینانِ قلب کا ذریعہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے ذریعے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔“ (رعد:۲۸)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

اطمینان قلب ہمیشہ اللہ پر توکل، مادیات سے عدم تعلق اور دنیوی زیب و زینت، طمع، بخل اور حسد جیسی صفاتِ رذیلہ سے دوری میں مضمر ہے۔ اگر یہ صفات انسان کے دل میں موجود ہوں تو انسان کبھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ کا ذکر ان صفاتِ رذیلہ کو انسان کے دل سے دور کرنے میں گہرا اثر رکھتا ہے تاکہ انسان کا دل سکون کی دولت حاصل کر سکے۔

بالفاظ دیگر اگر ہم انسان کے دل میں موجود بے سکونی و اضطراب پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی اصل وجہ قلب میں موجود اخلاقی رذائل ہیں۔ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی جڑوں کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور بے اطمینانی کو اطمینان میں بدل دیتا ہے[1]۔

ساتویں آیت میں انسان کی روحانی قوت کے لیے نماز اور روزہ کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر (روزہ) کے ذریعے مدد طلب کرو، اس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ (بقرہ:۱۵۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳

بعض احادیث میں آیا ہے کہ اس آیت میں صبر سے مراد روزہ ہے۔ یہ درحقیقت صبر کے ایک مصداق کا ذکر ہے ورنہ صبر کا

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں جہاں اس کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔

مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت، اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں استقامت اور ناخوشگوار حوادث کے سامنے ثابت قدمی بھی شامل ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آپؑ نماز پڑھتے اور اس کے بعد آیہ شریفہ "واستعینوا بالصبر و الصلوۃ" کی تلاوت فرماتے۔

کان علی اذا احاله امر فزع قام الی الصلوة ثم تلاهذه الآیة واستعینوا بالصبر و الصلوة (اصول کافی بحوالہ المیزان،۱:۱۵۴)

یہ حدیث بھی اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ نماز انسان کو قوت بخشتی ہے۔

درحقیقت یہ عبادات انسان کے اندر توکل، شجاعت، ہمت اور صبر و استقامت جیسے فضائل پیدا کرتی ہیں اور خوف، بزدلی، تذبذب، بے چینی اور دنیا پرستی جیسے رذائل اخلاقی سے انسان کے دل کو پاک کر دیتی ہیں۔اس طرح انسان کے دل میں بہت سے اخلاقی فضائل زندہ ہوجاتے ہیں اور بہت سے اخلاقی رذائل کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

نتیجہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبادات مختلف پہلوؤں سے تہذیب اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اس تاثیر کے مختلف پہلوؤں کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اگر انسان اپنی زندگی میں خالق کائنات کی طرف توجہ رکھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کے بارے میں محتاط ہوجاتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنی خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ دنیا اللہ کی سلطنت ہے اور اللہ کی سلطنت میں اللہ کی نافرمانی بدترین ناشکری ہے۔

۲۔ عبادات خصوصاً دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ جلال و جمال بیان ہوئی ہیں، ان کا ذکر دعا کرنے والے کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ان صفات کا پرتو اس کے اندر منعکس ہوجائے اور وہ اخلاقی ترقی کی راہ پر پیشرفت کرنے لگتا ہے۔

۳۔ آخرت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم اور پرجلال عدالت کی طرف توجہ بھی انسان کی روح و جسم کی پاکیزگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

۴۔ اگر عبادات اور دعا قلبی توجہ اور آداب کے ہمراہ ہو تو انسان کے باطن میں ناقابل بیان نورانیت اور پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے جس کے سامنے رذائل اخلاقی کی قوت ٹوٹ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک لحظہ کے لیے حضورِ قلب کے ساتھ انجام دی گئی عبادت اور دعا کے بعد انسان اپنے آپ کو نیکیوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔

۵۔ عبادات اور دعاؤں کے معنی اخلاقی تعلیمات اور سیر و سلوک الی اللہ کے اسرار و رموز سے سرشار ہوتے ہیں۔اگر انسان ان میں غور و فکر کرے تو اسے عظیم درس ملتے ہیں۔خودسازی کے عاشق اور سالکانِ الی اللہ عبادات کے ذریعے اپنے اعلیٰ مقصد تک رسائی

حاصل کرسکتے ہیں۔عبادات، مناجات اور دعاؤں کے بغیر خاص طور پر عبادت اور ذکر وفکر سحر کے بغیر کوئی شخص کسی روحانی مقصد کو حاصل نہیں کرسکتا۔

پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ان تمام کا ذکر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔لہٰذا ہم ان کی طرف مختصر اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ وہ تمام احادیث جن میں فلسفہ احکام کو بیان کیا گیا ہے، ان سب میں دل کی پاکیزگی اور روحانی طہارت کے حصول میں عبادات کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرض الله الایمان تطهیرا من الشرك، و الصلوة تنزیها عن الکبر والزکاة تسبیبا للرزق، والصیام ابتلاء لاخلاص الخلق

”اللہ تعالیٰ نے ایمان کو، دلوں کو شرک سے پاک کرنے، نماز کو تکبر سے دوری کے لیے، زکوٰۃ کو وسعت رزق کے لیے اور روزہ کو بندوں میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے فرض کیا۔“

(نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۵۲)

۲۔ رسولؐ اللہ کی ایک مشہور حدیث میں نماز کو صاف وشفاف پانی کی نہر سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے گھر کے سامنے بہہ رہی ہو اور انسان ہر روز پانچ مرتبہ اس میں نہاتا ہو۔ظاہری بات ہے کہ ایسے شخص پر کسی قسم کی گندگی باقی نہیں رہ سکتی۔

اسی طرح احادیث میں ہر عبادت کے آثار ونتائج کا ذکر کیا گیا ہے جو تہذیب نفس پر عبادت کے اثرات کو بیان کرتی ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام عبادت کے آثار کے بارے میں فرماتے ہیں:

فان قال فلم تعبدهم؟ قیل لئلا یکونوا ناسین لذکره ولا تارکین لادبه ولا لاهین عن امره و نهیه، اذا کان فیه صلاحهم و قوامهم، فلو ترکوا بغیر تعبد، لطال علیهم الامد فقست قلوبهم

”اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ نے بندوں کو کیوں عبادت کا حکم دیا ہے؟ (یعنی ان کی عبادت کی اسے کیا ضرورت ہے؟) ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ نے اس لیے عبادت کا حکم دیا تا کہ لوگ اس کی یاد کو بھلا نہ دیں، اس کی بارگاہ کے ادب واحترام سے غافل نہ ہو جائیں۔اس کے اوامر ونواہی کو نظر

انداز نہ کریں، اس لئے کہ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ اگر لوگ عبادت کے بغیر چھوڑ دیئے جاتے تو ان پر غفلت کے طویل دورانیے آ جاتے اور ان کے دل سخت ہو جاتے۔''

(عیوان الاخبار الرضاؑ بحوالہ نور الثقلین، ۱:۳۹)

۴۔ ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام نماز کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مع مافیہ من الایجاب والمداومۃ علی ذکر اللہ عزوجل باللیل و النہار لئلا ینسی العبد سیدہ و مدبرہ و خالقہ، فیبطر و یطغی ویکون فی ذکرہ لربہ و قیامہ بین یدیہ زاجرا لہ عن المعاصی و مانعا لہ عن انواع الفساد

''عبادت کے سبب بندہ شب و روز اللہ تعالیٰ کا باقاعدگی سے ذکر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے آقا، مدبر اور خالق کو فراموش نہ کردے اور غرور و سرکشی میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اللہ کا ذکر اور اس کی بارگاہ میں کھڑے ہونا انسان کو گناہوں سے روکتا ہے اور مختلف قسم کی خرابیوں سے بچاتا ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۳:۴)

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نماز کے نتائج اور اس کی قبولیت کے پیمانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

من احب ان یعلم ان قبلت صلاتہ ام لم تقبل فلینظر ھل منعت صلاتہ عن الفحشاء و المنکر، فبقدر مامنعتہ قبلت

''جو شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں تو وہ یہ دیکھے کہ اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے یا نہیں؟ جس قدر اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے، اتنی ہی وہ قبول ہوئی ہے۔'' (مجمع البیان، ۸:۲۵۸)

یہ حدیث اس بات کو نہایت واضح طور پر بیان کر رہی ہے کہ صحیح نماز کا اخلاقی ارتقاء، برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی انجام دہی کے ساتھ براہِ راست اور قریبی تعلق ہے۔ جن کی نماز میں یہ اثر نہیں ہے، ان کی نماز ایک بے جان نماز کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسی نماز سے ادائے فرض کی خانہ پری تو ہو جاتی ہے مگر وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں روزے کا فلسفہ اس طرح بیان ہوا ہے:

ان الصوم یمیت مراد النفس و شھوۃ الطبع الحیوانی، وفیہ صفاء القلب و طھارۃ الجوارح و عمارۃ الظاھر و الباطن، والشکر علی النعم والاحسان الی

الفقراء، و زیادة التضرع والخشوع، والبکاء و جعل الالتجاء الی الله، و سبب انکسار الھمة، و تخفیف السیئات، وتضعیف الحسنات، و فیه من الفوائد مالا یحصی (بحارالانوار،۹۳:۲۵۴)

''روزہ ہوائے نفسانی اورخواہشاتِ حیوانی کو ماردیتا ہے۔ یہ قلب کی پاکیزگی اوراعضاء کی طہارت کا سامان فراہم کرتا ہے۔انسان کے ظاہروباطن کی آبادی کا سبب ہوتا ہے اورنعمتوں کا شکرادا کرنے، فقراء کے ساتھ نیکی واحسان، تضرع اور عاجزی، اللہ کی بارگاہ میں گریہ والتماس کا محرک ہوتا ہے۔ یہ ہمت گناہ کوتوڑتا ہے، گناہوں کوکم کرتا ہے، نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اوراس کے فوائد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔''

اس حدیث میں روزے کے چودہ مثبت اثرات کا ذکر کیا گیا ہے جواخلاقی فضائل واعمال کا ایک مجموعہ ہے۔

۷۔ ہم اس مفصل بحث کا خاتمہ امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک حدیث پر کرتے ہیں (جولوگ تفصیل کے خواہشمند ہوں، وہ وسائل الشیعہ اور بحارالانوار میں ہرعبارت کے شروع میں اس کی فضیلت کی احادیث کی طرف رجوع فرمائیں)۔امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

دوام العبادة برھان الظفر بالسعادة

''عبادت میں باقاعدگی اوراستمرارسعادت تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔''(غررالحکم:۷:۵۱۴)

بلاشبہ جولوگ سعادت کے طالب ہیں، انہیں اللہ کی عبادت، دعااورمناجات کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا احادیث عبادت اور پاکیزگی قلب وتہذیب نفس کے قریبی تعلق پرروشنی ڈالتی ہیں، خصوصاً عبادت جس قدر اخلاص اورحضورِقلب پایا جائے، اس کا یہ اثر اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔

اس بات کوبخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جب انسان اخلاص اورحضورِقلب سے عبادت کرتا ہے تواس کے بعد اپنے قلب و روح میں ایک خاص پاکیزگی اورنورانیت محسوس کرتا ہے۔اس کے اندرنیکی کا رجحان بڑھ جاتا ہے اوراس کی طبیعت گناہ اور برائی سے متنفرہوجاتی ہے۔وہ اپنے آپ کواللہ کے قریب محسوس کرتا ہے۔اس کے اندر بندگی اورتسلیم ورضا کا جذبہ بھی قوی ہوجاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ایک نتیجہ تمام عبادات میں مشترک ہے اوروہ ہے اللہ تعالیٰ کے حضورخشوع وخضوع اوراس کے لیے اخلاص وتسلیم، یادِالٰہی کا دل میں زندہ رہنا اورغفلت کا خاتمہ، اس کے علاوہ ہرعبادت کے اپنے مخصوص نتائج واثرات بھی

انسان کی روح پر مرتب ہوتے ہیں۔

ان کے مخصوص نتائج ان عبادات کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق رکھتے ہیں۔ نماز فحشاء ومنکرات سے روکتی ہے۔ روزہ قوتِ ارادی کو مضبوط کرتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کو عقل کے قابو میں دیتا ہے۔ حج انسان کو دنیا کی چکا چوند سے آزاد کرتا ہے اور زکوۃ بخل اور حرص سے نجات دیتی ہے۔

ذکرِ خدا اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔ ہر ذکر انسان کو اللہ کی کسی صفتِ جلال و جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا عکس اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس طرح جو شخص ان تمام عبادات کو انجام دیتا ہے، وہ ان کے مشترک اور عام اثر کے علاوہ ان کے مخصوص اثرات سے بھی فیضیاب ہوتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے اندر اخلاقی فضائل کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ بنابرایں ہماری عبادات اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا اور مناجات، خودسازی کا ایک موثر قدم ہوتی ہیں، بشرطیکہ ہم ان عبادات کی روح اور ان کی حکمتوں سے آگاہی رکھتے ہوں اور صرف ان کے ظاہری پہلو پر اکتفانہ کریں۔ ذکر خدا کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ہم مستقل عنوان کے تحت اس پر بحث کریں گے۔

اللہ کا ذکر اور پرورش روح

قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی روشنی میں علمائے اخلاق روح کی پاکیزگی اور تہذیب نفس کے معاملہ میں ذکر اللہ کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے سیر وسلوک کے تمام مراحل کے لیے مختلف اذکار کا ذکر کیا ہے، مثلاً مرحلہ توبہ میں ''یا غفار''، مرحلہ محاسبہ میں ''یا حسیب'' اور حصول رحمت الٰہی کے لیے ''یا رحمن'' اور ''یا رحیم'' کا ذکر تجویز کیا ہے۔

یہ اذکار مخصوص حالات اور سیر وسلوک کے مراحل کے علاوہ بھی، ذکر اللہ کی حیثیت سے ہر حال میں اچھے اور مفید ہیں۔ اللہ کا ذکر بلاشبہ بہت بڑی عبادت ہے جو نفس اور شیطان کے وسوسوں کے مقابلہ میں انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

خود پسندی اور غرور انسان کی سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اللہ کا ذکر ان رکاوٹوں کو برطرف کرتا ہے۔ انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور اسے ان خطرات سے آگاہ کرتا ہے جو اس کی سعادت کو لاحق ہو سکتے ہیں۔

اللہ کا ذکر بارش کے حیات افروز قطروں کی مانند انسان کے قلب وروح کی سرزمین کو فضیلت وتقویٰ کے گلستان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس عبادت کی اہمیت کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، کم ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی روشنی میں اللہ کے ذکر کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

''(اہل بیتؑ) وہ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

آگاہ رہو کہ دلوں کو اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۲۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (عنکبوت:۴۵)

''اورنماز قائم کرو، بے شک نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔''

۳۔ اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴ (طٰہٰ:۱۴)

''بلاشبہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

۴۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝۴۲

''تم اور تمہارا بھائی میری آیات کے ساتھ جاؤ اور میری یاد کے بارے میں کوتاہی نہ کرو۔'' (طٰہٰ:۴۲)

۵۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

''اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔'' (طٰہٰ:۱۲۴)

۶۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، صرف اس کی توجہ و عنایت کے طالب ہوتے ہیں۔ تم دنیوی زندگی کی زیب و زینت کے لیے ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی اتباع نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ گیا اور حد سے بڑھ گیا۔'' (کہف:۲۸)

۷۔ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹ (نجم:۲۹)

''جو ہماری یاد سے منہ موڑے ہوئے ہے اور دنیوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، اس سے منہ پھیر لو۔''

۸۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝۴۱ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۴۲ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝۴۳ (احزاب:۴۱ تا ۴۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ وہی جو تم پر

رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے آئے اور وہ مومنین پر رحیم ہے۔''

۹۔ اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ (مائدہ:۹۱)

''شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے۔''

۱۰۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ (نور:۳۷)

''ایسے مرد جنہیں تجارت اور خرید و فروش اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔''

تفسیر و نتیجہ

پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی یاد کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کے دل کو اس سے اطمینان ملتا ہے۔ اس سے مراد وہ اطمینان ہوتا ہے جو انسان کو لغزشوں اور خطاؤں سے آزادی دلائے اور اسے اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ذکر کی بدولت ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ

اس کے بعد عام ضابطہ بیان کر دیا گیا کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے:

اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ۝۲۸

اس غیر معمولی اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی پریشانی یا اضطراب کا سبب مبہم مستقبل ہوتا ہے یا تلخ ماضی۔ بالفاظ دیگر مستقبل میں رونما ہونے والے نامعلوم حوادث کا خوف یا ماضی میں رونما ہونے والے حوادث کی تلخ یادیں انسان کا آرام و اطمینان تباہ کر دیتی ہیں اور انہی کے سائے بھوت بن کر انسان کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو نہ صرف تمام انسانوں بلکہ ساری کائنات کا سخی و کریم، رحمن و رحیم اور خالق و رازق رب ہے، جو ہر مشکل کو آسان کرنے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے اور پیچیدہ ترین مشکلات اس کے ارادے کے سامنے بالکل سادہ ہیں، اس رحمن و رحیم رب کا ذکر اور اس کی یاد انسان کو ان تمام پریشانیوں اور اضطرابات سے نجات دیتی ہے۔ انسان کے اندر اخلاقی فضائل کی پرورش کی راہ ہموار کرتی ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد کے ذریعے اطمینان کی دولت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۝۲۷ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ۝۲۸ فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ ۝۲۹

وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾ (فجر: ۲۷ تا ۳۰)

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف واپس آ جا، تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے، پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دوسری آیت میں پہلے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز انسان کو فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے۔ اس کے بعد کہا گیا:

"ولذکر اللہ اکبر" یعنی ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی بات ہے۔''

بلاشبہ اللہ کا ذکر نماز کی روح ہے جبکہ روح کسی چیز کا اشرف ترین جزو ہوتا ہے۔ اگر نماز فحشاء و منکرات سے روکتی ہے تو اس کی وجہ اللہ کا ذکر ہی ہے، اس لئے کہ اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور نعمتوں کی یاد انسان کو ان نعمتوں کے بخشنے والے کی نافرمانی سے روکتی ہے اور وہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ کا ذکر انسان کو قیامت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان اور پر جلال عدالت کی یاد دلاتا ہے، انسان کو ملائکہ عذاب اور ملائکہ رحمت کی یاد دلاتا ہے جو بدکاروں کو سزا دینے اور نیکوکاروں کی پذیرائی اور استقبال پر مامور کئے جائیں گے۔ یہ چیز بھی انسان کو گناہ سے باز رکھنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے "ولذکر اللہ اکبر" کے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اس جملے کی رو سے ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے۔''

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ''ذکر اللہ'' سے مراد وہ ذکر ہے جو اللہ اپنے بندے کا کرتا ہے۔ یعنی جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو جواباً اللہ تعالیٰ بھی اس کا ذکر کرتا ہوے۔ (محجۃ البیضاء، ۲:۲۶۶)

اللہ کا یہ ذکر انسان کو عبودیت اور بندگی کے اعلیٰ درجات کی طرف مائل اور راغب کرتا ہے اور یہ ذکر ہر چیز سے افضل اور برتر ہوتا ہے۔ لیکن پہلے معنی اور آیت کے درمیان زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہونے والی وحی کا ذکر ہے جس میں انہوں نے سرزمین طور پر ایک درخت کے قریب اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنا:

''میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾

اس آیت میں اللہ کی یاد کو نماز کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔ پہلی وحی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس سے اللہ کے ذکر کی غیر معمولی اہمیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ توحید کے ذکر کے فوراً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا ذکر کرنا اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون سے خطاب کیا گیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ

السلام کو مبعوث کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ تم اور تمہارا بھائی فرعون کی طرف جاؤ اور میرے ذکر کے بارے میں کوتاہی نہ کرو:

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾

اللہ کے ذکر کا حکم اور وہ بھی فرعون جیسے جابر و سرکش کے خلاف، جنگ کے وقت، بہت پر معنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کو باطل کے خلاف جنگ میں کس قدر قوت، طاقت اور شجاعت عطا کرتا ہے۔

تفسیر فی ظلال میں اس آیت کی تشریح میں کہا گیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون سے کہا کہ میرا ذکر تمہارا ہتھیار اور اسلحہ ہے اور ایسا سہارا ہے جس پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔'' (فی ظلال القرآن، ۵: ۴۷۴)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے مراد پیامِ رسالت کی تبلیغ ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی یاد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تشریحات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جب اللہ کا رسولؑ، اللہ کے ذکر میں مشغول ہو اور اس سے روحانی طاقت حاصل کر رہا ہو تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ زیادہ موثر طور پر کر سکے گا۔

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنے کے بعض آثار و نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو کوئی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی سخت اور تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے نابینا محشور کریں گے۔''

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

ان لوگوں کی دنیوی سزا تنگ اور سخت زندگی اور اخروی سزا یہ ہے کہ وہ اندھے محشور ہوں گے۔

زندگی کی تنگی بعض اوقات اقتصادی مشکلات کی صورت میں ہوتی ہے اور بعض اوقات مال و دولت کی فراوانی کے باوجود بخل، حرص اور طمع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ایسا انسان کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کے دروازے کھلے ہوں اور لوگ اس کی زندگی اور اس کے مال و دولت سے استفادہ کریں۔ ایسا شخص فقراء اور مساکین کو ان نعمتوں میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کر رکھی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دولت مند بخیل دنیا میں فقراء جیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں حساب دولت مندوں کی طرح دیں گے۔ (بحار الانوار، ۶۹: ۱۱۹)

يعيش في الدنيا عيش الفقراء ويحاسب في الآخرة حساب الأغنياء

اللہ کی یاد سے غافل دولت مندوں کی اکثریت کا یہی حال ہوتا ہے۔ ان کا بخل اور ان کی طمع ہر وقت ایک آگ بن کر ان کی زندگی کو سلگاتی رہتی ہے۔ مال و دولت کی فراوانی کے باوجود انہیں آرام و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

آخرت میں اندھا محشور ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس دنیا کے حقائق اور اس دنیا کے حقائق کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی

ہے۔ اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والے ان حقائق کو اور آیات حق کو دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں ہر طرف موجود ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اندھے پیش کئے جائیں گے۔

چھٹی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی پیروی سے اجتناب کریں جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ رہیں جو صبح و شام اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ان لوگوں کے ساتھ رہو جو صبح و شام اللہ کو پکارتے ہیں اور صرف اس کی توجہ اور عنایت کے طالب ہیں۔ دنیا کی زیب و زینت کی خاطر ہرگز ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی پیروی نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔''

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾

واضح سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بلاوجہ یہ سزا نہیں دے سکتا کہ اس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دے۔ یہ سزا درحقیقت ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حق سے دشمنی کی راہ کو اپنایا اور تکبر، ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید کی بنیاد پر حق سے دشمنی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے اعمال کی سزا کے طور پر غفلت کو ان کے دلوں پر مسلط کر دیا ہے۔ لہٰذا اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

یہ غافل افراد ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اعمال افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو آیت کے اختتام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾

اس آیت سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے غافل ہونا انسان کے اخلاق پر منفی اثرات ڈالتا ہے اور اسے ہوس پرستی اور افراط و تفریط کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی روح میں ''اللہ'' یا ''ہوائے نفس'' میں سے کوئی ایک ہی اپنا گھر بنا سکتا ہے۔ ان دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔ نفس پرستی اور اتباع ہوائے نفس انسان کو اللہ اور اللہ کی مخلوق سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ کی یاد سے غفلت انسان کو اخلاقی اصولوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

ساتویں آیت میں بھی روئے سخن رسول اللہؐ کی طرف ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ان لوگوں سے منہ موڑنے کا حکم دے رہا ہے جو

اللہ کی یاد سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری یاد سے منہ موڑا اور صرف دنیوی زندگی کے طلبگار رہیں،ان سے منہ موڑلو۔''

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۲۹﴾

اس آیت میں ''اللہ کے ذکر'' کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن شریف ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس سے عقل اور منطقی دلائل مراد ہیں جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایمان ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''اللہ کا ذکر'' ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔

بعض نے یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ترک جہاد کی دعوت دے رہی ہے۔لہٰذا آیاتِ جہاد نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا ہے، حالانکہ یہ آیت کسی چیز کو منسوخ نہیں کر رہی ہے بلکہ صرف ان لوگوں کی ہم نشینی کو ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل ہیں۔

اس آیت میں ''دنیا پرستی'' اور ''ترک ذکر خدا'' کا باہمی تعلق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اس طرح اللہ کے ذکر کا اخلاقی فضائل کی پرورش میں اور ترک ذکر کا رذائل اخلاق کی پرورش میں کردار کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے انہیں اللہ کے ذکر کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور اس کا تاریکیوں سے نکلنے اور نور میں داخل ہونے سے تعلق بیان کیا جا رہا ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں جہل، شرک اور گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، توحید اور تقویٰ کے نور کی طرف تمہاری رہنمائی کرے اور وہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوا اللّٰهَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوۡهُ بُکۡرَۃً وَّاَصِیۡلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَکَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ﴿۴۳﴾

یہ بات قابل غور ہے کہ اہل ایمان کو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے اور صبح وشام اس کی تسبیح کرنے کا حکم دینے کے بعد اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان تاریکیوں سے نکل کر نور میں آ جاتا ہے۔اس سے ہمارا یہی موقف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی تاریکیوں کو دور کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے اور اسے بتدریج اخلاقی فضائل سے آراستہ کر دیتا ہے۔

تفسیر المیز ان میں ہے کہ یہ آیت ''ذکر کثیر'' کی علت کو بیان کر رہی ہے۔(المیز ان،۶:۳۲۹)

اس آیت میں ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر مراد ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد تسبیحات اربعہ کو تیس دفعہ پڑھنا یا تسبیح حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا پڑھنا مراد ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ نے جو بھی حکم دیا ہے، اس کی حدود مقرر ہیں اور حالت عذر میں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔لیکن اللہ کا ذکر ایسا فریضہ ہے جس کی نہ تو کوئی حد مقرر کی گئی ہے اور نہ ہی کسی عذر کی وجہ سے ساقط ہو سکتا ہے۔

بہرحال ذکر کثیر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور مندرجہ بالا تمام امور اس کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

اس آیت میں جن ''ظلمات'' اور جس ''نور'' کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی بھی مختلف تشریحات کی گئی ہیں۔کسی نے کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مادیات کی تاریکیوں سے نکل کر روحانیت کی دنیا میں آنا ہے اور کسی نے معصیت کی تاریکیوں سے نکل کر اطاعت کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان معنی میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب باہم مراد ہو سکتے ہیں۔اس کے علاوہ رذائل اخلاق کی تاریکیوں سے نکل کر فضائل اخلاق کی روشنی میں آنا بھی اس میں داخل ہے اور یہ ذکر الٰہی کا سب سے اہم نتیجہ ہے۔

نویں آیت میں شراب اور جوئے کی آلائش کے برے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔تو کیا (ان نقصانات کے باوجود) تم ان کو ترک کرو گے؟''

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝﴿٩١﴾

اس آیت میں شراب اور جوئے کے تین نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے۔دشمنی اور عداوت کا وجود میں آنا، اللہ کے ذکر سے روکنا اور نماز سے روکنا۔چونکہ باہمی دوستی ومحبت، اللہ کا ذکر اور نماز عظیم سرمایہ ہیں، اس لیے ان سے محرومیت بہت بڑا نقصان ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے لب ولہجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے ترک کر دینے اور بغض و عداوت اور دیگر اخلاقی خرابیوں کی پیدائش میں گہرا تعلق ہے۔

دسویں اور آخری آیت جو کہ آیہ نور کے بعد کی آیت ہے، اس میں ان عظیم الشان الٰہی انسانوں کا ذکر ہے جو ان گھروں کے مکین ہیں جو انوارِ الٰہیہ کے مرکز ہیں۔ان عظیم الشان افراد کی خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا جا رہا ہے:

''یہ نورِ الٰہی ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا جائے۔ ایسے گھر جن میں صبح و شام ایسے افراد اللہ کے نام کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، جنہیں کوئی تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر سکتے۔''

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝
رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

(نور:۳۶،۳۷)

اس طرح نورِ الٰہی کے محافظ ان عظیم انسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیوی امور انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔ یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی ان کا عظیم ترین افتخار اور اعزاز ہے۔ اس کے بعد ان کی دوسری صفات یعنی نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

نتیجہ

ذکر کے بارے میں قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند آیات کو زیر بحث قرار دیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کا ذکر باعث اطمینانِ قلب ہے۔ یہ فحشاء اور منکرات سے باز رکھتا ہے، دشمنانِ حق کے مقابلہ میں انسان کو طاقت اور ہمت دیتا ہے اور بخل، حرص، دنیا پرستی اور دیگر اخلاقی رذائل سے انسان کو پاک کرتا ہے۔

رہروانِ راہِ حق، سالکانِ الی اللہ اور وہ تمام افراد جو تہذیب اخلاق میں مشغول ہیں، ان پر لازم ہے کہ اس کیمیائے سعادت اور اکسیر خوش بختی سے غفلت نہ کریں۔ انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نشیب و فراز اور خطرات سے بھرپور اس راستے پر جو چیز انسان کو ہمت اور قوت دیتی ہے، وہ اللہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ذکرِ الٰہی انسان کی زندگی کے مستقل معمولات کا حصہ بن جائے۔

ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اللہ کے ذکر کی اہمیت اس قدر وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے کہ اس مختصر بحث میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت جو بات ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ تہذیب نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ایک اہم عامل اور محرک کے طور پر اللہ کے ذکر کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ اس سلسلہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے بہت احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں اس گلستان کے چند پھول پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات پر مشتمل ہیں اور یہ سب

تصنیف دررالحکم سے لی گئی ہیں:

۱۔ من عمر قلبہ بدوام الذکر حسنت افعالہ فی السر و الجھر

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دائمی ذکر سے اپنے دل کو آباد کرلیا، اس کے ظاہری و باطنی اعمال اچھے ہو جاتے ہیں۔''

۲۔ مداومۃ الذکر قوت الارواح ومفتاح الصلاح

''ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا روح کی قوت اور کامیابی کی کنجی ہے۔''

۳۔ اصل صلاح القلب اشتغالہ بذکر اللہ

''اصلاحِ قلب (اور تہذیب نفس) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر میں مشغول رہے۔''

۴۔ ذکر اللہ دواء اعلال النفوس

''اللہ کا ذکر نفس کی بیماریوں کی دوا ہے۔''

۵۔ ذکر اللہ رأس مال کل مومن، وربحہ السلامۃ من الشیطان

''اللہ کا ذکر ہر مومن کا سرمایہ ہے جس کا نفع شیطانی وسوسوں سے نجات ہے۔''

۶۔ الذکر جلاء البصائر و نور السرائر

''اللہ کا ذکر بصیرت کی روشنی اور باطن کا نور ہے۔''

۷۔ من ذکر اللہ سبحانہ احی اللہ قلبہ و نور عقلہ ولبہ

''جو اللہ کا ذکر کرتا ہے، اللہ اس کے دل کو زندہ اور اس کی عقل اور شعور کو منور کرتا ہے۔''

۸۔ استدیموا الذکر فانہ ینیر القلب، وھو افضل العبادۃ

''اللہ کا ذکر ہمیشہ کیا کرو، یہ دل کو نورانی کرتا ہے اور سب سے افضل عبادت ہے۔''

۹۔ اذکروا اللہ ذکر اخالصا تحیوا بہ افضل الحیاۃ وتسلکوا بہ طرق النجاۃ

(میزان الحکمہ، ۲:۹۶۹)

''اخلاص کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو تاکہ سب سے افضل زندگی حاصل کرسکو اور نجات کی راہوں پر چل سکو۔''

۱۰۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اپنے معروف وصیت نامہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اوصيك بتقوى الله يابنى! ولزوم امره وعمارة قلبك بذكره

''اے فرزند! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے احکامات کی پابندی کرو اور اپنے دل کو اس کے ذکر سے آباد کرو۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

۱۱۔ غررالحکم میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے،

ذكر الله مطردة للشيطان

''اللہ کا ذکر شیطان کو دور بھگانے کا ذریعہ ہے۔''

۱۲۔ حسن اختتام کے طور پر ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر تمام کرتے ہیں:

ذكر الله شفاء القلوب

''اللہ کا ذکر دلوں کی شفا ہے۔'' (کنزالعمال، حدیث: ۱۷۵۱)

مندرجہ بالا بارہ احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے ذکر اور تہذیب نفس میں گہرا اور قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ اللہ کا ذکر قلب کو نورانیت بخشتا ہے، تکبر، غرور، غفلت، حسد اور بخل جیسی بیماریوں کو دل سے دور کرتا ہے۔ اللہ کا ذکر شیطان کو دل سے دور کرتا ہے اور انسان کے دل کو ہر قسم کی آلائشات سے پاک کرکے صاف وشفاف کردیتا ہے۔

علم اخلاق کے بعض علمائے بزرگ کا کہنا ہے کہ انسان کا دل کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ اللہ کے ذکر سے پر ہو تو شیطانی وسوسے اس سے دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو شیاطین کی جولانگاہ اور اس کے وسوسوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالی کی ذات تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ذکر کے ذریعے انسان سرچشمہ کمالات کے قریب ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رذائل اخلاقی جو حقیقت میں نقائص ہیں، اس سے دور ہوجاتے ہیں۔

لہٰذا رہروانِ سلوک الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر وقت اللہ کے ذکر کی حالت میں رہیں، اس لئے کہ یہ شیطانی طاقتوں کے خلاف ایک تیز شمشیر ہے، قرب حق کی منزل تک لے جانے والا طاقتور مرکب ہے اور راستے کی تاریکیوں کو دور کرنے والا ضوفشاں چراغ ہے۔ ذکر خدا کی بدولت انسان اس مشکل سفر کو تیزی سے طے کرتا ہے اور کمالاتِ انسانی وفضائل اخلاقی تک پہنچنے کی راہوں کو روشن اور ہموار کرتا ہے۔

اس بحث کے اختتام پر تین نکات کا ذکر ضروری ہے:

ا۔ حقیقت ذکر

لغت کی مشہور کتاب ''مفرداتِ راغب'' میں ذکر کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک کسی چیز کو ذہن میں حاضر کرنا اور

دوسرے معارف وعقائد حقہ کو اپنے قلب وذہن میں محفوظ رکھنا۔

بزرگانِ علم اخلاق کا کہنا ہے کہ اللہ کا ذکر صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کا نام اپنی زبان پر جاری کرلے اور مسلسل تسبیح وتہلیل وتکبیر کہتا رہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے اللہ تعالی کی عظمت کی طرف متوجہ رہے اور اسے ہر جگہ حاضر وناظر سمجھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کا ذکر تمام نیکیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور انسان کو گناہ سے بچانے کے لیے ایک مضبوط دیوار کا کردار ادا کرتا ہے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو انجام دینے کی طاقت اس امت میں نہیں ہے: برادرانِ دینی کے ساتھ مالی ایثار سے پیش آنا، لوگوں کو ان کا حق دینا اور ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

ولیس هو سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله اكبر و لكن اذاورد على مايحرم عليه خاف الله عزوجل عنده و تتركه

یعنی ذکر سے مراد صرف سبحان اللہ و............کہنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب فعل حرام کا موقع سامنے آئے تو انسان اللہ سے ڈر کر اسے ترک کردے۔'' (بحارالانوار، ۹۰:۱۵۱)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الذكر ذكران: ذكر عندالمصيبة حسن جميل و افضل من ذلك ذكر الله عندماحرم الله عليك فيكون ذالك حاجزا

''ذکر کی دو اقسام ہیں: مصیبت کے وقت اللہ کو یاد کرنا (اور مصیبت پر صبر کرنا) اچھا عمل ہے مگر اس سے افضل اللہ کا ذکر ہے جو فعل حرام کے وقت تمہیں فعل حرام سے روک دے۔''

(بحارالانوار، ۷۵:۵۵)

مندرجہ بالا مطالب سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کا واقعی ذکر وہ ہے جو انسان کے وجود کی گہرائیوں پر اثر انداز ہو، انسان کی روح کی پرورش کرے اور اسے اللہ کی راہ کی طرف دعوت دے۔

جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہو اور شیطان کی راہ پر چلتا ہو، درحقیقت وہ اللہ کے ذکر میں مخلص نہیں ہوتا۔ حضرت امام رضا علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من ذكر الله ولم يستبق الى لقائه فقد استهزء بنفسه

''جوشخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اوراس کی ملاقات کے لیے آگے نہیں بڑھتا (آخرت کے لئے اعمالِ صالحہ نہیں کرتا) وہ اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہا ہوتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۵:۳۵۶)

۲۔ درجاتِ ذکر

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے ذکر کے کئی درجات بیان کئے ہیں:

پہلا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا پہلا مرحلہ لفظی ذکر ہے۔ اس میں انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ جلال و جمال کا ذکر کرتا ہے اور عام طور پر ان کے مفہوم اور معنی سے بے خبر ہوتا ہے۔ جس طرح بہت سے نمازی دورانِ نماز، نماز کے معنی و مفاہیم کو سمجھے بغیر صرف زبان سے اذکارِ نماز کو ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ذکر کا یہ مرحلہ درحقیقت ذکر کے اعلیٰ درجات کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہوتا ہے اور اس میں معنی کی مختصر آگاہی بھی ذکر کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ذکر انسان کی تربیت اخلاق اور تزکیہ نفس میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کرتا۔

دوسرا مرحلہ

اللہ تعالیٰ کے ذکر کا دوسرا مرحلہ ذکر معنوی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان ذکر لفظی کر رہا ہو تو معنی کی طرف بھی متوجہ ہو۔ ظاہری سی بات ہے کہ معنی کی طرف توجہ کے ساتھ جو ذکر کیا جاتا ہے، وہ انسان پر زیادہ بہتر انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر انسان باقاعدگی کے ساتھ ایسا ذکر کرے تو وہ اس کے اثرات کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

تیسرا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا تیسرا مرحلہ قلبی ذکر کا مرحلہ ہے۔ اس کی تفسیر میں علماء نے کہا ہے کہ قلبی ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ انسان کے دل میں سے اٹھے اور پھر اس کی زبان پر جاری ہو جائے، مثلاً جب وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرتا ہے، کائنات پر حاکم نظم کو جب دیکھتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس توجہ کے بعد جب وہ کہتا ہے:

العظمۃ للہ الواحد القهار

''ساری عظمت اللہ کے لیے ہے جو واحد اور قہار ہے۔''

تو یہ ذکر دل کی گہرائی سے اٹھنے والا ذکر ہوتا ہے اور درحقیقت انسان کی قلبی کیفیت کا عکاس ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی زبان پر کوئی لفظ جاری ہوئے بغیر اذکارِ الٰہی میں سے کسی ایک کے معنی و مفہوم دل

میں جگمگانے لگتے ہیں جیسے "یا سبوح و یاقدوس اور سبحانك اللھم لا الہ انت۔"

یہ قلبی اذکار تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس میں غیر معمولی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ذکر فرشتوں کے ذکر کی مانند ہوتا ہے کہ جب انہوں نے اسمائے الٰہیہ کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے علم کی وسعتوں کو دیکھا تو بے اختیار بول اٹھے:

سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم

"اے اللہ! تو ہر عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے، جو کچھ تو نے ہمیں تعلیم دیا ہے، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، بے شک تو علم و حکمت والا ہے۔"

قرآن مجید میں ذکر کے درجات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝٨

"اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور ہر چیز سے منہ موڑ کر اس سے لو لگا۔" (مزمل:۸)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٢٠٥

"اپنے دل میں تضرع اور خوف کے ساتھ، بغیر آواز بلند کئے صبح و شام اللہ کا ذکر کرو اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔" (اعراف:۲۰۵)

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں گہرے ذکر لفظی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور "تتبل الیه" یعنی "ہر چیز سے منہ موڑ کر اللہ سے لو لگانے" پر بات کا اختتام کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ذکر قلبی کا تذکرہ کیا گیا ہے جو تضرع اور خوف خدا کے ساتھ ہونا چاہئے اور دل سے اٹھنے والے ذکر مخفی پر بات کو ختم کیا گیا ہے۔

ذکر کی رکاوٹیں

ذکر لفظی کی راہ میں کوئی بڑی اور قابل ذکر رکاوٹیں موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ انسان جب چاہے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات جلال و جمال کا زبان سے ذکر کر سکتا ہے۔ ہاں! اگر انسان دنیا میں اس قدر غرق ہو جائے کہ اس کے لیے ذکر لفظی کی بھی مجال باقی نہ رہے تو یہ اور معاملہ ہے۔

لیکن ذکر قلبی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں جن میں سے سب سے بڑی رکاوٹ انسان کی اپنی طرف سے ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور خود ہم سے بڑھ کر ہمارے قریب ہے، جیسا کہ اس آیہ شریفہ میں ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴿۱۶﴾

''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''(ق:۱۶)

حضرت علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں ہے:

ما رأیت شیئا الا و رایت الله قبله و بعده و معه

''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے پہلے، جس کے بعد اور جس کے ساتھ اللہ کو نہ دیکھا ہو۔''

(کسی چیز سے پہلے اللہ کو دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا خالق ہے، کسی چیز کے بعد دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز فنا ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی اور کسی چیز کے ساتھ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا حافظ اور اس کا قائم رکھنے والا ہے)۔

مگر اس کے باوجود انسان کے برے اعمال اور اس کی شیطانی صفات اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ بن جاتی ہیں اور وہ اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے۔

دعائے ابوحمزہ ثمالی میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانك لا تحتجب عن خلقك الا ان تحجبهم الاعمال دونك

''تو ہرگز اپنی مخلوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ان کے اعمال ہیں جو تیرے اور ان کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ خود پرستی اور حب ذات کا حجاب سب سے بڑا حجاب ہے جو ایک قسم کا شرک ہے اور حقیقی توحید کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ما الھی من ذکر الله فهو من ابلیس (میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ ابلیس کی طرف سے ہوتی ہے۔''

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ما الھی عن ذکر الله فهو من المیسر

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ جوا ہے۔''(میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں جوئے کو شرک کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔(مائدہ:۹۰)

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں،

آپؐ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا:(منافقون:۹)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے اموال واولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں۔''

آپؐ نے فرمایا:

هم عباد من امتي الصالحون منهم، لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله وعن الصلوة المفروضة الخمس

''یہ میری امت کے صالح افراد ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور پنجگانہ نمازوں سے غافل نہیں کرتے۔''(میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

تیرھواں باب

نمونہ ہائے عمل

اشارہ

ہرانسان اپنی زندگی میں ایسے افراد کی پیروی کرتا ہے جنہیں وہ اپنے لئے نمونہ، اسوہ اور پیشوا سمجھتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کردار کے لحاظ سے ان کے قریب کرے اوران کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔

بالفاظِ دیگر ہرانسان کے دل اور جان میں پیشوا اور ہیرو کا ایک خانہ ہوتا ہے۔اسی وجہ سے تاریخ میں ہرقوم کے حقیقی یا فرضی ہیرو اور پیشواؤں کی ایک تعداد ہمیں نظر آتی ہے جن کی شخصیت ان کی تاریخ اور ثقافت کے ایک نمایاں حصے کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ اپنی محافل ومجالس میں ان کا ذکر کرتے ہیں، ان کی تعریف کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ صفات وخصوصیات کے لحاظ سے اپنے آپ کو ان کے قریب کرسکیں۔

اس کے علاوہ قانونِ محاکات (دوسروں جیسا بننا، خاص طور پر عظیم شخصیات کی مانند بننے کی کوشش کرنا) نفسیات کا ایک مسلم قانون ہے۔اس قانون کے مطابق انسان اپنے اندر دوسروں کی طرف، خصوصاً ہیرو کی طرف جذب ہونے کی ایک کشش محسوس کرتا ہے۔اسی وجہ سے ان کے اعمال وصفات کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

جن افراد پر انسان ایمان رکھتا ہو، ان کی طرف کھینچنے والی کشش اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے اسلام میں تولیٰ اور تبریٰ کے نام سے دواہم اصول پائے جاتے ہیں جنہیں دوسرے الفاظ میں "الحب فی اللہ" (اللہ کے لیے محبت) اور "البغض فی اللہ" (اللہ کے لیے دشمنی) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ان دواصولوں کی بنیاد پر ہم سب پر فرض ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی کریں اور پیشوایانِ دینی یعنی رسول اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو زندگی کے ہرمعاملہ میں اپنے لئے رہنما اور نمونۂ عمل قرار دیں۔

یہ حکم اس قدر اہم ہے کہ قرآنی آیات اسے ایمان کی نشانی اور احادیث میں اسے ایمان کا مضبوط ترین سہارا (اوثق عری الایمان) قرار دیا گیا ہے۔ جب تک تولیٰ اور تبریٰ نہ ہوں، انسان کے باقی تمام اعمال اور عبادات واطاعات بے نتیجہ اور بے ثمر ہو جاتے ہیں۔ہم اس بارے میں آیات واحادیث کو زیر بحث لائیں گے۔

یہ تولیٰ اور تبریٰ یا بعبارتِ دیگر "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ"، تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

اسی بنیاد پر بہت سے علمائے اخلاق نے رہروانِ راہ حق اور سالکانِ الی اللہ کے لیے مربی اور استاد کے وجود کو لازم قرار دیا

ہے۔اس سلسلہ میں ہم تولی وتبری سے متعلق آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫

”تمہارے لئے ابراہیمؑ اوران کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بیزار ہیں۔“(ممتحنہ:۴)

۲۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶

”تم میں سے جولوگ اللہ اورروزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں، ان کے لیے ان میں اسوۂ حسنہ ہے، جو روگردانی کرے گا تو اللہ غنی وحمید ہے۔“(ممتحنہ:۶)

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱

”یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک اچھا نمونہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔“(احزاب:۲۱)

۴۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۲۲

”آپ کوئی ایسی قوم نہیں دیکھیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے محبت کریں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا برادری سے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی مدد کی۔ وہ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کردے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ کی جماعت ہی

فلاح پانے والی ہے۔'' (مجادلہ:۲۲)

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (ممتحنہ:۱۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔''

۶۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

''مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں، وہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا اور بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔'' (توبہ:۷۱)

۷۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے ولی شیطان ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (بقرہ:۲۵۷)

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' (توبہ:۱۱۹)

تفسیر اور نتیجہ

سورۂ ممتحنہ کی آیات سے یہ بات بخوبی نظر آتی ہے کہ بعض نومسلم افراد کے کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل حاطب ابن ابی بلتعہ نام کے ایک صحابی نے سارہ نامی ایک عورت کے ہاتھ اہل مکہ کو ایک خفیہ خط بھیجا کہ رسولؐ اللہ مکہ پر حملہ کرنے اور مکہ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم اپنے دفاع کا انتظام کرلو۔

رسولؐ اللہ کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ اہل مکہ کو ان کے اس حملے کی خبر نہ ہو سکے تاکہ وہ کسی قسم کا مقابلہ نہ کرسکیں اور جنگ میں

خونریزی کم از کم ہو۔اس عورت نے خط اپنے بالوں میں چھپایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر رسولؐ اللہ کو اس واقعہ کی خبر دی۔آپؐ نے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا۔پہلے تو اس عورت نے خط کا انکار کیا مگر جب حضرت علی علیہ السلام نے سخت اقدام کی دھمکی دی تو اس نے خط نکال کر انؑ کے حوالے کر دیا۔حضرت علی علیہ السلام یہ خط لے کر رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی سخت سرزنش کی گئی۔اس نے اپنی اس حرکت پر اپنا عذر پیش کیا جو بظاہر آنحضرتؐ نے قبول فرما لیا اس کے بعد سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں اس عمل پر سرزنش کی گئی تاکہ مستقبل میں اس عمل کا سد باب کیا جا سکے۔ان آیات نے ایک اہم اسلامی اصول یعنی ''نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی اقتداء اور بدکاروں اور دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کے اصول'' کو واضح کر دیا جسے دوسرے الفاظ میں "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" کہا جاتا ہے۔

اس سورت کے آغاز میں تمام مومنین کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

''اے اہل ایمان! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ،تم ان سے دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہو جبکہ وہ اس وحی کا انکار کرتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی ہے اور انہوں نے اللہ کے رسولؐ اور تم کو اس لئے تمہارے شہر سے جلاوطن کیا کہ تم ایمان لائے۔'' (ممتحنہ:۱)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ ۙ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ۙ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ ۙ

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ اگر دوستانہ تعلقات اور ایمانی تعلقات کے باہمی ٹکراؤ کی حالت میں دوستانہ تعلقات کو ایمانی تعلقات پر مقدم رکھا جائے تو ایمان وعقیدہ کی بنیادیں سست اور متزلزل ہو جاتی ہیں اور انسان بتدریج باطل کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔"الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ"، یا اللہ کے دوستوں سے تولّی اور اللہ کے دشمنوں سے تبرّی کا راز بھی یہی ہے۔

اس کے بعد اس سورت کی چوتھی آیت میں تمام مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے،انہیں اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ اور خوبصورت نمونہ عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے:

''ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لئے اچھا نمونہ عمل ہے۔جب انہوں نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہیں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کو پوجتے ہو۔''

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۖ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۙ

''اسوہ'' اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو دوسروں کے پیروی کرنے سے حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر اس سے مراد اقتداء کرنا اور پیروی کرنا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اسوہ ہونے والی خصوصیت اچھے کاموں میں بھی ہوسکتی ہے اور برے کاموں میں بھی۔ اسی لئے اس آیت میں اسوَہ کے ساتھ حسنہ کی صفت بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی ابراہیمؑ اوران کے ساتھی تمہارے لئے اچھا نمونۂ عمل ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ظاہری اور مادی تعلقات کو ایمانی تعلقات پر قربان کر دیا۔

دوسری آیت میں مذکورہ بالا آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے اور ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اوران کے ساتھیوں کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے:

> ''تم مسلمانوں کے لیے ان کی زندگی میں اچھا نمونۂ عمل ہے۔ یہ نمونۂ عمل ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور جو کوئی (ان مردانِ حق کی پیروی سے) روگردانی کرے گا (اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے) وہ سب سے بے نیاز اور ہر تعریف کا حقدار ہے۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦﴾

یہ آیت دو چیزوں میں گزشتہ آیت سے مختلف ہے:

ایک یہ کہ اس آیت میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ تو تمہاری اپنی روحانی اور معنوی ترقی کے لیے اور تمہاری قومی اور معاشرتی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔

تیسری آیت کی نظر جنگ احزاب پر ہے اور اس میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر کمزوری، بے صبری اور ان میں سے بعض کی بدگمانیوں کے باوجود رسولؐ اللہ ثابت قدم رہے اور کسی بھی لمحہ بہترین جنگی حکمت عملی سے غافل نہیں ہوئے۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک میں کدال لے کر خندق کھودنے کا کام انجام دیا، اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بذلہ سنجی اور مزاح بھی فرماتے تھے اور مسلمانوں کو جذبۂ جہاد ابھارنے والے اشعار پڑھنے اور سنانے کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ ان سب کے باوجود ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس شدید دباؤ کی حالت میں آپؐ مسلمانوں کو مستقبل میں عظیم کامیابیوں کی خوشخبری بھی دیتے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مختصر جمعیت، اسلام دشمن قبائل کے اتحاد کے خلاف منظم اور ثابت قدم رہی۔

رسولؐ اللہ کا یہ طرزِ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک حیرت انگیز نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ تھا۔

قرآن مجید فرماتا ہے: (جنگ احزاب میں)

''رسولؐ اللہ تمہارے لئے اسوہ حسنہ تھے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾

رسولؐ اللہ صرف میدانِ جنگ میں، جو کہ جہادِ اصغر کا معرکہ تھا، مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ نہیں تھے بلکہ نفس کے خلاف جہاد میں بھی، جو جہادِ اکبر کہلاتا ہے، انتہائی اہم نمونۂ عمل تھے۔ جو کوئی آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چل سکے، وہ تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کی دشوار اور نشیب وفراز سے بھرپور راہوں پر سرعت سے آگے بڑھ سکے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں ''اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے'' پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں، وہی رسولؐ اللہ جیسے عظیم قائد کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایمان اور اللہ کا ذکر انہیں ان کی عظیم ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہیں جن کی انجام دہی کے لیے وہ ایک رہبر اور قائد کی جستجو کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر قائد اور رہنما نہیں پاتے۔

چوتھی آیت میں نکتہ مقابل یعنی ''البغض فی اللہ'' پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم کوئی ایسی قوم نہیں دیکھو گے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتی ہو، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی قوت بہم پہنچائی ہے۔''

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ

یہ آیت نہایت واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر انسان خونی رشتوں اور ایمانی رشتوں کے باہمی ٹکراؤ کے مقام پر آجائے تو اسے کن تعلقات کو مقدم رکھنا چاہئے۔ یہ آیت انتہائی واضح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ اگر تمہارے قریبی ترین رشتہ دار بھی اللہ کی راہ سے منحرف ہوجائیں اور کفر وفساد کی آلودگی سے آلودہ ہوجائیں تو ان سے تعلق توڑ کر اللہ اور اعلیٰ

اقدار سے تعلق قائم کرو۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات میں وزن اور پختگی پیدا کرنے کے لیے یہ دو انتہائی با معنی جملے بھی ارشاد فرمائے:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ

''اللہ نے ایمان ان کے دلوں میں لکھ دیا ہے اور ایک روحِ الٰہی کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔''

بالفاظِ دیگر ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کا سرچشمہ اور جڑ ایمان ہے اور ایمان کا استمرار اور بقا بھی ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' میں پوشیدہ ہے۔

اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان سے یہ سفر شروع ہوتا ہے اور ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

(پانچویں آیت کی تفسیر اصل متن میں نہیں دی گئی ہے)۔

چھٹی آیت میں مومنین و مومنات کے روحانی اور معنوی تعلق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں، امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا، بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔''

امر بالمعروف اور نہی از منکر، نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی بنیاد پر قائم یہ روحانی تعلق اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ صرف اعمال و کردار میں ہی نہیں بلکہ اخلاقی صفات میں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے نمونۂ عمل بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر اہل ایمان کو کسی گروہ یا جماعت کا ہمرنگ ہونا ہو تو وہ اس گروہ مومنین کے ہمرنگ بنیں۔

امر بالمعروف اور نہی از منکر ان مومنین کے اعمال میں بر سر فہرست ہے جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی یہ خصوصیت انہیں اس بات پر مائل کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اعمال و اخلاق کا بھی خیال رکھیں۔ یہ بذات خود تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ایک موثر عمل ہے۔

ساتویں آیت میں مومنین اور کافروں کے طرزِ فکر و عمل کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ مومنین اللہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی صفات جلال و جمال سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ کفار طاغوت سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق میں بھی طاغوتی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اللہ مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے جبکہ جن

لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے ولی وسرپرست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکی کی طرف لے آتے ہیں۔ یہ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝257

اس آیت میں تاریکیوں سے نکل کر نور کی طرف آنے کو اللہ کی ولایت کا نتیجہ اور نور سے نکل کر تاریکیوں کی طرف آنے کو ولایت طاغوت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں نور سے مراد تمام نیکیاں اور اخلاقی فضائل ہیں جبکہ ظلمت میں تمام برے اعمال اور اخلاقی رذائل شامل ہیں۔

جو شخص اللہ کی ولایت کے زیر سایہ ہوتا ہے، وہ رذائل سے فضائل اور برائیوں سے نیکیوں کی طرف ہجرت کا سفر شروع کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہ ہر جگہ اللہ کی صفات جلال و جمال سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ وہ نیکی اور پاکیزگی کی طرف بڑھتا رہتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر برائی اور پلیدی سے پاک ہے۔ وہ رحمت، سخاوت اور بخشش کی طرف حرکت کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم اور جواد و کریم ہے۔

جو لوگ ولایت طاغوت کے زیر سایہ ہوتے ہیں، ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فضائل کی طرف سے رذائل کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اس طرح تاریکیوں کی طرف آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝119

درحقیقت ان دو جملوں میں سے دوسرا جملہ "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"، پہلے جملے "اتَّقُوا اللّٰهَ" کی تکمیل کر رہا ہے، اس لئے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ پر چلنا اس وقت ممکن ہی نہیں ہے جب تک انسان صادقین کی صحبت اختیار کر کے ان کی صحبت کے زیر سایہ قدم نہ اٹھائے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کی بہت سی روایات میں حضرت علی علیہ السلام یا اہل بیتؑ کے تمام افراد کو صادقین کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ اہل سنت کی روایات کا مطالعہ کرنے کے لیے الدر المنثور، مناقب خوارزمی، درالسبطین، شواہد التنزیل وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ میں، علامہ حموینی نے فرائد السمطین میں اور شیخ ابوالحسن کازرونی نے شرف النبی میں

ان میں سے کچھ روایات نقل کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سلمان فارسیؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ یہ آیت عام ہے یا خاص؟

آپؐ نے فرمایا:

اما المامورون فعامة المومنين، و اما لصادقون فخاصة اخی علی واوصیائه من بعده الی یوم القیامة

''اس آیت میں حکم عام ہے جس میں تمام مومنین شامل ہیں جبکہ صادقین خاص ہیں، میرا بھائی علیؑ اور قیامت کے دن تک ان کے اوصیاء۔''(ینابیع المودة:۱۱۵)

ظاہری بات ہے کہ علیؑ اور انؑ کے اوصیاء جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، ان کے ساتھ ہونے کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ انسان اخلاق و عمل میں ان کی پیروی کرے۔

نتیجہ

تولیٰ وتبریٰ سے متعلق مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اولیاء اللہ سے تعلق قائم کرنا اور ظالموں، فاسدوں اور طاغوتوں سے تعلق توڑنا یعنی ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' قرآن کی سب سے بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے اور اس کا اخلاقیات پر بہت گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اور اسلامی اصول زندگی کے تمام مسائل پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، خواہ ان کا تعلق فردی و اجتماعی زندگی سے ہو یا دنیوی و اخروی معاملات سے۔ اسی طرح اخلاقی مسائل پر بھی، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، یہ اصول غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ اصول مومنین کی شخصیت کو بناتا ہے۔ ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے، انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر قدم پر نیک اور پاکیزہ افراد، خصوصاً رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو اپنا اسوۂ عمل قرار دیں، اس لئے کہ یہ انسانی خلقت کے مقصد کے حصول یعنی تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے لیے ایک موثر قدم ہے۔

تولیٰ وتبریٰ احادیث کی روشنی میں

شیعہ اور سنی دونوں کی کتب احادیث میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' یعنی تولیٰ وتبریٰ کے بارے میں بکثرت روایات مندرج ہیں اور جتنی اہمیت اس مسئلہ کو دی گئی ہے، شاید ہی کسی اور چیز کو دی گئی ہو۔

اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اولیاء اللہ سے دوستی ومحبت اور دشمنانِ حق سے بیزاری کے بہت اہم اور مثبت اثرات رونما ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ ایمان کی قوت، تہذیب اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اور تقویٰ میں کیا جا سکتا ہے۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ کی راہ پر چلنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ کسی پیشوا اور رہنما کا دامن تھام لے۔ ہم یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ خطبۂ قاصعہ میں رسولؐ اللہ اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک خوبصورت عبارت ملتی ہے:

ولقد قرن الله به من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملائكته يسلك به طريق المكارم، و محاسن اخلاق العالم، ليله و نهاره و لقد كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه يرفع لي في كل يوم من اخلاقه علما و يامرني بالاقتداء

''جب سے رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے بڑا فرشتہ ان کے ساتھ مقرر فرما دیا جو شب وروز انہیں اعلیٰ اخلاقی صفات کی راہ پر چلاتا تھا اور میں اس طرح ان کے پیچھے چلتا تھا، جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے، وہ ہر روز اپنے اخلاق کا ایک علم نصب فرماتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے۔'' (نہج البلاغہ: ۱۹۲)

خطبۂ قاصعہ کے اس اقتباس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کا عظیم ترین فرشتہ آغازِ طفولیت سے رسولؐ اللہ کی رہنمائی کے لیے مامور تھا، اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی رسولؐ اللہ کی اتباع کرتے تھے اور اس طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے اور رسولؐ اللہ بھی ہر روز انہیں ایک نئی اخلاقی صفت کا درس دیتے تھے۔

جب رسولؐ اللہ اور حضرت علی علیہ السلام جیسی عظیم شخصیات رہنما اور پیشوا کی ضرورت مند تھیں تو دوسروں کی ضرورت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۲۔ زرارہ نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ حدیث نقل کی ہے:

بنى الاسلام على خمسة اشياء، على الصلوة و الزكاة و الحج و الصوم و الولاية، قال زرارة: فقلت: و اى شىء من ذلك افضل؟ فقال: الولاية افضل لا نها مفتاحهن والوالى هو الدليل عليهن

''اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ولایت۔ زرارہ کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ ان میں سب سے افضل کیا چیز ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ولایت سب سے افضل ہے کیونکہ وہ ان کی کنجی ہے اور والی ان سب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۱۸:۲)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ولایت اور اولیاء اللہ کی اقتداء کرنا تمام عبادات اور اعمال کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ یہاں سے تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے حصول کے لیے بھی ولایت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہؐ نے صحابہ سے پوچھا:

ای عری الایمان اوثق؟ فقالوا: اللہ و رسولہ اعلم و قال بعضھم الصلوۃ و قال بعضھم الزکاۃ، وقال بعضھم الصیام، وقال بعضھم الحج و العمرۃ، و قال بعضھم الجھاد، فقال رسول اللہ لکل ماقلتم فضل و لیس بہ، و لکن اوثق عری الایمان الحب فی اللہ و البغض فی اللہ و تولی اولیاء اللہ و التبری من اعداء اللہ

''ایمان کے دستوں (handles) میں سے کونسا دستہ سب سے مضبوط ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ بعض نے کہا نماز، بعض نے کہا روزہ، بعض نے کہا زکوٰۃ، بعض نے کہا حج، بعض نے کہا جہاد۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: جن چیزوں کا تم نے نام لیا، وہ سب بافضیلت اعمال ہیں لیکن میرے سوال کا جواب نہیں ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ایمان کا سب سے مضبوط دستہ یہ ہے کہ محبت اور دشمنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوں اور انسان اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے قطع تعلق کرے۔'' (کافی، ۲:۱۲۵)

اس حدیث میں لفظ ''عری'' استعمال ہوا ہے جو عروہ کی جمع ہے۔ عروہ کسی چیز کے دستہ کو کہتے ہیں جس کی مدد سے اسے پکڑا جاتا ہے۔ اس حدیث میں استعمال ہونے والا لفظ ''ایمان کا دستہ'' اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ قربِ الی اللہ کی منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی چیز کو دستے کی طرح مضبوطی سے پکڑ لے اور قرب الی اللہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد دستہ کوئی نہیں ہے۔

۴۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی جابر سے فرمایا:

اذا اردت ان تعلم ان فیك خیرا فانظر الی قلبك فان كان یحب اھل طاعۃ اللہ و یبغض اھل معصیتہ، ففیك خیر، و اللہ یحبك؛ و ان كان یبغض اھل طاعۃ اللہ و یحب اھل معصیتہ، فلیس فیك خیر، واللہ یبغضك والمرء مع من احب

''اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ تمہارے دل میں خیر اور نیکی موجود ہے یا نہیں تو اپنے دل کا جائزہ لو۔ اگر وہ اللہ

کی اطاعت کرنے والوں سے محبت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے تو تم اچھے انسان ہو اور اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اللہ کی اطاعت کرنے والوں سے نفرت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے تو تم میں نیکی نہیں پائی جاتی اور اللہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔" (اصولِ کافی، ۲:۱۲۶)

اس حدیث کا یہ جملہ "المرء مع من احب" یعنی "انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے،" اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہر انسان اپنے اخلاق و عادات میں اور اخروی انجام کے لحاظ سے انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے۔

اس طرح اس حدیث سے بھی اخلاقی مسائل پر "ولایت" کی تاثیر بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ودالمومن للمومن فی الله من اعظم شعب الایمان، الا و من احب فی الله و ابغض فی الله واعطی فی الله ومنع فی الله فهو من اصفیاء الله

"ایک مومن کا اپنے مومن بھائی سے اللہ کی خوشنودی کے لیے محبت کرنا ایمان کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کے لیے دوستی کرتا ہے، اللہ کے لیے دشمنی کرتا ہے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دیتا ہے اور اللہ کے لیے کسی سے کوئی چیز روکتا ہے تو وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہوجاتا ہے۔"

(بحارالانوار، ۶۶:۲۴۰)

۶۔ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذاجمع الله عزوجل الاولین والآخرین قام منادفنادی یسمع الناس فیقول، این المتحابون فی الله قال: فیقوم عنق من الناس فیقال الهم اذهبوا الی الجنة بغیر حساب قال: فتلقاهم الملائکة فیقولون الی این؟ فیقولون الی الجنة بغیر حساب! قال فیقولون فان ضرب انتم من الناس؟ فیقولون نحن المتحابون فی الله، قال فیقولون وای شیء کانت اعمالکم قالوا کنانحب فی الله و نبغض فی الله، قال فیقولون نعم اجر العالمین

"جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اولین و آخرین کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس کی آواز

سب سنیں گے۔ وہ کہے گا کہ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت کچھ لوگ اٹھیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم بغیر حساب کے جنت میں جا رہے ہیں۔ فرشتے پوچھیں گے کہ تم کون لوگ ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے اعمال کیا تھے؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہم کسی سے محبت کرتے تھے تو وہ بھی اللہ کے لیے ہوتی تھی۔ فرشتے کہیں گے کہ عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے۔'' (بحارالانوار، ٦٦:٢٤٠)

یہ جملہ ''نعم اجر العاملین'' یعنی ''عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے''، اس حقیقت کو آشکار کر رہا کہ اولیاء اللہ سے محبت اور دشمنانِ خدا سے دشمنی، تمام اچھے اعمال کی انجام دہی اور برے اعمال سے اجتناب کا بنیادی سبب ہے۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے: (بحارالانوار، ٦٦:٣٥٢)

ان حول العرش منابر من نور علیها قوم لباسهم ووجوههم نور لیسوا بأنبیاء یغبطهم الانبیاء والشهداء قالوا یارسول الله حل لنا قال: هم المتحابون فی الله والمتحالسون فی الله والمتزاورون فی الله

''عرش کے اردگرد نور کے منبر ہیں۔ ان پر ایسے افراد ہوں گے جن کے چہرے اور لباس نور کے ہوں گے۔ وہ نبی نہیں ہوں گے مگر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا: یارسولؐ اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اللہ کے لیے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور اللہ کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

۸۔ ایک اور حدیث میں (یا مندرجہ بالا حدیث کے استمرار میں) رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

لو ان عبدین تحابا فی الله احدهما بالمشرق والآخر بالمغرب لجمع الله بینهما یوم القیامة وقال النبی افضل الاعمال الحب فی الله و البغض فی الله

(بحارالانوار، ٦٦:٣٥٢)

''اگر اللہ کے دو بندے، اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں اور ان میں سے ایک

مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جنت میں انہیں ایک جگہ جمع کر دے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں کے درمیان ایمانی رشتہ ہر رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہ رشتہ ان کے درمیان اخلاق و اعمال میں ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب لوگ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں اور ایک دوسرے میں ان افعال وصفات کا مشاہدہ کرتے ہوں جو اللہ کو پسند ہیں تو یہ "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ان کی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۹۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

هل عملت لی عملا؟ قال صليت لك و صمت و تصدقت و ذكرت لك. قال الله تبارك و تعالىٰ: و اما الصلوة فلك برهان، و الصوم جنة و الصدقة ظل، و الذكر نور، فای عمل عملت لی؟ قال موسى: دلنى على العمل الذى هو لك. قال ياموسى هل و اليت فى ولياوهل عاديت لى عدواقط فعلم موسى ان افضل الاعمال الحب فى الله و البغض فى الله

"اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی کوئی عمل میرے لئے بھی انجام دیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا: یا اللہ! میں نے تیرے لئے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، صدقات دیئے اور تیرا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نماز تو تمہاری اپنی رہنما ہے، روزہ تمہارے لئے ڈھال ہے، صدقہ تمہارے لئے سایہ ہے، ذکر تیرے لئے نور ہے، میرے لئے تو نے کیا کیا؟ موسیٰ نے کہا: یا اللہ! تو اس عمل کی طرف میری رہنمائی فرما جو تیرے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی میرے لئے ولی سے محبت کی ہے اور کیا تو نے کبھی میرے لئے کسی دشمن سے دشمنی کی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ہے۔" (بحار الانوار، ۶۶: ۲۵۲)

۱۰۔ ہم اس بحث کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں (اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے)۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله و منع لله فهو ممن كمل ايمانه

"جو شخص اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے دشمنی کرے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دے اور اللہ کے

لیے کسی کو نہ دے تو اس کا ایمان درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔'' (بحارالانوار، ٦٦:٢٥٢)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں ''الحب فی اللہ'' و''البغض فی اللہ'' قرآن کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے افضل ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ اسے کمالِ ایمان کی علامت اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس صفت کے حامل افراد دوسروں سے پہلے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں وہ مقام دیا جائے گا جس پر انبیاء وشہداء بھی رشک کریں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں ولایت اور تولیٰ وتبریٰ کی تمام دینی امور میں اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ انسان بزرگانِ دین سے ان کے ایمان، تقویٰ، اخلاقی فضائل اور اعمال صالحہ کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے اعمال وکردار میں ان کی پیروی نہ کرے اور ان کی شخصیت کا پرتو اپنی شخصیت میں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اسی حقیقت کو علمائے اخلاق نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ سیر وسلوک میں کامیابی کے لیے انسانِ کامل کی اقتداء لازمی شرط ہے۔

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انبیاء کے مختلف واقعات کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل قرار دیں اور کامیابی ونجات کے سفر میں ان کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عام طور پر لوگوں میں قہرمان پرستی (Hero worship) کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں کسی عظیم شخصیت سے محبت کرے اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی پیروی کرے۔

کسی ایسے ہیرو کا انتخاب انسان کی زندگی کو کوئی شکل وصورت دینے میں بہت موثر کردار ادا کرتا ہے۔ ہیرو کی شناخت اور ان کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر بدل جانے سے انسان کی زندگی کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔

بہت سے افراد یا اقوام کسی حقیقی ہیرو تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خیالی یا دیومالائی ہیرو بنا لیتے ہیں اور اپنے شعر وادب میں ان کی تعریف وستائش کے انبار لگا دیتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے معاشرتی حالات اور پروپیگنڈہ مشینری کا قہرمان سازی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہی چیزیں باعث بنتی ہیں کہ کسی قوم کے ہیرو اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے، سیاسی شخصیات، کھلاڑی یا فلمی اداکار بن جاتے ہیں۔

حقیقی ہیرو کی شناخت کے لیے انسان کے اس فطری رجحان کی درست سمت میں رہنمائی کرنے سے فرد اور معاشرہ کی اخلاقی تربیت میں بہت مدد ملتی ہے۔

اولیاء اللہ سے محبت کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں مسئلہ ولایت کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اس کے بغیر تمام دینی اعمال کو ناقص قرار دیا گیا ہے۔

داستانِ موسیٰ وخضر

استاد اور مرشد کا انتخاب تزکیہ نفس اور سیر وسلوک الی اللہ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ بعض اوقات اللہ عالیٰ نے انبیاء کو بھی حکم دیا کہ ایک خاص مدت کے لیے کسی مرشد اور رہنما کی پیروی کریں۔

اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، انتہائی اہم اور معنویت سے بھرپور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کچھ علوم کے حصول کے لیے، جن کا تعلق اخلاق و عمل سے تھا، اپنے دور کے ایک عالم اور پیغمبر کے پاس جا کر کسب فیض کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم اور پیغمبر کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝٦٥

''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا اور اسے اپنی طرف سے علم عطا کیا۔'' (کہف:٦٥)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رخت سفر باندھا اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس پہنچ کر انہوں نے ان سے حصولِ علم کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں نہیں سمجھتا کہ تم میری تعلیمات کو برداشت کرنے کا صبر وحوصلہ دکھا سکو۔''

مگر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ صبر وحوصلہ کا مظاہرہ کریں گے۔

اس کے بعد تین اہم واقعات رونما ہوتے ہیں۔ پہلے وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ حضرت خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً اعتراض کر دیا کہ آپؑ کے اس عمل سے کشتی ڈوب سکتی ہے۔ حضرت خضرؑ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ تم صبر نہیں کر سکو گے۔ حضرت موسیٰ نے معذرت کی اور اعتراض نہ کرنے کا وعدہ کیا اور دونوں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ حضرت خضرؑ نے اسے دیکھتے ہی قتل کر دیا۔ جب حضرت موسیٰ نے بظاہر ایک بے گناہ نوجوان کے قتل کا خوفناک منظر دیکھا تو دامنِ صبر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ شدید لہجہ میں اعتراض کرتے ہوئے کہا: آپؑ نے ایک بے گناہ معصوم جان کو قتل کر دیا۔ یہ تو یقیناً ایک برا عمل ہے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ کو ان کا وعدۂ خاموشی یاد دلایا اور کہا کہ اگر اب تم بولے تو پھر تمہارا راستہ میرے راستے سے الگ ہو جائے گا۔ موسیٰ بھی سمجھ گئے کہ یقیناً اس میں کوئی اہم راز ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور موقع کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت خضرؑ خود ان واقعات کی حقیقت پے پردہ اٹھائیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔ حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰ ایک بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کے لوگوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی اور کھانا تک کھلانے پر تیار نہ ہوئے۔ حضرت خضرؑ نے ایک دیوار دیکھی جو انتہائی بوسیدہ تھی اور کسی بھی وقت گر

سکتی تھی۔ انہوں نے آستیں چڑھائی اور حضرت موسیٰ کو بھی کام پر لگایا اور دیوار کی مرمت کر دی تا کہ وہ گر نہ جائے۔ ایک بار پھر حضرت موسیٰ اپنا وعدہ خاموشی بھول گئے اور کہنے لگے: کیا اس بستی کے یہ بے مروت لوگ اس محبت آمیز رویے کے مستحق ہیں؟ اس موقع پر حضرت خضرؑ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس کے بعد تمہارا راستہ میرے راستے سے الگ ہے۔ لیکن جدائی سے پہلے انہوں نے ان تینوں کاموں کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کر دی۔

کشتی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ایک ظالم و جابر بادشاہ دریا میں موجود صحیح و سالم کشتیوں کو ملاحوں سے چھین لیتا تھا۔ میں نے کشتی میں سوراخ کر کے اس میں عیب پیدا کر دیا تا کہ اس ظالم بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رہے اور اس کشتی کے غریب ملاح اپنی روٹی روزی کے اس وسیلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔

جس نوجوان کو میں نے قتل کیا، وہ مرتد اور کافر ہو گیا تھا اور سزائے موت کا مستحق تھا۔ اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ وہ اپنے نیک ماں باپ پر دباؤ ڈال کر ان کو بھی بے دین بنا دیتا۔

باقی رہ گئی دیوار، تو وہ اس بستی کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔ ان کا باپ ایک نیک انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ ان کا خزانہ محفوظ رہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ یہ تینوں کام اللہ کے حکم سے کئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، علم و معرفت کا ایک ذخیرہ حضرت خضر علیہ السلام سے لے کر ان سے الگ ہو کر اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے اس عظیم معلم اور مربی سے مندرجہ ذیل سبق حاصل کئے:

۱۔ ایک عالم اور حکیم رہنما کو تلاش کرنا اور اس کے علم و اخلاق سے روشنی اصل کرنا اس قدر اہم ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے الوالعزم نبی کو حکم دیا گیا کہ دور دراز کا فاصلہ طے کر کے ایسے رہنما کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے روشنی حاصل کریں۔

۲۔ کسی کام میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ بہت سے کاموں کے لیے مناسب وقت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "الامور رهنية باوقتها"، "ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا ہے۔"

۳۔ ہمارے اردگرد جو حوادث اور واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کے ظاہری پہلو کے ساتھ ساتھ ایک باطنی پہلو بھی ہوتا ہے۔ کسی واقعہ کے ظاہری اور ناخوشگوار پہلو کو دیکھ کر اسی کو ساری حقیقت سمجھ کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے۔ کسی بھی معاملہ کے بارے میں فیصلہ کرنے سے قبل اس کے باطن کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ معنوی عہد و پیمان کو بار بار توڑنے کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ انسان ہمیشہ کے لیے ان کے فوائد و برکات سے محروم ہو جائے۔

۵۔ کمزور طبقات کی حمایت، یتیموں کی خیر خواہی اور ظالموں کے خلاف جنگ ایسے فرائض ہیں جنہیں ہر قیمت پر ادا کرنا ضروری ہے۔

۶۔ انسان جتنا بھی زیادہ علم رکھتا ہو، اسے اپنے علم پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اسے یہ بات ضرور مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کے

علم سے آگے اور بھی علوم موجود ہیں۔ اگر انسان اپنے علم کو ہی علم کا کمال سمجھ لے تو اس سے اس کی ترقی کا سفر رک جاتا ہے۔

۷۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص کارندے خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مظلوم اور بے یار و مددگار بندوں کی مدد کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص الطاف وعنایات میں سے ہے جن کی توقع ہر صاحب ایمان کرسکتا ہے۔

یہ واقعہ خواہ حضرت موسیٰ کی تعلیم و تربیت کے لیے تھا یا دوسروں کے لیے ایک نمونہ اور مثال تھا، اس سے ہماری بحث متاثر نہیں ہوتی، اس لئے کہ جو سبق ہم اس سے سیکھ رہے ہیں، وہ ایک حقیقت ہے۔

مختصر یہ کہ علم میں اضافہ اور تہذیب نفس کے لیے رہبر اور پیشوا کی ضرورت اور اہمیت قابل انکار نہیں ہے۔

چودھواں باب

ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار

تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ سے متعلق امور اور اخلاقیات پر ولایت کی تاثیر کا عقیدہ صرف اس بنیاد پر نہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کی ہدایات قول وفعل کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ ہیں بلکہ بعض علمائے بزرگ کے عقیدہ کے مطابق ولایت کی ایک اور قسم بھی موجود ہے جسے ولایت تکوینی کہا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اولیائے الٰہی، تربیت کے قابل افراد میں براہِ راست تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ رسولؐ اور امامؑ انسانی معاشرے کے دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو عضو دل کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہو اور اس کے ساتھ جس قدر زیادہ ہم آہنگ ہو، وہ اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوتا ہے، یا اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ نبیؐ اور امامؑ چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہوتے ہیں۔ اگر تکبر، خود پسندی اور نفس پرستی کے بادل انسان کی روح اور دل پر سایہ فگن نہ ہوں تو اس آفتاب ولایت کی روشنی ایسے انسان کی روحانی نشوونما کرنے اور اسے پراثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہاں ولایت ایک اور صورت میں رونما ہوتی ہے اور ظاہری تصرفات سے آگے بڑھ کر ایک غیر مرئی اور پراسرار تاثیر اختیار کر لیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ (احزاب: ۴۵، ۴۶)

"اے نبیؐ! ہم نے تمہیں گواہ، بشارت دینے والا، خبردار کرنے والا، اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

یہ روشن چراغ اور آفتاب درخشاں سالکانِ راہ قرب کی راہوں کو ہی روشن نہیں کرتا بلکہ انسان کے وجود پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور نفوس کو نشوونما دے کر معنوی ارتقاء کی طرف لے چلتا ہے۔

ہشام بن حکم اور اہل سنت کے ماہر علم کلام عالم عمرو بن عبید کے درمیان ہونے والا مناظرہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے۔

ہشام بن حکم مسجد بصرہ میں داخل ہوئے۔ لوگ عمرو بن عبید کے گرد اجتماع کئے ہوئے تھے۔ ہشام بن حکم نے مجمع کو چیرتے ہوئے عمرو بن عبید کے قریب جا کر کہا کہ میں ایک اجنبی مسافر ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو سوال کرنا چاہتا ہوں؟

عمرو: جی فرمائیے!

ہشام: آیا آپ کی آنکھیں ہیں؟

عمرو: بیٹا یہ کیسا سوال کررہے ہو؟ جو چیز تمہیں نظر آرہی ہے،اس کے بارے میں سوال کررہے ہو؟

ہشام: میرے سوالات کچھ اسی قسم کے ہیں،اگر آپ اجازت فرمائیں تو میں سلسلہ جاری رکھوں؟

عمرو: (غرور سے بھرے ہوئے لہجے میں) پوچھو،خواہ تمہارے سوال احمقانہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہشام نے اپنا مذکورہ سوال دہرایا اور عمرو نے اس کا مثبت جواب دیا۔

ہشام: آپ اپنی آنکھوں سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: رنگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں۔

اس کے بعد ہشام نے منہ، کان، ناک کے بارے میں ایسے ہی سیدھے سادھے سوال کئے اور سیدھے سادھے جواب سنے۔آخر میں ہشام نے پوچھا:

ہشام: کیا آپ کے پاس دل ہے اور آپ اس سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: میرے تمام اعضاء و جوارح مجھے جو پیغام اور اطلاعات دیتے ہیں، دل کی مدد سے ان کا جائزہ لیتا ہوں (اور ان سے مناسب کام لیتا ہوں)۔

ہشام: کیا اعضا و حواس ہمیں قلب سے بے نیاز نہیں کرتے؟

عمرو: نہیں،اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ حواس سے غلطی سرزد ہوجائے،دل انہیں اس خطا سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہاں ہشام نے اصل وار کرتے ہوئے کہا:

اے ابومروان! (یہ عمرو بن عبید کی کنیت تھی) جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء و جوارح کو امام اور رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عالم انسانیت کو امام کے بغیر، حیرت و سرگردانی میں چھوڑ دے اور ان کے لیے کوئی امام مقرر نہ کرے؟

عمرو بن عبید یہاں اصل نکتہ کی طرف متوجہ ہوگیا اور خاموش ہوگیا اور سمجھ گیا کہ یہ جوان ہشام بن حکم ہے۔اس نے ہشام بن حکم کو احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے ہشام سے یہ واقعہ سنا تو آپؑ نے تبسم فرمایا اور پوچھا:

''یہ منطق کس نے تمہیں سکھائی؟''

ہشام نے جواب دیا کہ یہ آپؑ کی صحبت کا فیض ہے۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! یہ بات صحف ابراہیمؑ وموسیٰ میں بیان ہوئی ہے۔''(اصولِ کافی،۱:۱۶۹،خلاصہ)

بلاشبہ امامؑ عالم انسانیت کا قلب ہے۔اس طرح یہ حدیث امام کی ولایت و ہدایت تشریعی یا تکوینی یا دونوں پر دلالت کررہی ہے۔

ابوبصیراوران کے ایک پڑوسی جس نے نئی نئی توبہ کی تھی، کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اسی حقیقت کی ایک اور دلیل ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میرا ایک ہمسایہ جو (بنی امیہ یا بنی عباس کی) ظالم حکومت کا کارندہ تھا اور اس ملازمت کے ذریعہ اس نے بہت مال و دولت جمع کر لی تھی۔ وہ عیش و عشرت اور شراب خوری کی محفلیں سجاتا اور اپنے دوستوں کو ان میں دعوت دیتا تھا۔ میں نے متعدد بار اس سے اس چیز کی شکایت کی مگر وہ باز نہ آیا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ میں ایک گناہگار انسان ہوں جبکہ تم ایک نیک اور پاکیزہ انسان ہو۔ اگر تم میرے حال سے اپنے امامؑ، امام جعفر صادق علیہ السلام کو خبر دو تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے وسیلہ سے مجھے گناہوں کی زندگی سے نجات دے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ اس کی بات کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ جب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس کی حالت امام علیہ السلام کی خدمت میں بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ جب تم کوفہ واپس جاؤ اور وہ تمہیں ملنے آئے تو اسے کہنا کہ جعفرؑ بن محمدؑ تمہیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم گناہ ترک کر دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ جب میں کوفہ گیا تو وہ مجھے ملنے آیا اور میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا پیغام اسے پہنچایا۔ امامؑ کا پیغام سن کر اس کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ فرطِ جذبات سے رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا کہ تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا واقعی جعفرؑ بن محمدؑ نے ایسا کہا ہے؟

ابوبصیر نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ امامؑ نے یہ پیغام دیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

چند روز بعد اس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں دروازے کے پیچھے تقریباً برہنہ حالت میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ میرے گھر میں جو کچھ (مالِ حرام) تھا، وہ سب میں نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن اموال کے مالکوں کو میں جانتا تھا، وہ ان کے مالکوں کو لوٹا دیئے ہیں اور جن اموال کے مالکوں کو نہیں جانتا تھا، وہ ان کی طرف سے فقراء میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ اب جو میری حالت ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے برادرانِ مومن کی مدد سے اس کے لیے لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی فراہم کیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں۔ میں اس کے پاس گیا۔ میں باقاعدگی سے اس کی عیادت کرتا رہا اور اس کا علاج بھی کروایا مگر اسے افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس کی موت کا وقت قریب آ گیا۔

میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ حالت نزع میں تھا۔ پھر اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا اور بولا:

''ابوبصیر! تمہارے امامؑ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد میں حج کے لیے مکہ گیا۔اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں جیسے ہی امامؑ کے گھر میں داخل ہوا، آپؑ نے بغیر کسی تمہید کے کمرے کے اندر سے اونچی آواز میں فرمایا:

''ابوبصیر! ہم نے تمہارے دوست سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا (اور اس نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا)۔''

(بحارالانوار،۴۷:۱۴۵)

ممکن ہے یہ واقعہ توبہ کا ایک عام واقعہ ہو لیکن اس بات کے پیش نظر کہ وہ شخص غیر معمولی طور پر گناہگار تھا اور اس نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ امامؑ کی نظر عنایت کے بغیر شیطان کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس شخص کے اندر رونما ہونے والی یہ تبدیلی امامؑ کے تصرف کا نتیجہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں نورِ ولایت کا کوئی نقطہ موجود تھا اور وہی اس چیز کا باعث ہوا کہ امامؑ نے اس میں تصرف کیا اور اسے نجات بخشی۔

تہذیب نفس میں اس معنوی تاثیر اور ولایت تکوینی کا ایک اور نمونہ یہ واقعہ ہے جو علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں نقل کیا ہے:

''جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون کی قید میں تھے تو اس نے ایک حسین وجمیل کنیز آپؑ کے پاس بھیجی۔(بظاہر اس کا مقصد امامؑ کی خدمت کرنا تھا مگر اصل میں اس کا مقصد آپ کو فریب دینا تھا) جب امامؑ نے اس کو دیکھا تو یہ آیت پڑھی جو ملکہ سباء کے ہدایا وتحائف کو دیکھ کر حضرت سلیمانؑ نے پڑھی تھی:

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴿۳۶﴾

''بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ پر فرحت محسوس کرتے ہو۔''(نمل:۳۶)

پھر آپؑ نے فرمایا:''مجھے اس کنیز کی اور اس جیسی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

ہارون اس جواب پر غضبناک ہوا اور اپنا ایلچی امامؑ کے پاس بھیجا کہ انہیں یہ پیغام دے کر ہم نے آپؑ کی مرضی اور اجازت سے آپؑ کو گرفتار اور قید نہیں کیا ہے اور کہا کہ کنیز کو ان کے پاس چھوڑ کر آؤ۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہارون نے ایک خادم بھیجا تا کہ یہ دیکھے کہ وہ کنیز امامؑ پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں؟ خادم نے واپس جا کر ہارون کو خبر دی کہ کنیز مسلسل سجدہ کی حالت میں تھی اور یہ کہے جا رہی تھی:

قدوس سبحانك سبحانك

اور اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

ہارون نے کہا:''اللہ کی قسم! موسیٰ ابن جعفرؑ نے اس پر جادو کر دیا ہے۔''

پھر اس نے حکم دیا کہ کنیز کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔جب کنیز کو ہارون کے سامنے لایا گیا تو خشیتِ الٰہی سے اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ہارون نے اسے دیکھ کر سوال کیا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟

کنیز نے جواب دیا: میرے اندر ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ جب میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پاس تھی تو میں نے دیکھا کہ آپؑ شب و روز مسلسل نماز پڑھتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ مجھے آپؑ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے، اگر آپؑ کی کوئی حاجت ہو تو فرمائیے؟

امام علیہ السلام نے ایک طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟

میں نے دیکھا تو مجھے ایک وسیع و عریض باغ نظر آیا جس کی حد یں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہ باغ پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے۔ حسین و جمیل خادموں کی کثیر تعداد خدمت کے لیے آمادہ تھی۔ انہوں نے سبز حریر کے لباس پہنے ہوئے تھے اور یاقوت کے تاج ان کے سروں پر رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دھونے کے لیے آفتابے، ہاتھ خشک کرنے کے لیے تولئے تھے اور انواع و اقسام کے کھانے آمادہ تھے۔ یہ دیکھ کر میں حالت سجدہ میں گر گئی، سجدے میں ہی تھی کہ اس خادم نے مجھے اٹھایا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اپنی جگہ پر تھی۔

ہارون نے کہا:

''اے خبیث عورت! شاید تو نے سجدہ کیا اور سجدے میں سو گئی اور یہ سب کچھ خواب میں دیکھا۔''

کنیز نے کہا: اللہ کی قسم! میرے آقا! ایسا نہیں ہے۔ پہلے میں نے یہ منظر دیکھا اور بعد میں سجدہ کیا۔

ہارون نے خادم کو حکم دیا کہ اس خبیث عورت کو لے جاؤ اور اسے اپنے پاس نظر بند کرو تا کہ کوئی اس کی یہ کہانی نہ سن سکے۔

کنیز فوراً نماز میں مشغول ہوگئی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کر رہی ہو تو اس نے جواب دیا:

''میں نے عبد صالح (یعنی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

پھر اس نے مزید کہا کہ جب میں وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی تو میں نے حورانِ جنت کو دیکھا جنہوں نے مجھ سے کہا:

''عبد صالح سے دور ہو جاؤ تا کہ ہم داخل ہو سکیں، ان کی خدمت گار ہم ہیں، تم نہیں!''

یہ کنیز اسی حالت میں رہی، یہاں تک کہ اس دنیا سے چل بسی۔ (بحار الانوار، ۴۸:۲۳۹)

اس واقعہ میں بھی تربیت کی قابلیت رکھنے والے نفوس میں ائمہ کے معنوی نفوذ اور تاثیر کا نمونہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان عظیم ہستیوں سے ایک ملاقات کے نتیجہ میں ہی مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اولیائے کامل نے ان لوگوں پر ایسی نظر عنایت کی جس کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔ اس تصرف کو دوسرے الفاظ میں ولایت تکوینی کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی ضرور مدنظر رہے کہ ایسی نظر عنایت بے سبب نہیں ہوتی۔ جن لوگوں پر یہ نظر عنایت ہوتی ہے، ان میں بھی ضرور کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام معصومؑ کی نظر عنایت کے مستحق بنتے ہیں۔

علامہ مطہری شہید کا نظریہ

علامہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب "ولاء ھا وولایتھا" میں فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ دو الفاظ چار معنی میں استعمال ہوتے ہیں: ولائے محبت، یعنی اہل بیتؑ سے عشق و محبت، ولائے امامت یعنی آئمہؑ کو افعال و کردار میں نمونہ عمل قرار دینا، ولائے زعامت یعنی آئمہؑ کو سیاسی اور معاشرتی امور میں اپنا حاکم ماننا اور ولائے تصرف یاد لائے معنوی جو کہ ولایت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔''

اس کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کی وضاحت کرتے ہوئے چوتھے معنی کی وضاحت کے ضمن میں کہتے ہیں:

''معنوی ولایت یا تصرف ایک غیر معمولی تکوینی تصرف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کی عبادت کے نتیجہ میں قرب الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان کامل کا مقام و مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد وہ معنویات کا قافلہ سالار بن جاتا ہے۔ اسے لوگوں کے باطن پر تسلط حاصل ہوجاتا ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا گواہ اور حجت زمان ہوجاتا ہے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق ہر دور میں ایک انسان کامل موجود ہوتا ہے جو انسان اور کائنات پر غیبی تسلط رکھتا ہے، وہ ارواح و قلوب پر بھی نظر رکھتا ہے اور اسے حجت خدا کہا جاتا ہے۔

ولایت تکوینی کے معنی یہ نہیں ہیں، جیسا کہ بعض جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے کہ کوئی انسان کائنات کا سرپرست بن کر اللہ کی طرف سے نظامِ زمین و آسمان کو چلانے اور خلق و رزق کے امور کا چلانے والا بن جائے۔

اگرچہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے بلکہ اس بات کے ساتھ شباہت رکھتا ہے جو اللہ نے فرشتوں کے مدبرات امر اور مقسمات امر ہونے کے حوالے سے کہی ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم خلق کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے اور مارنے جیسے امور کو اللہ کے سوا کسی کی طرف نسبت نہ دیں۔

بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کامل قرب الٰہی کے نتیجہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے کائنات کے بعض امور پر تصرف حاصل ہوجاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''یہاں اس بات کی طرف مختصر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ یہ طرزِ فکر قرآنی معنی و مفاہیم پر مبنی ہے تاکہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ کوئی قلندرانہ یا ملنگانہ بات ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ولایت کے چوتھے معنی کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ چونکہ اس کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے، لہٰذا اسے رد کر دیا جائے۔''

اس کے بعد وہ بہت سے پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''بنابرایں یہ محال اور ناممکن ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت اور بندگی کے نتیجہ میں فرشتوں کے مقام تک یا ان کے مقام سے بالاتر مقام پر نہ پہنچ پائے یا کم از کم ان کمالات کو حاصل نہ کر سکے جو ایک فرشتے کو حاصل ہیں (وہ فرشتے اذن الٰہی سے کائنات میں تصرف اور تدبیر کا اختیار رکھتے ہیں)۔''

مرتضیٰ مطہری شہید کے ان بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان انسان ہائے کامل کے ساتھ معنوی تعلق سے انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ ان پر روحانی طور پر اثر انداز ہو سکیں اور انہیں بتدریج رذائل اخلاق سے دور کر کے فضائل و کمالات کے قریب لا سکیں۔

ناجائز مفاد پرستی

ہر دور میں اور ہر قوم میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو مفاہیم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں مگر اس سے ان صحیح مفاہیم کی صحت متاثر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی قداست میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

تہذیب نفس اور سلوک الی اللہ کی راہ میں موثر پیشرفت کے لیے استاد اور مرشد کی ضرورت بھی انہی مسائل میں سے ہے جن سے سوئے استفادہ کیا گیا ہے (ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے)۔

صوفیاء میں سے بعض افراد نے اپنے آپ کو مرشد، شیخ، پیر طریقت اور قطب وغیرہ جیسے عنوان دے کر لوگوں کو اپنی بے قید و شرط پیروی کی دعوت دینا شروع کر دی۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ پیر طریقت کو کوئی غیر شرعی عمل انجام دیتے دیکھیں تو ہرگز ان پر اعتراض نہ کریں، اس لئے کہ ان پر اعتراض کرنا روح تسلیم کے خلاف ہے۔

امام غزالی کا اہل تصوف کی طرح رجحان ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں ان کے بیانات سے ظاہر ہے اور اہل تصوف بھی انہیں اپنے بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔ غزالی اسی کتاب کے باب ۵ کی فصل ۱۵ میں کہتے ہیں:

''شیخ کے سامنے مریدوں کا باادب ہونا صوفیاء کے آداب میں سب سے اہم ہے۔ مرید کو شیخ کے سامنے بے اختیار ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ شیخ کی اجازت کے بغیر اپنے جان و مال میں کوئی تصرف نہ کرے............ شیخ کے سامنے مرید کا بہترین ادب خاموشی اور جمود ہے، یہاں تک کہ شیخ جب، جو کچھ مناسب سمجھے، اسے کرنے کو کہے۔ اگر اسے شیخ کا کوئی عمل خلافِ شریعت دکھائی دے اور اس کا سمجھنا اس پر دشوار ہو تو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کو یاد کرنا چاہئے۔ حضرت موسیٰ حضرت خضرؑ کے کاموں کو غلط سمجھ کر اعتراض کرتے رہے مگر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان افعال کی حقیقت بیان کی تو موسیٰ نے اپنے اعتراض واپس لے لئے۔ لہٰذا شیخ جو بھی عمل انجام دیتا ہے، اس کی کوئی حکمت ہوتی ہے۔'' (احیاء العلوم، ۵:۱۹۸)

شیخ عطار، یوسف بن حسین رازی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''جب ان کے مرشد، ذوالنون مصری نے انہیں حکم دیا کہ مصر کو چھوڑ کر اپنے شہر چلے جائیں تو یوسف نے ان سے ہدایات طلب کیں۔ ذوالنون نے جواب دیا: جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اسے بھول جاؤ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے، اسے مٹا دو تا کہ حجاب برطرف ہوجائے۔''

ابوسعید کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے کہتے تھے:

رأس هذا الامر كبس المحابر و خرق الدفاتر و نسيان العلم

''تصوف کی اساس یہ ہے کہ دوات اور روشنائی کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور کتابوں کا پیوں کو پھاڑ دیا جائے اور علم کو بھلا دیا جائے۔'' (اسرار التوحید: ۳۲)

ابوسعید کندی کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی چوری چھپے درس میں شرکت کر لیتے تھے۔ ایک دن ان کی جیب سے دوات گر گئی (اور یہ راز فاش ہوگیا) تو ان کے صوفی ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: اپنی شرمگاہ چھپالو۔ (نقد العلم والعلماء: ۳۱۷)

اس کے برعکس رسولؐ اللہ کی مشہور و معروف حدیث میں ہے:

وزن مداد العلماء بدماء الشهداء فيرجح مداد العلماء على دماء الشهداء

''قیامت کے دن علماء کے قلم کی روشنائی کو شہداء کے خون سے تولا جائے گا اور وہ شہداء کے خون پر بھاری ہوگی۔''

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ جب حقائق نا اہل افراد کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو ان میں کس طرح تحریف کر کے ان سے سوء استفادہ کیا جاتا ہے، کیوان قزوینی المعروف بہ منصور علی شاہ کی ان باتوں پر غور فرمایئے۔ موصوف صوفیاء کے اقطاب میں سے تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ قطب کی حدود ان دس معاملات پر پھیلی ہوئی ہے:

۱۔ مجھے بھی وہی باطنی ولایت حاصل ہے جو خاتم الانبیاء کو حاصل تھی .... فرق صرف یہ ہے کہ وہ بانی تھے اور میں مروج اور محافظ ہوں۔

۲۔ میں لوگوں کو اس طرح درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہوں کہ برائیوں کی روح کو ان کے بدن میں مار ڈالوں یا ان کے بدن سے نکال کر کفار کے بدن میں منتقل کر دوں۔

۳۔ میں نفس کی قیود سے آزاد ہوں۔

۴۔ مرید اپنے تمام معاملات اور عبادات میری اجازت سے انجام دیں۔

۵۔ میں مریدوں کو جس اسم کا ورد کرنے کا حکم دوں، وہی اللہ کا اسم ہوگا، باقی اسماء کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

۶۔ دینی معارف اور قلبی عقائد کو اگر میری تصدیق حاصل ہو تو وہ صحیح ہوں گے ورنہ خطا ہوں گے۔

۷۔ میری اطاعت فرض، میری خدمت لازم اور میری حفاظت ضروری ہے۔

۸۔ میں اپنے عقائد میں آزاد ہوں۔

۹۔ میں اپنے مریدوں کے قلبی حالات پر حاضر و ناظر ہوں۔

۱۰۔ میں جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ (استوار نامہ: ۹۵)

یہ باتیں جو ہذیان اور دیوانگی سے زیادہ شباہت رکھتی ہیں، اگرچہ تمام صوفیاء کے ہاں قابل قبول نہ ہوں مگر ان سے یہ

بات واضح ہو جاتی ہے کہ قطب ہونے کے مدعی، قطب کے لیے ان مقامات اور اختیارات کے قائل ہیں جن کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تہذیب اخلاق اور سیر و سلوک میں استاد اور مربی کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کیسے نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا دعویٰ اہل تصوف نے کیا ہے، ان میں سے بعض تو انبیاء سے مخصوص ہیں جبکہ بعض کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا ہے۔ جو شخص بھی مذہبی مسائل سے تھوڑی بہت آگاہی رکھتا ہو، وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر گہرا المیہ ہے۔ اگر اہل تصوف کی کتب مثلاً ''تذکرۃ الاولیاء''، شیخ عطار، تاریخ تصوف، نفحات الانس اور احیاء العلوم کے بعض مباحث کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اقطاب کے بارے میں ایسے دعوے نظر آتے ہیں کہ انسان وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ محققین، متکلمین اور فقہاء نے اس گروہ کے خلاف محاذ قائم کیا جس کی وجہ سے بعض ناآگاہ افراد کو دکھ اور رنج بھی ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حقائق سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان رجحانات کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے اور ان کا سدباب نہ کیا جائے تو اسلام کے اصول و فروع کا حلیہ اس طرح بگاڑ کر رکھ دیا جائے گا کہ ان کی اصل شکل پہچانی ہی نہیں جائے گی۔

ہم یہاں پر اخلاقی مسائل کے کلیات کے بارے میں قرآنی آیات کی روشنی میں اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں اگلے مباحث کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جن میں ایک ایک کر کے تمام اخلاقی فضائل و رذائل پر گفتگو کی جائے گی۔

بارالٰہا! فضائل اخلاق کے کمال تک پہنچنا اور تیری بارگاہ کا قرب حاصل کرنا تیری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اس راہ میں ہماری مدد فرما اور اپنے بندگانِ صالح کے قرب کے مقام تک ہمیں رسائی عطا فرما اور ہمیں صاحب نفس مطمئنہ بنا دے تاکہ ہم "فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی" کے خطاب کے مستحق ہو سکیں۔

بارالٰہا! شیطان کا دام سخت اور سہمگین ہے اور ہوائے نفس ایک خطرناک دشمن ہے، رذائل اخلاق کانٹوں کی طرح ہماری روح کو تڑپاتے ہیں، ایسے میں صرف تیری مخصوص عنایات ہمیں ان سب سے رہائی دلا سکتی ہیں۔

بارالٰہا! اس گفتگو کے اختتام پر اس دعا کے ذریعے اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتے ہیں:

اللهم لا تكلني الى نفسي طرفة عين ابدا

''پروردگار! مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔''